AUGUST
2024

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

14 اگست پاکستان
INDEPENDENCE DAY

جناب نثار ترابی، جناب آفتاب خان، جناب باقی احمد پوری

جناب نثار ترابی ایک مسالمہ کی میزبانی کرتے ہوئے

جناب راشد حمید، جناب مقصود جعفری، جناب نثار ترابی

بانی مدیر خالد احمد

بکھراوا

ایک پل کی بھول تھی اور فرش پر گلدان تھا
پیکرِ گل یک بہ یک سینہ کشا کیسے ہوا

کرچیوں کے رنگ میں بکھرا ہوا انسان تھا
ایک پل کی بھول تھی اور فرش پر گلدان تھا
دل کا ہر ٹکڑا ، مثالِ آئینہ حیران تھا
ریزہ ، ریزہ ، اک مکمل آئینہ کیسے ہوا

ایک پل کی بھول تھی اور فرش پر گلدان تھا
پیکرِ گل یک بہ یک سینہ کشا کیسے ہوا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

- **Karachi:** (021) 34541301-7 - **Lahore:** (042) 36363300-7
- **Sialkot:** (052) 3554301-6 - **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
- **Faisalabad:** (041) 8542924 - **Peshawar:** (091) 5606565 - **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - اگست 2024 - شمارہ نمبر: 8

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب نثار ترابی

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

A/c Title Monthly BAYYAZ

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلو میٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلو میٹر زرعی فارم سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	جلیل عالی، خاور اعجاز	7 تا 8
2	نعت	جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی، محمد یٰسین قمر، اکرم ناصر، افتخار شاہد، رضا اللہ حیدر، صغیر احمد صغیر، حسنین مظہری، جنید آذر	9 تا 18
3	قصیدہ نعت	خالد علیم	19 تا 21
4	سلام	نسیم سحر، احمد جلیل، شاہین عباس، فیض رسول فیضان، قمر نیاز، نبیل احمد نبیل، اعجاز رضوی	22 تا 28
5	عقیدت	زکی طارق، اعجاز دانش، طاہر ناصر علی، عرفان جمیل، مرزا آصف رسول	29 تا 34
6	رباعیات	زبیر بازغ	35
7	وطن کے گیت	خاور اعجاز، شوکت محمود شوکت	36 تا 37
8	گوشہ نثار ترابی	تعارف: نعمان منظور	38
		مضامین: سید ضمیر جعفری، فتح محمد ملک، شبیر احمد قادری، نذر عابد، سید معراج جامی، علی بن عزیز	39 تا 54
		شاعری: نثار ترابی	55 تا 62
		نثار ترابی پر اہلِ قلم کے تاثرات: توصیف تبسم، انور مسعود، محسن بھوپالی، محسن احسان، ریاض مجید، امجد اسلام امجد، رشید امجد، صابر ظفر، سید اختر امام رضوی، نسیم سحر، نجیب جمال، محسن نثار، رفیع الدین راز، محمد احمد عابد، انتصار اللہ اظہار، تسنیم کوثر، محمد یوسف، ساجد علی، آفتاب خان، فرزند علی ہاشمی، سعید سراج، حماد ریاض، نعمان منظور	63 تا 72

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	مضامین	محمد ارشاد، ابدال بیلا، یونس خیال، نذر عابد ظفر معین بلے جعفری، کرامت علی بھٹی، محمد کامران محمد نوید ازہر، کومل شہزادی، انصر منیر، نوید عائل	73 تا 117
10	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	118 تا 125
11	غزلیں	خالد احمد، محمد ارشاد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی خاور اعجاز، گلزار بخاری، قیوم طاہر، اقبال سروبہ، مسعود احمد حامد یزدانی، افتخار شاہد، اکرم ناصر، طالب انصاری، اسلام عظمی اکرم سحر فارانی، محمد سلیم ساگر، افروز رضوی، ذکی طارق محمد نوید مرزا، رومانہ رومی، طاہر ناصر علی، ثمینہ سیّد، سبطین رضا خالدہ انور، ریاض ندیم نیازی، آفتاب خان، اعجاز روشن افتخار شوکت، اعجاز دانش، رخشندہ نوید، طلعت شبیر شوکت محمود شوکت، نائلہ راٹھور، ہمایوں پرویز شاہد اجمل اعجاز، دانش عزیز، اصغر علی بلوچ، محمد اشرف کمال راجہ عبدالقیوم، ظہور چوہان، صغیر احمد صغیر، فیض رسول فیضان شبہ طراز، سرور فرحان، اکرم جاذب، بشیر احمد حبیب عزیز عادل، عاصم اعجاز ، عابد معروف مغل، میتھیو محسن محمد شفیق انصاری، قمر نیاز، نعیم رضا بھٹی، وحید ناز، مظہر امام زبیر خیالی، نبیل احمد نبیل، اورنگزیب حسام حر، محمد اشفاق بیگ نعمان محمود، افضل ہزاروی، محمد کاشف حنیف، امجد مرید حیدری محمد علی ایاز، رخسانہ سحر، عبدالرؤف زین، کوکی گل، حنا بابر چودھری	126 تا 193
12	طنز و مزاح / خاکے	فہد حمید	194 تا 210
13	افسانے	محمد طارق علی، کلیم خارجی، آسناتھ کنول [صادق ہدایت / مترجم: حمزہ حسن شیخ]، محمد شفیق، محمد علی نجیب	202 تا 230
14	نظمیں	سید افسر ساجد، جلیل عالی، تابش کمال، محمد انیس انصاری، نائلہ راٹھور امجد بابر، عاصم بخاری، محمد کلیم، فصیحہ آصف خان، غلام مرتضی، اعجاز رضوی	231 تا 241

حمدیہ

وہ کہ جو عجز کو اعجاز بنا دیتا ہے
ہو جو ناراض تو لَو دل کی بجھا دیتا ہے

اپنی مرضی سے کسی راہ بھی جائیں، لیکن
خوب و ناخوب تو سب کو وہ سُجھا دیتا ہے

ہم بھٹکتے ہیں جو سوچوں کے گھنے جنگل میں
کون الجھے ہوئے دھاگے کا سِرا دیتا ہے

مطمئن کر نہیں پاتے ہمیں خود اپنے جواب
کوئی اندر سے سوال ایسا اٹھا دیتا ہے

وہی کرتا ہے عنایت کبھی ایسا موسم
چند لمحوں جو ہمیں ہم سے ملا دیتا ہے

ہنرِ شعر کو اُس نے یہ کرشمہ بخشا
دل دھڑکنے کا زمانے کو پتا دیتا ہے

پہلے بھرتا ہے وہ قطروں سے سمندر عالی
پھر سمندر کو ہواؤں میں اڑا دیتا ہے

جلیل عالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

حمد

ہماری کشتِ ویراں اس طرح شاداب رکھتا ہے
پرانے خواب کے اوپر نیا اِک خواب رکھتا ہے

کبھی تارے سجاتا ہے ہمارے دھیان کی خاطر
کبھی بامِ افق پر یاد کا مہتاب رکھتا ہے

کبھی پانی پہ لکھ دیتا ہے وہ تہذیب مٹی کی
کبھی صحراؤں کی تقدیر زیرِ آب رکھتا ہے

گزرگاہیں بنا دیتا ہے جو منہ زور پانی میں
وہی بے آب صحرا میں سبیلِ آب رکھتا ہے

بریدہ شاخ میں کرتا ہے وہ ذوقِ نمو پیدا
پھر اس کے پھولنے پھلنے کے بھی اسباب رکھتا ہے

لگا دیتا ہے ساحل سے سفینہ اور بعد اُس کے
کسی طوفاں کے آنے تک ہمیں غرقاب رکھتا ہے

خاور اعجاز

نعتؐ

کلک جب بھی اٹھائیں اُسؐ کے لیے
خود مضامین آئیں اُسؐ کے لیے

بحر، بادل، ہوائیں اُس کے لیے
مہر و مہ، کہکشائیں اُسؐ کے لیے

اُسؐ کی خاطر یہ صبح و شام تمام
سب جہاں، کُل دِشائیں اُسؐ کے لیے

کون ہے کائنات میں اُسؐ سا
اپنی ساری وفائیں اُسؐ کے لیے

سوچ کے سارے زاویوں میں وہی
دل کی ساری سرائیں اُسؐ کے لیے

اشکِ ممنونیت کے موتیوں سے
اپنی پلکیں سجائیں اُسؐ کے لیے

کربلا ہو، غزہ ہو یا کشمیر
جاں بکف یار جائیں اُسؐ کے لیے

اُسؐ سے منسوب ہے یہ ارضِ وطن
اِس کو شایاں بنائیں اُسؐ کے لیے

اپنی اپنی اناؤں سے عالی
قدم آگے بڑھائیں اُسؐ کے لیے

جلیل عالی

نعتؐ

ہوا ہوں عشقِ محمد میں مبتلا جب سے
دکھائی دینے لگا ہے مجھے خدا جب سے

تمام رات درِ خواب کھول رکھتا ہوں
نگاہِ شوق میں روشن ہوا دیا جب سے

عطاء ہوا انہیں جب سے حضور نعت کا شعر
رکی ہوئی ہے لبوں پر مرے دعا جب سے

رخِ حیات مدینے کی سمت موڑ دیا
دکھائی دینے لگا ہے ہرا، ہرا جب سے

مرے حواس نے جب سے مدینہ دیکھ لیا
ہوائے زرد بھی ہونے لگی صبا جب سے

حضور آپ کی گلیوں نے کی مسیحائی
میں چوم چوم کے آیا ہوں خاکِ پا جب سے

مری نظر میں زمانے کی عمر اتنی ہے
ہوئی ہے ذکرِ محمد کی ابتدا جب سے

مجھے تو ایسے زمانے میں نعت کہنا تھی
مزاجِ شوق ہوا حرف آشنا جب سے

بھلا ہوا کہ جہاں بھر سے پھیر لیں آنکھیں
بنی ہوئی ہے کنور نعت کی فضاء جب سے

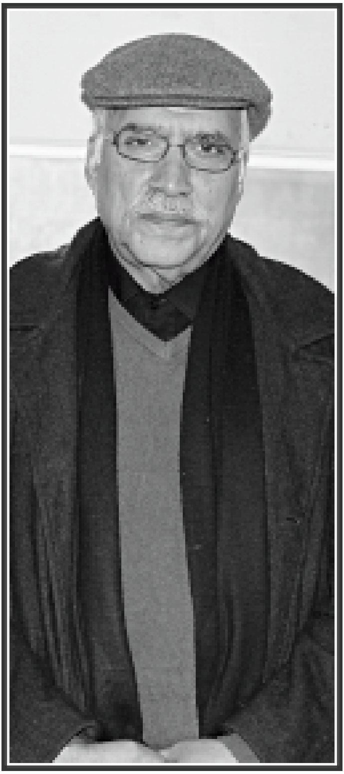

اعجاز کنور راجہ

نعتؐ

محمد مصطفیٰؐ خیر البشر ہیں
نشانِ امن ہیں ، وہؐ ردِ شر ہیں

نفوسِ ناقصاں کے ہیں وہ مولاؐ
جو بے پر ہیں، وہ اُن کے بال و پر ہیں

جو پرکھیں آپؐ کو تخمین و ظن سے
وہ نادانی سے اپنی بے خبر ہیں

ہدایت اُن کی ہے اکسیر اعلیٰ
وہ ہر اک مضمحل کے چارہ گر ہیں

وہ اسرار الٰہی سے ہیں واقف
وہ رازِ کن فکاں سے بہرہ ور ہیں

وہ اقلیم خدائی کے ہیں وارث
سبھی اُن کا ، وہ شاہ بحروبر ہیں

ریاضِ نعت میری لاج رکھ لے
یہ نعتیں آپؐ کے پیشِ نظر ہیں

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

اللہ کے محبوبؐ کے محبوب حرم میں
صد شکر کہ ہوں آپؐ کے دامانِ کرم میں

یادِ شہِؐ طیبہ نے مرے بخت سنوارے
اب زیست بسر ہوتی ہے بارانِ نعم میں

خیرات ہے یہ مدحِ شہِؐ کون و مکاں کی
افکار کی ناؤ ہے جو انوار کے یم میں

ہر لفظ میں پھر کیوں نہ ہو اک نورِ لطافت
خاکِ درِ انور ہو جو رشحاتِ قلم میں

رہبر ہے جہاں بھر کے لیے آپؐ کا اُسوہ
پاکیزگیٔ فکر میں اور علم و حِلم میں

وابستہ ہو سرکارؐ کے دامانِ شفا سے
جو دل ہو سدا درد میں اور رنج و الم میں

ہر آن قمرؔ دل کی فضا طیّب و طاہر
روضے کا جو منظر ہے مرے دیدۂ نم میں

محمد یٰسین قمرؔ

نعتؐ

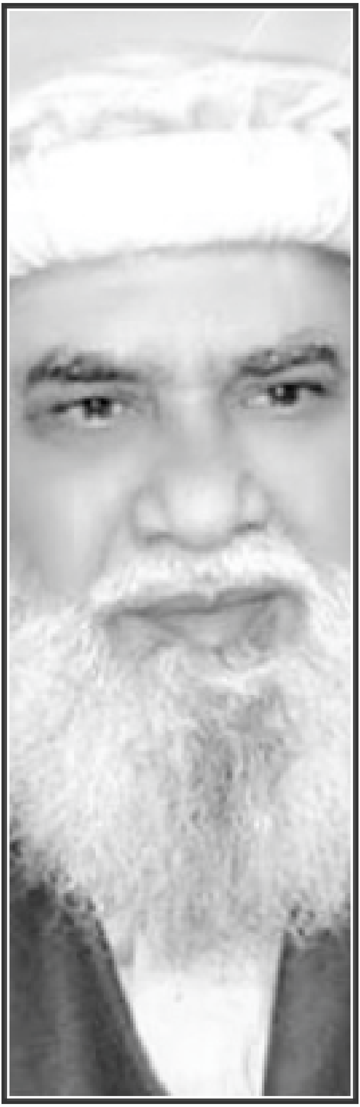

دعاؤں میں مری تم دیکھنا، جب بھی اثر آیا
مدینہ پاک میں، عین اس گھڑی میں چشم تر آیا

وہ جس چوکھٹ پہ مکہ میں کئے تھے آپ نے سجدے
خدا کا شکر ہے میرا بھی اس چوکھٹ پہ سر آیا

وہ خوش قسمت کہیں خود کو، جو دنیا گھومنے نکلے
میں خوش قسمت کہ قسمت میں مدینہ کا سفر آیا

مرے ہمراہ اک لشکر ہے خوشبوؤں کا یادوں کا
اکیلا لوٹ کر کب ہوں مدینہ سے میں گھر آیا

یقیں مانو مری آنکھیں جھپکنا بھول بیٹھی تھیں
جو پہلی بار مجھ کو گنبدِ خضری نظر آیا

وہ ہم جیسا، مگر ہم میں سے کوئی بھی نہ اس جیسا
وہ یکتا، منفرد، بے مثل، جو نوری بشر آیا

بتاؤں کیا تمہیں اکرمؔ، فدایانِ محمد کا
لٹا دی جان، جب بھی معرکۂ خیر و شر آیا

اکرم ناصر

نعتؐ

جن ہواؤں کا مدینے سے گزر ہو جائے
اُن کا تو سارا سفر کارِ ہنر ہو جائے

میں نے جتنی بھی گزاری ہے بھلی تھی لیکن
اب جو باقی ہے مدینے میں بسر ہو جائے

ایک ہی رات میں یوں باغ کی قسمت بدلے
ایک ہی رات میں پھلدار شجر ہو جائے

آپ کے حسنِ سماعت کی کوئی حد ہی نہیں
میں پکاروں تو مدینے میں خبر ہو جائے

نام لیتے ہوئے ٹل جائے مصیبت کی گھڑی
اسم پڑھتے ہوئے دیوار میں در ہو جائے

یہ مرا کارِ سخن کارِ مشقت ہے مگر
آپ چاہیں تو یہی کارِ ہنر ہو جائے

اپنے آنگن میں جلاتا ہوں درودوں کے دیے
عین ممکن ہے کہ گھر رشکِ قمر ہو جائے

پھر تو شاہوں سے بھی اونچا ہو نصیبا میرا
آپ کی ایک نظر آقا اگر ہو جائے

آپ کی ذات مری سوچ کا محور ٹھہرے
آپ کی یاد مرا زادِ سفر ہو جائے

میں نے اک بار تو روضے کی زیارت کی ہے
یہ کرم مجھ پہ اگر بارِ دگر ہو جائے

ڈھلنے والا ہے مری عمر کا سورج شاہد
رات سے پہلے مجھے اذنِ سفر ہو جائے

افتخار شاہد

نعتؐ

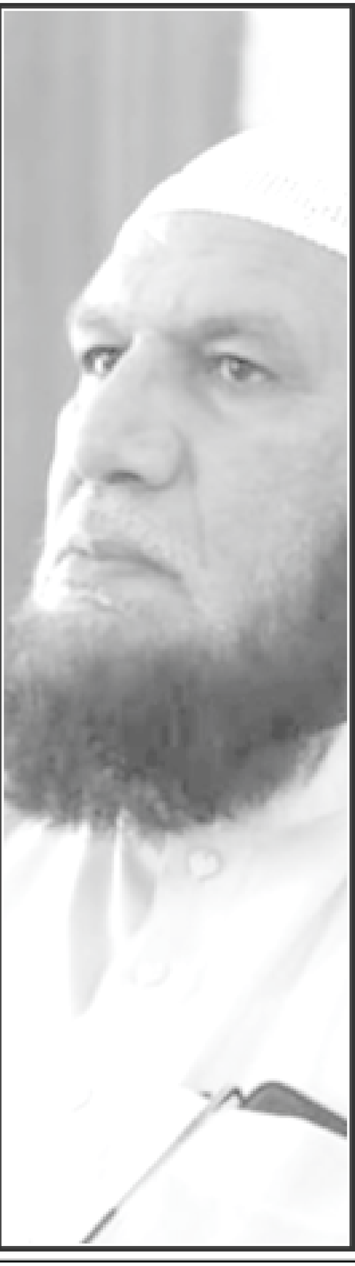

دل کھینچتی ہے خوبیٔ قسمت گلاب کی
دیکھی ہے خارِ طیبہ میں رنگت گلاب کی

سرشار ہے جو حبِ نبی کی مٹھاس میں
لاریب وہ تو پائے گا جنت گلاب کی

سب انبیاء میں سید و سرورِ عظیم ہیں
پھولوں میں جیسے ہوتی ہے عظمت گلاب کی

جس کو عطا ہوا ہے پسینہ حضور کا
کب ڈھونڈتا ہے نزہت و نکہت گلاب کی

اب معصیت کے خار کھٹکتے ہیں سوچ میں
آنکھوں میں بس گئی ہے جو صورت گلاب کی

مکہ میں جن کے رستے تھے خار آشنا رضاؔ
کُنجِ لحد میں پاتے ہیں راحت گلاب کی

رضا اللہ حیدر

نعتؐ

صغیر احمد صغیر

جو سب سے اُونچی ذات میاں
قرآن ہے اُس کی نعت میاں

جو آقا کی عادات میاں
ہیں سب کی سب آیات میاں

ہیں مدح سرا گلشن گلشن
کیا پھول ہوئے کیا پات میاں

جب عرش پہ راز نیاز ہوئے
تھی دن سے روشن رات میاں

سب مل کر پڑھیے صل اللہ
ہو رحمت کی برسات میاں

اِک میم کا پردہ لازم تھا
ہے بات کے اندر بات میاں

ہم نعت کہیں رومی جیسی
پر اپنی کیا اوقات میاں

ہو اُن کے غلاموں میں شامل
پھر دیکھ اپنے درجات میاں

نعتؐ

سن کر نویدِ آمدِ سرکار ، زندگی
خوابِ گراں سے ہوگئی بیدار زندگی

نخلِ رسومِ کفر کو جڑ سے اُکھاڑ کر
آساں بنا دی آپ نے ، دشوار زندگی

باقی رہے گا حشر تلک موت کا سرور
گر ہو فدائے احمدِ مختار ، زندگی

آنے سے آپ کے ہوئی پھر منفعت رساں
ورنہ تھی اس سے پیشتر بیکار زندگی

عشقِ نبی کی چادرِ پُرکیف اوڑھ کر
کس درجہ لگ رہی ہے سکوں بار زندگی

آزاد سانس لینے لگی آپ کے سبب
ایذا نصیبیوں میں گرفتار زندگی

گرتے ہی ختم ہوگا شبِ ہجر کا ملال
یعنی کہ درمیاں میں ہے دیوار "زندگی"

آجائیں مظہری دمِ آخر اگر حضور
آغوشِ مرگ سے ہو نمودار زندگی

حسنین مظہری

نعتؐ

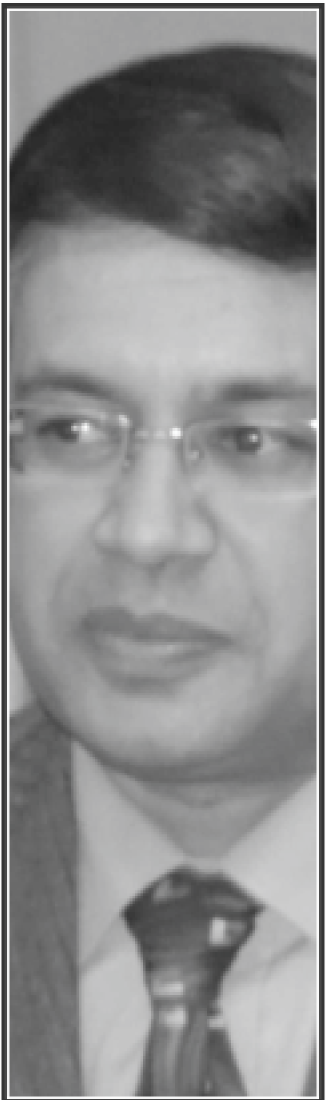

طے کہاں یہ مرحلہ عزمِ دوامی سے ہوا
سرخرو میں دہر میں تیری غلامی سے ہوا

تیری آمد پر زمین و آسماں ہیں سجدہ ریز
جشنِ استقبال تو حق کی سلامی سے ہوا

مرحبا! اے صحنِ ہستی کی تروتازہ بہار
یہ جہاں سرسبز تیری خوش خرامی سے ہوا

باغِ ہستی مشکبو ٹھہرا ترے اخلاق سے
خوش تکلم نطق تیری خوش کلامی سے ہوا

کی عطا سرکار نے مجھ کو حدیثِ دلبری
اُن کے لطفِ خاص سے میں خاص، عامی سے ہوا

بس گئی ہے روزِ اوّل سے سماعت میں مٹھاس
آشنا ایسا ترے اسمِ گرامی سے ہوا

تھی دمِ آخر لبوں پر آیتِ صَلُّوا عَلَیہ
میں تمام ایسا ادائے ناتمامی سے ہوا

جنید آذر

قصیدۂ نعت (اوزانِ رباعی میں)

مہتاب رقم ہے کس کی لوحِ مقسوم؟
شرمندۂ معنی ہیں سرکردہ علوم
کیا دانشِ عصرِ نو، تو کیا علمِ قدیم
فہمِ بشریت اُس کے آگے معدوم

کیا فلسفہ، کیا یقینیتِ منطقیاں
دل کے لیے موت ہے تمام اِن کا لزوم
دانائیاں اُس کی ہیں، وہی دانا ہے
کیا خاکی و نوری کا جہانِ معلوم

کس کی ہے کائنات، کس کی ہیں جہات
کس نے دُرِ طارم سے نکالے ہیں نجوم
اُس کی ہستی سے نبضِ عالم ہے رواں
ہر لمحے کا مدّ و جزر اُس کا محکوم

وہ ربِّ کریم، وہ ازل کی تقدیم
حادث بھی وہی، وہی دوامِ مقدوم
تورات و زبور ہوں کہ انجیل، تمام
ہے اِن کا ہبوط، قاطعِ جہل و ظلوم

خالق وہ زمانوں کا، زمانے اُس کے
یکتائے ازل، وہی ابد کا مفہوم
انساں کے لیے، خیر و ہُدیٰ کی لڑیاں
قرآن کے سارے کلماتِ مرقوم

ہر رنگ میں بے نیاز، ہر طور میں راز
کیا کیف و کم و نشاط، کیا ضرب سموم
صد گوہرِ تاب دار ہر لفظ اُس کا
معنی ہیں تمام اِس کے صد رشکِ نجوم

ہو اُس کا عذاب تو مٹیں ہستی سے
کیا بحرِ عمورہ[1] اور کیا شہرِ سدُوم[2]
قرآں سے کھلا نوعِ انسانی پہ
خَلَقَ[4] الاِنْسَانَ مِنْ عَلَقْ کا مفہوم

صحرا سے سحاب اُٹھیں، جو ہو اُس کا کرم
رحمت سے فلاح پائے نسلِ مَکظُوم[3]
حکم آیا فلک سے کہ سوائے ''اَسود''
مت سر کو رگڑ، کسی بھی پتھر کو نہ چُوم

کون اُس کے سوا ہے دوسرا کوئی بھی
نزدِ رگِ جان و دل، قریبِ حلقوم
بس ایک خدا کو مان، اُس کو پہچان
سب کچھ فانی، وہی ہے حَیِّ القَیّومْ

۱،۲۔ عمورہ، سدوم: قومِ لوط (علیہ السلام) کے وہ مقامات جہاں عذاب نازل ہوا۔

۳۔ مکظوم: غصے سے مٹھیاں بھینچنے والا۔ پریشان حال، غم زدہ۔

۴۔ ''خلق الانسان ---- ارکانِ مصرع ہیں: مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع، جب کہ قرآنی آیت میں تصرف کے التباس سے بچنے کے لیے آغازِ مصرعہ میں خَلَق کے لام بالکسر کے باعث ''مفعلن'' کو بجائے ''مفعُو'' اجتہادِ عَروض تصور کیا جاسکتا ہے۔

وہ وَحدَہٗ لاشریک، ربِّ واحد
مُشرک ہے اُس کی بخششوں سے محروم
بس نعت ہے شاعری کا سرمایۂ اصل
باقی موجود رہ کے بھی ہے معدوم

ہے خُلدِ نعیم اُس کی، مومن کے لیے
شرحِ یُسقَونَ مِن رَّحِیقٍ مَّختُوم[5]
دنیا کے لیے پیامِ منشور اُس کا
صد قلزمِ بے کِنار، صد بحرِ علوم

یہ اُس کا کرم ہے کہ ہوا دنیا میں
مبعوث، پیمبرِ کِتٰبٌ مَّرقُومٌ[6]
دیتا ہے فتح کی بشاراتِ جمیل
وہ مہبطِ وَحی و مُلہمِ سورۂ رُوم

سِجِّیْنٌ و عِلِّیِّیْنٌ کی تخصیص کرے
اَخیار قدم کہاں، کہاں طالعِ شُوم
اُمت کو سنا کے مژدۂ غلبۂ حق
دے فتحِ قریب کو مقامِ مضموم[7]

توحید کا درس جس نے انساں کو دیا
جس نے لِلٰہیت کا بخشا مفہوم
اُمت کے لیے خیرِ اُمم کا رتبہ
خود خیرِ بشرؐ، نوعِ بشر کا مخدوم

اک مطلعِ عجز ہو بنامِ مدحت
ہیں مدح سرا جس کے مہتاب و نجوم
سمجھا کے اُسی نے پیچ و خم دنیا کے
جتلا دیا خیر و شر کا سارا مفہوم

کیا کام کرے گی وہاں فکرِ موہوم
عاجز ہے جہاں میری سعیِ منظوم
خاسر ہیں مال و زر پہ مرنے والے
فائق ہیں بلالؓ و ابنِؓ اُمِّ مکتوم

اک لفظ بھی شایانِ پیمبرؐ ہے کہاں
ہر چند دماغ میں ہے لفظوں کا ہجوم
کیا چیز ہے زینتِ حَیٰوۃُ الدُّنیا
جس طرح کسی ہُما پہ ہو سایۂ بوم[8]

اک مصرعہ تر بھی جو مجھے ہو انعام
مِٹ جائیں مرے تمام آلام و غموم
ہے مُونجھ کی رسّی کی اسیر اُمِّ جمیل
ناکام ہے بولہب کی سعیِ مذموم

تاہم کوشش ہے از رہِ حکمِ وُرُود
یہ میرا کلام، نعت سے ہو موسوم
مومن کو مِل گیا زُلالِ کوثر
بُوجہل کی قسمت میں شاخِ زَقُّوم[9]

۵۔ یُسقَونَ مِن رَّحِیقٍ مَّختُوم ----- انھیں (جنتیوں) کو سربمُہر شراب پلائی جائے گی) سورۃ المطففین: ۲۵۔ "رحیق" خالص اور مصفّٰی شراب کو کہتے ہیں جس میں نہ کوئی ملاوٹ ہو، نہ گدلاپن۔ (فی ظلال القرآن، تیسواں پارہ)

۶۔ کِتٰبٌ مَّرقُومٌ: سورۃ المطففین ۹، ۲۰ ----- لکھی ہوا نوشتہ۔

۷۔ مضموم: بلند، ارتفاع پذیر۔

۸۔ بُوم: منحوس، ویرانہ پسند، اُلّو۔ (لغت میں بوم کے معنی جگہ اور مقام کے بھی ہیں)

۹۔ زقوم: اَذٰلِکَ خَیرٌ نُّزُلًا اَم شَجَرَۃُ الزَّقُّومِ۔ (سورۃ الصّٰفّٰت: ۶۲) تو کیا یہ بہت اچھی مہمانی ہے یا تھوہر کا درخت۔

"اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَر" سُن کر
اصحابِ نبیؐ ہو گئے فرخندہ قدوم

بھرتا ہے عطاؤں سے دامن سب کا
سنتا ہے محبت سے فغانِ مظلوم

گم گشتۂ لہو و لعب سے نکلے
طغیان و جہول کے گرفتارِ رسوم

"اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی" کہہ کر
رخصت ہوا وہ جانبِ حَیِّ الْقَیُّوْمُ

رتبہ جو رفعنا لک ذکرک سے ملا
کب اور کسی رسولؑ کا ہے مقسوم

وہ شان ملی کہاں کسی کو، جیسی
اُس شانِ بلند کی دوعالم میں ہے دُھوم

صدیقؓ کا ہے مقامِ صادق ایسا
اَسفل ہے تمام گرو بادِ مسموم

صدیقہؓ عرش و فرش بنتِ صدیق
قرآن میں ہے جس کی برأت مرقوم

موجود مدام ہے مقامِ فاروقؓ
موجود کو کون کر سکا ہے معدوم

مسعود مقام ہے وہ عثمانِ غنیؓ
وہ ذوالنورین، وہ شہیدِ مظلوم

سلطانِؐ دو عالم کی عصمت کے طفیل
لاریب کہ ہے آلِ مطہر معصوم

وہ سیّدۂ نسائے عالم، زہرہؓ
آلِ اطہار کی مطاع و مخدوم

ہم مرتبہ ہیں بناتِ پیغمبرِؐ قدس
زینبؓ ہو، رقیہؓ ہو کہ اُمِّ کلثومؓ

ہر مومن و مومنات کو اُسوۂ پاکؐ
واللہ کہ برتر ہے ز تقلیدِ عموم

تفہیم و تعلیمِ پیمبرؐ کے بغیر
معلوم بھی ہے مرے لیے نامعلوم

آخر میں دُعا ہے ربِّ کعبہ سے مری
مل جائے اُس دَر کی فضائے مشموم[10]

مقبول اگر مری دُعائیں ہو جائیں
ہو اذن، حضوری کا، ز راہِ مرسوم[11]

تُو میرا کفیل ہے، سو لازم ہو جائے
لازم میرے لیے کہ میں ہوں ملزوم

کانوں میں صدا آئے کہ ہاں بسم اللہ!
ہاں، تُو ہے ثناخوانِ سلطانِؐ علوم

خالد علیم

لَاٰکِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (سورہ الواقعہ:۵۲) تم شجرِ زقوم کی غذا کھانے والے ہو۔
اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ۔ طَعَامُ الْاَثِیْمِ۔ کَالْمُھْلِ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ۔ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ (سورۃ الدخان:۴۳۔۴۶)
بےشک زقوم کا درخت گناہ گاروں کی خوراک ہے جس کے اُبلتے ہوئے قطرے ایسے ہیں جیسے پگھلا ہوا تانبا۔ وہ (ان کے) پیٹ میں اُبل اُبل کر جوش مارے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش مارتا ہے۔ اس درخت کی اصل جڑ جہنم میں ہے۔ اس کے خوشے اور شاخیں بھیانک ڈراونی لمبی چوڑی اور دور دور شیطانوں کے سروں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ (ظلال القرآن، سورہ الصّفٰت ـــ تفسیر: سیّد قطب شہید)
۱۰۔ مشموم: سونگھا گیا۔
۱۱۔ مرسوم: ارمغان، تحفہ، جاری کیا گیا، رسم ڈالی گئی۔

سلام

جان سکتا ہے کہاں کوئی مقامِ تشنگی!
اِس سے تجھے آگاہ تو تجھے بس امامِ تشنگی

نسبتِ ابنِ علیؑ سے ہی مری پہچان ہو
اے خدا، مجھ کو عطا کر دے دوامِ تشنگی

اِس میں پنہاں ہے جو سیرابی، اگر وہ جان لے
کرنے لگ جائے زمانہ اہتمامِ تشنگی

دسترس میں رکھ کے دریائے فرات اپنی، حسینؑ
زندگی کرنا سکھاتے ہیں بنامِ تشنگی

آبِ شیریں کا پیالہ سامنے ہے، اور ہم
احتراماً کر رہے ہیں التزامِ تشنگی

سامنے دریا بھی ہو تو پیاس کو رکھنا ہے یاد
ہم کو کرنا ہے ہمیشہ احترامِ تشنگی

جسم میں ان کے نہ جب باقی تھا اِک قطرہ لہو
بھول جائیں ہم بھلا کیسے وہ شامِ تشنگی؟

یاد کرتے جاؤ اُن کی پیاس، اے تشنہ لبو
سارے دریاؤں کو پہنچاؤ سلامِ تشنگی

ان کے غم میں چشمِ نم کے ساتھ مَیں کرتا ہوں پیش
نذرِ حوضِ آبِ کوثر یہ کلامِ تشنگی

پیکرِ صبر و رضا کے ہم مقلد ہیں، تو پھر
کیوں نہ اب رائج کیا جائے نظامِ تشنگی؟

جب حسین ابنِ علیؑ کی یاد آتی ہے نسیم
نوش کر لیتا ہوں مَیں اِک اور جامِ تشنگی

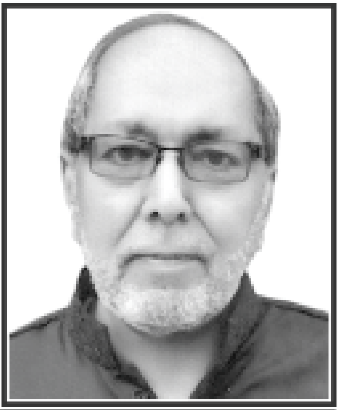

نسیمِ سحر

سلام

کربلا زخم جو دیکھے ہیں تیرے کاری سے
ٹوٹتا ہی نہیں اب رشتہ عزداری سے

دردِ شبیر وہ محسوس نہیں کر سکتے
جو یہاں دولتِ احساس سے ہیں عاری سے

اُن کو انصارِ مدینہ کا چلن آ نہ سکا
اہلِ کوفہ کا تعلق رہا عیاری سے

تھا عجب ذوقِ شہادت کا نشہ کربل میں
ہر کوئی جھوم رہا تھا اسی سرشاری سے

دیں بچانے کا عجب مرحلہ آ پہنچا تھا
بوجھ سب اس نے اٹھائے ہیں وہاں بھاری سے

کون نیزے پہ سنائے گا یوں قرآن جلیل
کون بڑھ سکتا ہے آگے بھلا اس قاری سے

احمد جلیل

----------- انتخاب -----------

– خالد احمد –

-------- نعمان منظور --------

منزلِ عشق ہو گئی ، شام دمشق ہو گئی
صبح سے آفتاب تھا ، گرمِ سفر برہنہ پا

سلام

اُڑتے پھرتے ہوئے کچھ تیر و کماں دیکھتا ہوں
کربلا میں کھڑا میں کون و مکاں دیکھتا ہوں

خیمۂ خاک جلا، خیمۂ افلاک جلا
میں جہاں دیکھ نہیں سکتا، وہاں دیکھتا ہوں

اک سناں دیکھتا ہوں ایسی گلوگیر کہ بس
ہاں مگر بول نہیں سکتا، کہاں دیکھتا ہوں

فرق حالوں کا بھی ہے، فرق حوالوں کا بھی ہے
لوگ سنتے ہیں اذاں اور میں اذاں دیکھتا ہوں

دیکھنا بنتا ہے یوں ہی مرا اس عالم میں
آگ ہوتی ہے یہاں اور میں وہاں دیکھتا ہوں

عصر کا وقت کبھی تم پہ بھی آئے تو بتاؤں
میں یہ کیا دیکھتا ہوں اور کہاں دیکھتا ہوں

شاہین عباس

تین دن کی پیاس جانے ختم پر کب آئے گی؟
جانے کب ہوگی زمیں پر انتہائے کربلا؟

زندگی کیا ہے، کسی سے جا کے پھر پوچھا نہیں
زندگی پردے چکی جب اپنی رائے کربلا

وہ ہی سمجھے گا قیامِ آخریں انسان کا
جو مدینے آتا جاتا ہو، وہ جائے کربلا

لوگ کیسے لوگ ہوں گے، کیسے کرتے ہوں گے سوگ؟
جب تلک رکھی نہیں ہوگی بنائے کربلا

باپ نصرت ایک تھا اور ایک کے حصے کا تھا
اب مدینے سے کوئی آئے نہ آئے کربلا

باندھنے والے نے کس زنجیر سے باندھا مجھے
میں چلوں تو ساتھ چلتی ہے سرائے کربلا

کب سے اصغر پوچھتے ہیں اور جواب آتا نہیں
کربلا میں کیا ہوا تھا اے خدائے کربلا؟

کہنے سننے کو یہ دو مضموں ہی باقی رہ گئے
اک سکوتِ کربلا ہے، اک صدائے کربلا

سلام

کیا جلوہ کربلا میں دِکھایا حسین نے
سجدے میں جا کے سر کو کٹایا حسین نے

راہِ خدا میں جان کی بازی لگا گئے
پیشِ یزید سر نہ جھکایا حسین نے

نانا کے پاک نام پہ ہر چیز وار دی
کچھ بھی نہ اپنے پاس بچایا حسین نے

خوش بخت تھا کہ آپ کے قدموں پہ آ گرا
سویا نصیب حُر کا جگایا حسین نے

نیزے پہ سر تھا اور زباں پر تھیں آیتیں
قرآں اِس طرح بھی سنایا حسین نے

اکبر کی خشک آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے
صغرا کا جب پیام سنایا حسین نے

صدمے سے قدسیوں کی بھی چیخیں نکل گئیں
اصغر کو جب گلے سے لگایا حسین نے

ایسا لگا کہ دیکھ کے حوریں بھی رو پڑیں
قاسم کی لاش کو جو اُٹھایا حسین نے

کیوں آپ کو نہ اپنے نواسے پہ ناز ہو
ہر قول مصطفیٰ کا نبھایا حسین نے

فیضانؔ وہ تو ساقیءِ کوثر کے لال تھے
کیسے کہوں کہ آب نہ پایا حسین نے

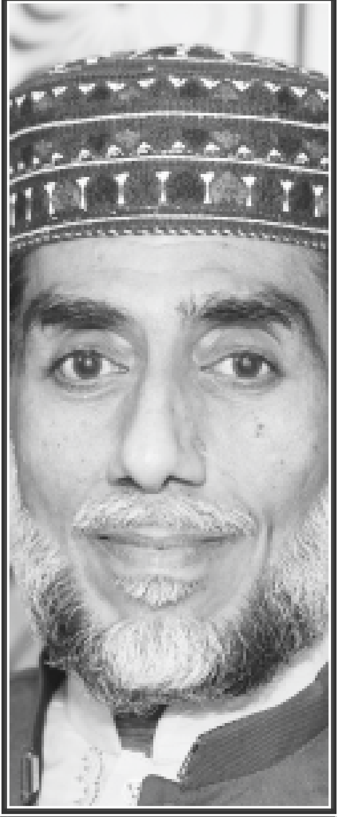

فیض رسول فیضان

سلام

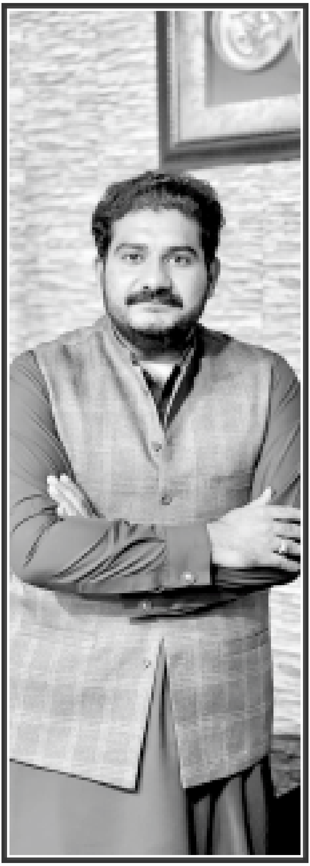

کس طرف آنکھ اٹھاؤں میں کہاں تک دیکھوں
غمِ شبیر نظر آئے جہاں تک دیکھوں

پھر مرا دین مکمل تو نہیں ہے، مولا!
میں اگر تیری محبت میں زیاں تک دیکھوں

میری آنکھیں نہ لہو روئیں تو پھر کیا روئیں
دشتِ کربل میں جو اکبر سے جواں تک دیکھوں

یوں بھی ملحد نہیں افکار مرے، پاک حسین!
کس قدر پختہ یقیں سے میں گماں تک دیکھوں

میری قسمت کہ میں ہوں شامِ غریباں کا گواہ
میری قسمت جو میں خیموں کا دھواں تک دیکھوں

میرے شاہا، مجھے اصغر سے حیا آتی ہے
باعثِ رنج ہے مجھ کو جو کماں تک دیکھوں

جاگنے پر تو قمر اپنی خبر ہوتی نہیں
اور تصور میں تو میثم کی زباں تک دیکھوں

قمر نیاز

انتخاب

- خالد احمد -

توصیف کرے اصغرؑ و اکبرؑ کی وہ کیسے؟
زینب کے لیے ایک حسینؑ ایک حسنؑ ہے

نعمان منظور

سلام

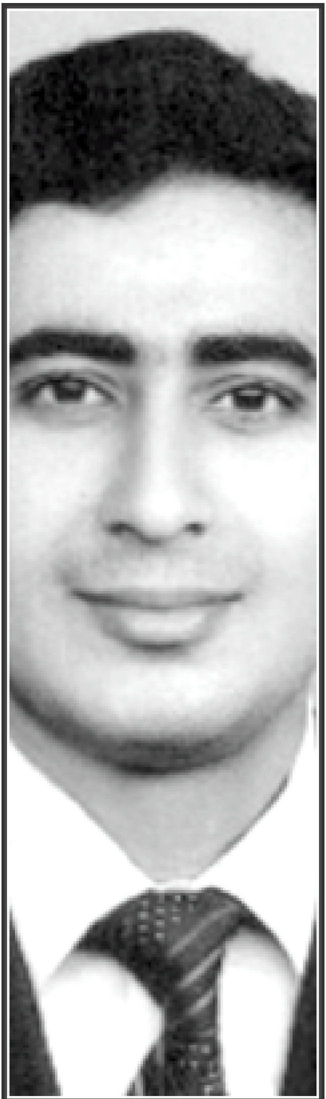

آنکھ میں کربلا اُدھر اور غمِ حسین ہے
صرف اُسی طرف نظر اور غمِ حسین ہے

اشک رواں ہیں صف بہ صف، دُور ہے منزلِ نجف
دھوپ سفر میں سر بہ سر اور غمِ حسین ہے

بھرنے لگی ہے چشمِ تر یوں بھی مری نگاہ پر
کرب و بلا کا ہے اثر اور غمِ حسین ہے

اصغرِ شیر خوار کو دیکھ کے یوں لہو میں تر
دل میں ہے درد جلوہ گر اور غمِ حسین ہے

سُوئے دمشق، راہ میں، شام کی رزم گاہ میں
خوں میں نہا گئی سحر اور غمِ حسین ہے

قافلۂ حسین میں حاصلِ درد ہے حسین
درد ہے، قصہ مختصر اور غمِ حسین ہے

میں ہوں حسین کا نبیل، اُن کا ہے غم مرا کفیل
پیشِ نظر دل و جگر اور غمِ حسین ہے

نبیل احمد نبیل

سلام

ہوا کے ہاتھ جلے خیموں کو بجھاتے ہوئے
زمیں روئی تھی یہ واقعہ سناتے ہوئے

غمِ حسینؑ نے روشن کیا ہمیں ورنہ
جہاں میں ہوتے کہیں ہم بھی ٹمٹماتے ہوئے

وہ ہاتھ کیسے کٹے ارضِ نینوا یہ بتا
بلک بلک کے میں رویا علم اُٹھاتے ہوئے

سلامی لیتے ہوئے بڑھ گئے بہشت کی سمت
نشان سینے پہ ماتم کا ہم دکھاتے ہوئے

مجھے بلایا ہے پھر سامرہ کی مٹی نے
میں کیسے جاؤں گلِ تعزیت بناتے ہوئے

علیؑ کا پوتا ہے اصغر نے یہ کیا ثابت
اجل کو تھام لیا، اس نے مسکراتے ہوئے

اعجاز رضوی

عقیدت

نبی، علی کا گھرانہ مرے حسین کا ہے
حسب نسب بڑا اعلیٰ مرے حسین کا ہے

تو قتل کرتے ہوئے شمر یہ بھی بھول گیا
نبی کا عکس، سراپا مرے حسین کا ہے

کہیں بھی نسلِ یزیدی نظر نہیں آتی
ہر ایک شہر میں کنبہ مرے حسین کا ہے

گلے میں تیر چبھا ہے مگر ہے لب پہ ہنسی
یہ روئے کیسے کہ بیٹا مرے حسین کا ہے

یزید و شمر کا لیتا نہیں ہے نام کوئی
جہاں میں آج بھی چرچا مرے حسین کا ہے

لقب ہے فاتحِ خیبر علی ہے جس کا نام
خدا کا شیر وہ بابا مرے حسین کا ہے

نبی کی پشت کے اور دوش کے سوار ہیں یہ
بڑی بلندی پہ رتبہ مرے حسین کا ہے

عبادتوں کی جو تاریخ میں مثالی بنا
قسم خدا کی وہ سجدہ مرے حسین کا ہے

"ذکی" نبی کا یہ فرمان بھولنا نہ کبھی
وہی ہے میرا جو شیدا مرے حسین کا ہے

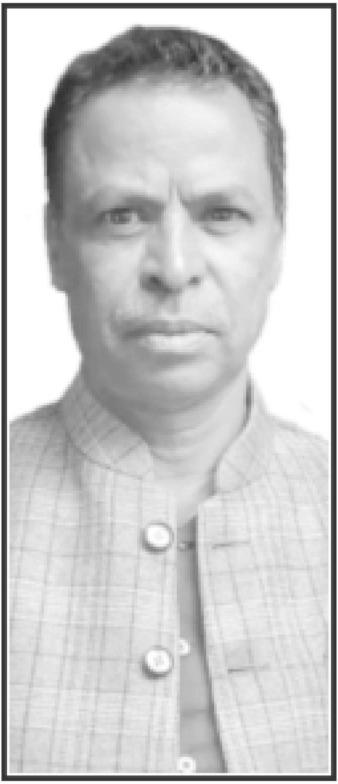

ذکی طارق

عقیدت

مردہ دلوں کو پھر سے نئی زندگی ملی
"آپؐ آئے کائنات کو تابندگی ملی"

ویرانیاں تھیں آپؐ کی آمد سے پیشتر
پژمردگی کو ایک نئی سرخوشی ملی

میرے لبوں پہ نام جو آیا حضورؐ کا
میرے سخن کو ایک نئی روشنی ملی

یہ بھی رسولِ پاکؐ کی نسبت کا فیض ہے
مجھ کو متاعِ عشق ملی ، آگہی ملی

کرتے رہے جو آپؐ کی تعلیم سے گریز
ان کو سدا جہان میں شرمندگی ملی

ہر آنکھ انؐ کے نور سے پر نور ہوگئی
ہر قلبِ مضطرب کو تروتازگی ملی

مجھ کو حضور آپؐ کے فیضان کے طفیل
عزت ملی ، وقار ملا ، آگہی ملی

دونوں جہاں میں صرف وہی کامراں ہوئے
میرے حضورؐ سے جنہیں وابستگی ملی

جب سے میں انؐ کی شان میں مدحت سرا ہوا
دانش مرے خیال کو پائندگی ملی

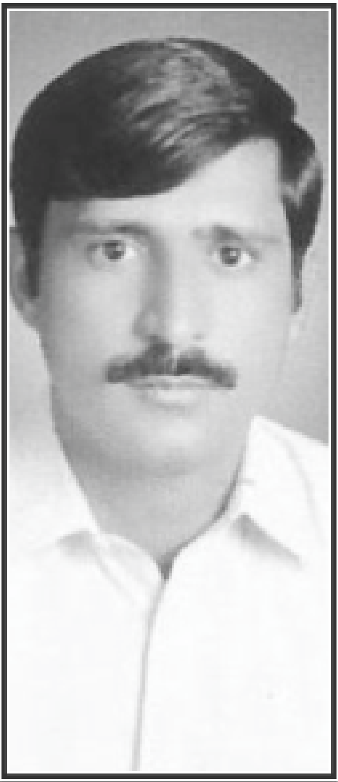

اعجاز دانش

عقیدت

دل پہ شاہِ ھل اتیٰ کے دستخط موجود ہیں
ایک فانی پر بقا کے دستخط موجود ہیں

بجھ نہیں سکتے کہ جن پر لکھا ہے نام حسینؑ
اُن چراغوں پر ہوا کے دستخط موجود ہیں

کر رہا ہے کربلا میں اُنکی تربت کا طواف
آب پر اک باوفا کے دستخط موجود ہیں

بیٹیو! اس سے سروں کو ڈھانپ کر رکھا کرو
اِس ردا پر فاطمہ کے دستخط موجود ہیں

خلد میں وہ شخص طاہر مسکرا کے جائے گا
جس کے پاس آلِ عبا کے دستخط موجود ہیں

طاہر ناصر علی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک تیر ہے پیوستِ گلو آج بھی خالد!
اک درد ہے سینے میں کہ اعصاب شکن ہے

عقیدت

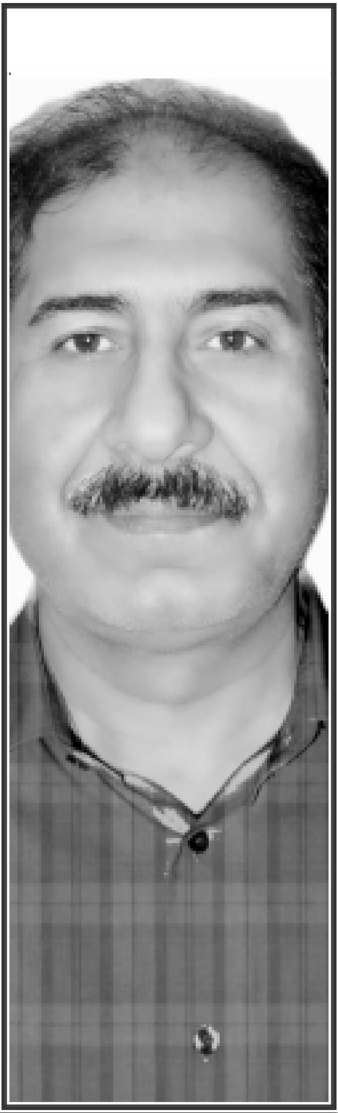

عرفان جمیل

وہ اقتصاد نہ حرفت سدھارنے آئے
رسولِ قوم کی نیت سدھارنے آئے

جو فلسفی نے گھڑا تھا جہانِ پیچیدہ!
پیمبر اس کی وہ حیرت سدھارنے آئے

وجودیت ہو وہ یا جدلیت کی تحسیں
نبی سلیقۂ جدت سدھارنے آئے

ہُوا ہو خدشہ اسی میں خرابیاں ہوں گی
سو نظمِ طاعت و بیعت سدھارنے آئے

بلند کر کے وہ ہاتھوں میں سورۂ حجرات
مبصروں کی صحافت سدھارنے آئے

غلو کذب کے زمرے میں ڈال کر ہادی
مبالغے کی عقیدت سدھارنے آئے

فصیح خود کو سمجھتے تھے، ناز کرتے تھے
وہ ان غریبوں کی لکنت سدھارنے آئے

عقیدت

ہے بے قرار دل التجائے کوئے رسولؐ
مچل رہے ہیں عجب جذبہ ہائے کوئے رسولؐ

جہاں میں وہ کہیں رہ جائے بے نوا کیونکر؟
سجی ہے جس کے لبوں پہ صدائے کوئے رسولؐ

قسم ہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
اذانِ اہلِ ولا ہے ندائے کوئے رسولؐ

شمارِ آیۂ تطہیر کون ہے؟ جیسے:
ہیں کربلا میں وہ آلِ عبائے کوئے رسولؐ

کہ اُن کی پیاس سے جاری ہے دین کا دریا
بچے شہادتِ حق چھوڑ آئے کوئے رسولؐ

ہو کوفیانہ خرد پر یہ حق عیاں کیسے؟
شہیدِ کرب و بلا ہے فدائے کوئے رسولؐ

مدینہ جانے کا ہے اصل حق تو یہ کہ کوئی
حُسینیت کی روش چل کے جائے کوئے رسولؐ

نہ پھر حجاز سے نکلا وہ قافلہ جس میں
حسینؓ سا ہو کوئی پارسائے کوئے رسولؐ

یزید اب کے ہے دجال سے بہم، اے جاں!
طلب حسینؓ سے کر پھر وفائے کوئے رسولؐ

سنے کوئی تو فلسطیں سے "شورِ خاکِ شہید"
اگر دلوں میں ہے حُبّ و ہوائے کوئے رسولؐ

ہے ہر محبِّ مدینہ سے کربلا کا سوال
حسینؓ جیسا ہے کون؟ آشنائے کوئے رسولؐ

کہو! حسینؓ کے انکار کی طرح سب سے
نہیں کوئی درِ دولت سوائے کوئے رسولؐ

اُسی کے دل پہ کھلے گا درِ مدینۂ علم
جو لے حسینؓ سے صِدق و صفائے کوئے رسولؐ

وہ سجدہ پھر نہ کسی نے کیا حسینؓ کے بعد
کہ جس پہ ناز کریں سجدہ ہائے کوئے رسولؐ

سرِ سناں بھی یہ اعلان سرِ حسین کا ہے
کہ سرنگوں نہ کبھی ہو لِوائے کوئے رسولؐ

پیام سب کو ہے یہ اَلحسین و مِنّی کا
حسینؓ سے ہے وفا اقتضائے کوئے رسولؐ

اگر ہے عشق محمدؐ سے اور مدینے سے
تو ہر کسی کی ہے تکریم ادائے کوئے رسولؐ

عمرؓ ہیں، حیدرؓ و عثمانؓ ہیں کہ ہیں بوبکرؓ
سبھی کی عزت و عظمت بڑھائے کوئے رسولؐ

پلائے ساقیٔ کوثرؓ نے جام تقویٰ کے
تقیّہ ہو نہیں سکتا غذائے کوئے رسولؐ

وہی ہے مسندِ رفعت کا مستحق جس کو
حریمِ عز و شرف میں بٹھائے کوئے رسولؐ

نہیں کیا کسی معصوم نے تبرّا جب
تو خلق کو کہاں؟ اِذنِ جفائے کوئے رسولؐ

نبیؐ نے جیسے نوازا جسے نواز دیا
کسی کا حق نہیں بجز عطائے کوئے رسولؐ

ہو سبّ و شتم سے ایذائے مومناں کیونکر؟
کہ ہے اخوتِ دیں مدعائے کوئے رسولؐ

ہے اہل بیت کا لطف اب بھی اہل بیعت پر
کہ سب پہ نور فشاں ہے فضائے کوئے رسولؐ

کہ مصطفیٰؐ سے ہے نسبت جنھیں، ہے ان کے لیے
درودِ آلِ محمدؐ دعائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ علیہ السلام پہ ہو درود
غمِ حسینؑ ہے سوزِ نوائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے قوموں کی حُرّیت کا امیں
غمِ حسین کا مسلک سکھائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے آئینۂ شعورِ حیات
غمِ حسینؑ سے دنیا دکھائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے تنویرِ جرأتِ کردار
غمِ حسینؑ سے ہمت دلائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے تفسیرِ حکمت و ایماں
غمِ حسینؑ سے قرآں سنائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے تزئینِ جامۂ تقویٰ
غمِ حسینؑ سے جاں کو سجائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے معمارِ مسکنِ اُلفت
غمِ حسینؑ دلوں میں بسائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے محسن ضمیرِ عالم کا
غمِ حسینؑ سفیرِ صلائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے تقدیسِ عفت و عصمت
غمِ حسینؑ ہے گویا ردائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے حرف و بیان کی دولت
غمِ حسینؑ کی ثروت ثنائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ کا حق لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
غمِ حسینؑ سے باطل مٹائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے سُبحَانَ رَبِّیَ الْعَلٰی
غمِ حسینؑ ہے مسجد نمائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ سے ہے کاروانِ غیرتِ دیں
غمِ حسینؑ ہے بانگِ درائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے سلطانِ نصرتِ اسلام
غمِ حسینؑ نصیرِ لقائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ سے غافل ہو کیوں؟ ملیں جس کو
غمِ حسینؑ میں صبح و مسائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے ہر سو فروغِ مہر و وفا
غمِ حسینؑ میں ارض و سمائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے سّرِ سُرورِ رُوحانی
غمِ حسینؑ ہے فقر و غنائے کوئے رسولؐ

غمِ حسینؑ ہے ایثار و صبر و خودداری
غمِ حسینؑ ہے ہر دم برائے کوئے رسولؐ

عطا کسی کو ہو غم تو غمِ حسینؑ ملے
دلوں کو اور غموں سے بچائے کوئے رسولؐ

جہادِ عشق وہ ماتم سے آگے ہے کہیں جو
حسینیت سے جہاں کو بتائے کوئے رسولؐ

فقیرِ صدقۂ شبیر مَیں ہی اک نہیں بس
ہے سب پہ سایۂ جُود و سخائے کوئے رسولؐ

اُسی کا نعرۂ لبیک یا حسینؑ! ہے حق
رہے نہ دل بھی جس کا جدائے کوئے رسولؐ

وسیلہ اُس کی طرف اور کیا؟ تلاش کروں
ہے جو حسینؑ کا ربّ اور خدائے کوئے رسولؐ

ہو خوفِ ظلمتِ دوراں کسے؟ ہے سب کے لیے
کتاب و سنت و عترت ضیائے کوئے رسولؐ

زباں سے ہو کہ عمل سے کہ جاں سے ہو، آصف!
فقط شہادتِ حق ہے ولائے کوئے رسولؐ

مرزا آصف رسول

رباعیات

دل کا خون ہوتا ہے، سلگتا ہے دماغ
لو دینے لگتا ہے جگر کا داغ داغ
جب آگ بھڑک اُٹھتی ہے جسم وجاں میں
تب جا کے جلتا ہے رُباعی کا چراغ

....

آزاد فضاؤں کا پرندہ ہوں میں
ہر لحہ نئی شان سے زندہ ہوں میں
رکھتی ہے میری فِکر بے چین مجھے
شعلہ سا سرِ عرش جہندہ ہوں میں

....

شعلے کی طرح لچک کے بل کھاتی ہو
غنچہ سی مہک کے شرماتی ہو
پڑھ لیتی ہو آنکھوں سے مرے دل کا حال
دیکھوں جو نظر بھر کے لجا جاتی ہو

....

کیا تیرا بدن ہے یہ گلابی گلابی
آنکھیں ہیں تری مست شرابی شرابی
اِک پیاس جگا رکھتے ہیں میرے دِل میں
گل رنگ ترے ہونٹ، یہ آبی آبی

....

ہوتا جو یہاں کوئی مِلا بھی ہوتا
اِک ضابطۂ جرم و سزا بھی ہوتا
کہتا ہے یہ مُلحِد بھی غضب میں آکر
اے کاش یہاں کوئی خدا بھی ہوتا

....

جب عقل پہ اَوہام کا پردہ پڑ جائے
اِنسان عقیدت کی لحد میں گڑ جائے
پھر اُس کو کوئی بات سُجھانا ہے محال
جیسے کہ خرِ بدخو اَچانک اَڑ جائے

....

معصوم اداؤں کے لیے سَرو وسَمن
نوخیز بہاروں کا چمن زار بدن
ہر شام ترے لمس سے جھلمل جھلمل
ہر صبح ترے حُسن سے روشن روشن

....

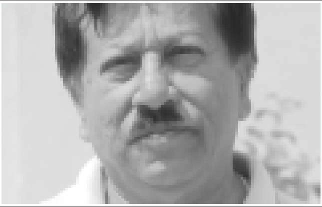

زبیر بازغ

14 اگست کے حوالے

[میری زمیں، میرے وطن]

میری زمیں میرے وطن
حرفِ دُعا تیرے لیے
صوت و صدا تیرے لیے
تیرے لیے ہے جان و تن
میری زمیں میرے وطن

سرحد فصیلِ امن سی
گلیاں سراپا روشنی
ہر شہر چاندی کی ردا
دیہات سونے کی ڈلی
جنگل خزانے ہیں ترے
دریا زمانے ہیں ترے
تیرے محافظ علم و فن
میری زمیں میرے وطن

جھرنے ترے بانگ درا
مٹی بھی تیری کیمیا
تسبیح کرتی ہے ہوا
لب پہ یہ اس کے ہے دعا !
ہر ذرّہ تیری خاک کا
سورج بنے افلاک کا
قائم رہیں کوہ و دمن
میری زمیں میرے وطن

روشن ستاروں پہ نظر
ہر شخص مصروفِ سفر
لیکن ذرا آہٹ ہوئی
جب بھی تری دہلیز پر
عہدِ محبت کی قسم
گھر سے نِکل آئیں گے ہم
باندھے ہوئے سر پہ کفن
میری زمیں میرے وطن

خاور اعجاز

مرا وطن

وفا کی جو امین ہے
وہ پاک سرزمین ہے
وطن مرا حسین ہے
حسین ہے مرا وطن

مرا وطن ، مرا وطن

یہاں کے لوگ ہیں جری
زمیں یہاں کی ہے ہری
چمن خزاں سے ہیں بری
بری خزاں سے ہیں چمن

مرا وطن ، مرا وطن

مرا لہو ، ترا لہو
وطن کی شان و آبرو
چلن ہمارے سرخ رو
ہمارے سرخ رو چلن

مرا وطن ، مرا وطن

مرے وطن کی دل کشی
فدا ہے جس پہ زندگی
کرن کرن پہ چاندنی
یہ چاندنی کرن کرن

مرا وطن ، مرا وطن

جہاں پہ اپنی دھاک ہے
شفا ، وطن کی خاک ہے
عدن ، زمینِ پاک ہے
زمینِ پاک ہے عدن

مرا وطن ، مرا وطن

ستارہ و ہلال ہے
یہ قوم لازوال ہے
وطن مرا نہال ہے
نہال ہے مرا وطن

مرے وطن کی ہے بنا
یہ لا الٰہ کی صدا
مرا یہ من کہے سدا
سدا کہے مرا یہ من

مرا وطن ، مرا وطن

شوکت محمود شوکت

تعارف

ڈاکٹر نثار ترابی 10 اکتوبر 1961 کو مورگاہ راول پنڈی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی آٹھ جماعتیں اپنے گاؤں کے گورنمنٹ سکول ''دومیل''، تحصیل جنڈ ضلع اٹک میں پڑھیں۔ 1977 میں ایلیٹ ہائی سکول مورگاہ سے میٹرک کیا۔ اسی ادارے سے 10 اکتوبر 1985 میں ایک معلم کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ایف اے اسلامیہ کالج گرومندر کراچی، بی اے، بی ایڈ اور ایم اے اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے جب کہ ایم فل اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور پی ایچ ڈی اُردو کی سند فضیلت 2006 میں کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تدریسی فرائض کی انجام دہی کے دوران ہی 1991 میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے مقابلے کے امتحان میں ڈویژن بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے بحیثیت استاد وابستہ ہوئے۔ آپ مذکورہ کالج کے علمی مجلّے کے مدیر بھی رہے۔ 36 سال تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد 9 اکتوبر 2021 میں بہ طور ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر شعبہ اُردو ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

ڈاکٹر نثار ترابی کا شمار معاصر عہد کے ممتاز غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی ایک نمائندہ شاعر اور اسکالر کی حیثیت سے دنیا کے متعدد ممالک میں منعقدہ عالمی مشاعروں اور کانفرنسز میں ملکی ادب کی نمائندگی کا اعزاز رکھتے ہیں۔ اب تک ان کی چار شعری مجموعوں کے علاوہ تنقید، تحقیق اور تدوین وانتخاب پر مشتمل 10 کتب شائع ہو چکی ہیں ۔ ادبی تنظیموں نوائے سحر، سویرا، اور حرف وآواز کے بانی سیکرٹری جنرل ہیں۔ راولپنڈی اور اسلام آباد میں گزشتہ چار دہائیوں سے علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد میں بھی بہ طور کمپیئر اور اسکرپٹ رائٹر کام کیا اور سیکڑوں قومی سطح کے مشاعروں اور موضوعاتی پروگراموں میں شرکت کی۔ ڈاکٹر نثار ترابی متعدد قومی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ گزشتہ بائیس برسوں سے کئی قومی اور نجی یونیورسٹیوں سے وابستہ ہیں۔ آپ کے تحریر کردہ 40 سے زائد تحقیقی و تنقیدی مقالات یونیورسٹی ہائر کمیشن سے منظور شدہ مجلات میں شائع ہوئے۔ آپ کئی جامعات کی مجلس مشاورت کے رکن ہیں۔ 26 طلبہ نے آپ کی زیرِ نگرانی متفرق موضوعات پر مقالات تحریر کرکے ایم فل اُردو کی سطح کا تحقیقی کام مکمل کیا ہے۔ مختلف جامعات میں زیرِ تعلیم ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مجموعی طور پر ایک سو سے زائد طلبہ کے خارجی ممتحن ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ مختلف جامعات میں ان کی شخصیت اور شاعری ایم اے اردو اور ایم فل اردو کے متعدد مقالات کا موضوع بنی۔

☆☆☆☆☆

نعمان منظور

بارات گلابوں کی —— اُردو کے شالیمار کا پہلا تختۂ گلاب

سید ضمیر جعفری

تقریبات میں ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنا تو ''حرف و نوا'' کی ایک خوش آئند روایت ہے اور روایات ہی تمدنوں کی بنیادیں فراہم اور دیواریں استوار کرتی ہیں بلکہ میں تو یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ وہ قانون بھی، دیرپا نہیں ہوتا جس کی جڑیں سماج میں گہری نہ ہوں۔ تو آپ نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے آپ کا شکریہ ادا کر دیا۔ مگر میرے نزدیک اس سے حساب برابر نہیں ہوا کیونکہ میں اس تقریب کا مہمانِ خصوصی ہوں جبکہ میں آپ کو اپنا محسنِ خصوصی سمجھتا ہوں کیونکہ اٹک میں تو ہماری روح اٹکی ہوئی ہے۔

میں تو یہاں کی حاضری کو اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔ مجھے تو اس شہر کی گلیوں میں دفن اپنی جوانی کی خوشبو ملتی ہے۔ یہ تو وہ شہر ہے کہ میں سوتے میں بھی اس کی طرف چلتا ہوں۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور وہ گہوارہ ہے جہاں میری نوا نے بولنا سیکھا۔ میرا حرف سورج کے سامنے آیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ آج اگر میرے ذہن میں سونے کا کوئی تار چمک رہا ہے تو وہ اسی خطے کی ریت کی عطا ہے۔ اٹک میری شاعری کا کعبہ اگر نہیں بھی ہے تو ''پنجہ صاحب'' ضرور ہے۔

مجھے یہاں ڈاکٹر غلام جیلانی برق جیسے جید مفکر اور پروفیسر ایش کمار، پروفیسر ملک فضل الٰہی اور پروفیسر عبدالحمید نیازی جیسے فاضل اور شیریں گفتار اساتذہ کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور جنرل اختر ملک، کرنل شیر محمد شاد، ملک غلام جیلانی آف کھنڈہ، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، قاضی احمد شفیع، پرنسپل مجی، انور علی انور اور سورج پرکاش جیسے پیارے دوست بھی ملے جن سے میری زندگی کا راستہ بے حد دلچسپ، آسان اور بامعنی بھی رہا۔ پھر آج اس لمحے کے حوالے سے بھی جو ہماری مٹھی میں ہے۔ مجی پروفیسر سعد اللہ کلیم اور برادر عزیز مرزا حامد بیگ جیسے ہمارے عصری ادب کے روشن میناروں کی اس شہر میں موجودگی میرے لیے ایک تازہ روحانی کشش کا باعث تھی اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ''گلابوں کی بارات'' کے گلابی دولہے--- پروفیسر نثار ترابی نے بھی اسی مٹی سے جنم لیا ہے تو میری خوشی بلیوں اُچھلنے لگی۔

غالباً ۸۵-۱۹۸۴ء میں جب ہم راولپنڈی میں پہلی مرتبہ نثار ترابی سے ملے تو ہم سمجھے ہم اس نوخیز سانولے سلونے نوجوان کے مخفی خدوخال پر نثار ہو گئے تھے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ

ہمیں تو اٹک کی مٹی اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔

اس بات کی تصدیق تو ڈاکٹر مرزا حامد بیگ جیسے محققین ہی کر سکتے ہیں کہ ’’ماہیا پنجابی شاعری کی قدیم ترین آواز ہے یا نہیں مگر اس صنفِ کے مقبول ترین ہونے میں تو شاید کسی کو کلام نہ ہوگا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اُردو ماہیا کا آغاز ہمارے ادبی مرشد مولانا چراغ حسن حسرت نے اپنی اس مشہور ’’گلاب کلی‘‘ سے کیا تھا۔

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

مگر پھر اس کے بعد --- جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ بات آگے نہ بڑھ پاتی کہ اس بارے میں اب نثار ترابی اور آلِ عمران اور بعض دوسرے نوجوان شعرا پنجابی کے اس شالامار کو آراستہ کرنے کی کاوشیں کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ’’بارات گلابوں کی‘‘ میرے نزدیک اس شالیمار کا پہلا ’’تختۂ گلاب‘‘ ہے۔ پنجابی ماہیے کو اُردو نژاد پیکر میں ڈھالنے کے عمل میں نثار ترابی کو جو کامیابی ہوئی ہے مجھے اس پر واقعتاً کوئی حیرت نہیں کہ یہ تو اس کی روح کے انجام کا قدرتی ردِعمل تھا۔ اس سے اپنی مٹی سے فرار کیونکر ممکن تھا۔

نثار ترابی نے اُردو ماہیا لکھ کر پنجابی شاعری کا شملہ اونچا کر دیا۔ یہ سواں، جہلم اور نیلم کے پانیوں میں ڈھلی ہوئی شاعری ہے۔ شعر میں بانسری کا ایسا درد کم کم ہی سننے میں آیا۔ نثار ترابی کو داد کیا دوں میرا تو اُسے چومنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسی تخلیقات کی قدر و قیمت بھی بے شک ایک وقیع تذکرے کی متقاضی ہے مگر میں اس کتاب کی اشاعت کو قومی یک جہتی کے حوالے سے ایک نہایت گراں قدر خدمت متصور کرتا ہوں جس سے ہماری تہذیبی وحدت کو تقویت ملے گی۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے وقت کی قلت کے باعث بہت کم کہا مگر یقین کیجیے کہ کم از کم میں اس سے زیادہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

بیگم و جناب نثار ترابی، جناب فتح محمد ملک، جناب سرفراز شاہد، جناب طلحہ جاوید، جناب ڈاکٹر شیر علی
جناب عمران علی، محترمہ شائستہ تاج اور جناب عبدالرؤف کیانی

اپنی چھاں دا سیک - پنجابی شعری روایت میں ایک اضافہ

مجھے آج اکادمی ادبیات کے ہال میں منعقدہ ڈاکٹر نثار ترابی کے پنجابی شعری مجموعے کی تعارفی تقریب میں شریک ہو کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے اس لیے کہ یہ پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے عظیم صوفی شعراء کو یاد کرنے کا ایک وسیلہ بھی ہے اور ایک ایسے شاعر کی شعری صلاحیتوں کے اعتراف کا مرحلہ بھی ہے جس نے قبل ازیں اردو شاعری میں نام پیدا کیا اور اب پنجابی تخلیق کار کی حیثیت سے بھی اپنا دستاویزی ثبوت میدانِ فکر و نظر میں پیش کر رہا ہے۔ اگرچہ یہ ریکارڈ بھی ادبی تذکروں کا حصہ ہے کہ ان کی تخلیق کردہ پنجابی غزلیں اور نظمیں اس مجموعے (اپنی چھاں دا سیک) سے قبل ادبی رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں جبکہ ان کے لکھے ہوئے پنجابی گیت ملک کے کئی نامور فن کار ریڈیو اور ٹیلی وژن سے پیش کر چکے ہیں۔ یہ بیک وقت ایک دل نواز شاعر اچھے محقق اور گہری تنقیدی نظر رکھنے والے نقاد ہیں۔

سب سے پہلے ان کا جو کارنامہ جس نے مجھے متاثر کیا تھا میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب میں اردو زبان پہ اتنا بڑا احسان ہمارے یا ان کے کسی ہم عصر نے نہیں کیا۔ انہوں نے ہمارے علاقے چکوال کے ایک صوفی شاعر کو جو ولی دکنی کا ہم عصر تھا، پہ تحقیق کی اور یہ ثابت کیا کہ اردو کے سلسلے میں دکن میں جو کام ہو رہا تھا ولی دکنی اور ان کے معاصرین کے زمانے میں' تو اسی زمانے میں ہمارے چکوال میں بھی اسی جیسا کام ہو رہا تھا۔ شاہ مراد خانپوری پر ان کی جو کتاب ہے وہ ان کی پہلی تحقیقی کاوش ہے جسے میں اس اعتبار سے شاہکار سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی پٹا پٹایا موضوع نہیں تھا۔ انہوں نے کوئی ایسی شخصیت موضوع انتخاب نہیں کی تھی کہ جس پر پہلے سے کوئی بڑا تحقیقی کام ہو چکا تھا۔ اس موضوع کو انہوں نے فراموش کاری سے نکالا اُسے تاریکی سے روشنی میں لے کر آئے اور ایسا کام کیا کہ میرا خیال ہے ہمارے جن محققین نے اب تک اردو ادب کی تاریخوں پر کام کیا ہے اردو زبان کی تاریخ پہ کام کیا ہے' انہیں ایک مرتبہ پھر اپنے کام کو دیکھنا پڑے گا اور وہاں سے شروع کرنا پڑے گا کہ جس طرف انہوں نے اشارہ کیا۔ پھر اردو غزل پہ انہوں نے جتنا عمدہ تحقیقی کام کیا ہے وہ بہت کم نقادوں یعنی میرے سمیت جتنے بھی تنقید لکھتے چلے آئے ہیں۔ ان کے زمانے میں یا اس سے پہلے اُن کے کام پہ ان کا کام زیادہ اہمیت رکھتا ہے زیادہ ممتاز ہے اور انہوں نے کسی ایسی ویسی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند نہیں لی بلکہ کراچی یونی ورسٹی سے یہ سند لی ہے۔ اب رہی بات اُن کی شاعری کی تو میرے نزدیک اُن کی شاعری اُردو کی بہترین شاعری ہے۔

فتح محمد ملک

ایک زمانے میں شعرا نے کوشش کی کہ وہ ایسی پنجابی لکھیں جیسی جالندھر میں لکھی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک کوشش یہ بھی ہوئی کہ پنجابی زبان کا کوئی روزنامہ نکالا جائے۔ ایک پنجابی روزنامہ نکالا بھی گیا مگر وہ چل نہ سکا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیوں نہ چل سکا؟ لکھنے والے ایسی زبان لکھتے تھے کہ پنجابی جب اسے پڑھتے تھے تو پرے پھینکتے تھے۔ پھر اردو اخبار لے کر پڑھتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ انہیں اس اخبار کی زبان کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ اب یہ ہے کہ انہوں نے ادھر دیکھا ہے۔ ابھی جتنی شاعری آپ نے سنی ہے تو اس میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جسے اردو سے درآمد کیا گیا ہو۔ غیر شاعرانہ طور پر شعوری منصوبہ بندی کے ساتھ۔ ایسا تو کوئی لفظ ہی نہیں ہے اور شاعری ایسی ہے کہ پڑھیں تو پڑھتے ہی چلے جائیں۔ آپ اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے 'ایک تازگی اور سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ ابھی انہوں نے ایک طویل غزل پڑھی جس میں دھرتی کے سارے ہی کلاسیکی شعرا کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ میں نے جب یہ کتاب دوبارہ پڑھی۔ یہاں بھی سنی کہیں یہ مجھے احساس نہیں تھا کہ میں یہ پنجابی میں سن رہا ہوں یا اردو میں سن رہا ہوں۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اچھی شاعری سن رہا ہوں۔ اس میں لفظوں کا جو مسئلہ ہے۔ چن چن کے لفظ لانا' وہ نہیں جیسی زبان ہے ویسی ہی اس کا فنی برتاؤ بھی ہے۔

میں خود پنجابی ہوں۔ پنجاب کے ایک پس ماندہ علاقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہم پنجابیوں کو یہ فکر رہتی ہے کہ ہم جو زبان لکھیں وہ زبان ایسی ادبی ہو کہ امرتا پریتم اور موہن سنگھ جیسے ادیب پڑھیں تو کہیں کہ یہ بڑی اچھی ادبی زبان استعمال کی گئی ہے' یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے اپنے ہی پڑوس میں رہنے والے جو لوگ ہیں اُن کے دل پر وہ اثر کرے اور وہ سوچیں کہ پنجابی شاعری بلھے شاہ' میاں محمد بخش کے بعد ختم نہیں ہوگئی۔ اب بھی اس میں وہ تاثیر پیدا ہو سکتی ہے اور ہو رہی ہے اور اس کے تسلسل میں بات ہو رہی ہے۔ مجھے اُن کی یہ بات پسند آئی اور ان کا انداز اچھا لگا اور یوں لگا کہ اب پنجابی زبان صحافت کی زبان بھی بن سکتی ہے اگر اس طرح کی زبان لکھیں۔ اگر اس طرح کی زبان میں کوئی پنجابی روزنامہ نکلے گا تو اسے کوئی پنجابی پھر سے پھینک کے کوئی اور اخبار نہیں اٹھائے گا۔ اب وہ اسی کو پڑھتا چلا جائے گا۔ تو یہ بھی ان کا جو کام ہے یہ ایک یادگار کام ہے اور میں اس بات پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میرا بھی ان سے ایک دیرینہ تعلق ہے اور میرا بھی ایک دوست میرا ہی ایک ہم سفر (ایک طرح سے) اس نے ایسا راستہ نکالا ہے کہ جو راستہ امرتسر کو نہیں جاتا جو راستہ شاہ لطیف بھٹائی کے عرس میں شامل ہونے کے بعد' رحمان بابا' بلھے شاہ' وارث شاہ اور خواجہ غلام فرید سے ہوتا ہوا میاں محمد بخش تک پہنچ جاتا ہے اور پھر آگے بھی نکلے گا اور یہ پنجابی شعری روایت میں ایک اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی پنجابی زبان کی ترقی کا ایک نیا راستہ ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک قابلِ ہزار رشک تحقیقی و تنقیدی کام

معاشرے میں کتنے افراد ہوں گے جو ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہوں۔ ان کی تعداد یقیناً بہت زیادہ نہیں ہے اور گنتی کے جو افراد ایک سے زیادہ شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں ان میں سے ایک معتبر اور ممتاز نام ڈاکٹر نثار ترابی (پ: 10 اکتوبر 1961ء، راولپنڈی) کا بھی ہے۔

پاکستان میں ان کی شناخت ایک ذمہ دار شہری اور عالم فاضل شخص کی ہے۔ تعلیمی دنیا میں وہ ایک قابل استاد اور ادبی شعبے میں وہ ایک صاحبِ اسلوب شاعر، عمیق النظر نقاد اور سنجیدہ محقق ہیں۔ موصوف بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری رومان خیز فضاؤں سے ہوتی ہوئی عصری مسائل کو شاعرانہ ہنرمندی کے ساتھ قرطاس وقت کی زینت بناتی ہے۔ ان کے اردو اور پنجابی چار شعری مجموعے نئی شاعری میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ رنگ شعر ملاحظہ ہو:

جہاں نثار ترابی گزر رہے اپنا وہاں
بشر ہیں خوف میں لپٹے، بشر کے ہوتے ہوئے

ڈاکٹر نثار ترابی نے اپنے ماحول اور اس کا حصہ بن جانے والے عصری مسائل کو کسی تماشائی کی آنکھ سے نہیں دیکھا، بل کہ اسے فکر کا محور بنا کر غزل کی روح کا حصہ بنایا، یہ رائے دیگر منتخب شعرا کے ساتھ ان کی اپنی شاعری پر بھی صادق آتی ہے۔

تنقید اور تحقیق و تدوین اور انتخاب پر مشتمل چھ کتب بھی معرضِ شہود پر آ چکی ہیں۔ جن میں ان کا ایم فل اردو کا مقالہ ''حضرت شاہ مراد خان پوری۔۔ حیات و فن'' (شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) بھی شامل ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک شان دار تحقیقی کاوش ''اردو غزل کے عصری رویے'' (زیرِ اہتمام: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع اول 2024) منصۂ شہود پر آئی ہے۔ یہ ان کا پی ایچ۔ ڈی اردو کا مقالہ ہے جس پر 2006 میں انھیں شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی کی جانب سے پی ایچ۔ ڈی کی وقیع سند عطا کی گئی۔ یہ کتاب نئی اردو غزل اور اس کے موضوعات کے فہم کے ساتھ فکر و فن کے بہت سے زاویوں

شبیر احمد قادری

کو سامنے لانے کا موجب ہے۔ یہ تحقیقی اساسی کتاب مصنف نے اس یقین کے ساتھ نذرِ قارئین کی ہے کہ غزل ہی وہ واحد صنفِ سخن ہے جو ہمیشہ سے ہر دور میں ہر دل عزیز رہی ہے۔ اس کی اہمیت اور دل ربائی سے انکار اس لیے ممکن نہیں ہے کہ یہ اپنے آغاز سے اس لمحۂ موجود تک جس طرح عصری رویوں کی ترجمانی کا حق ادا کرتی رہی ہے، ویسا حق کسی دوسری شعری صنف کے حصے میں نہیں آیا ہے۔" (ص 15)، 578 صفحات کو محیط اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

باب اول:

(حصہ اول) اردو غزل آغاز سے 1857 تک،

(حصہ دوم) 1857 کے بعد اردو غزل،

باب دوم:

(حصہ اول)، جدید ادبی تحریکیں (تاریخی، سیاسی اور نظریاتی پس منظر... فکری مباحث)،

(حصہ دوم)، 1947 کے بعد اردو غزل (ایک اجمالی جائزہ)،

باب سوم:

1958 کے بعد اردو غزل (ایک اجمالی جائزہ)،

باب چہارم:

غزل (چند اہم رجحان ساز عصری رویوں کے تناظر میں)،

باب پنجم:

(حصہ اول)، غزل کے موضوعاتی اور اسلوبیاتی روّیے (ایک اجمالی جائزہ)،

(حصہ دوم) غزل کے اسلوبیاتی اور فنی رویے،

باب ششم:

(حصہ اول) حمد نعت اور سلام کی جدید غزلیہ روایت،

(حصہ دوم)، جدید غزل اور اس کی علامتی فضا،

باب ہفتم:

اردو غزل (1988 تا 1997) ہجر اور ہجرت کا نیا منظر نامہ،

اس تناظر میں ابواب کی تفصیل بھی مصنف کی محنت اور علمی لگن کی ترجمان ہے۔ مثال کے طور پر پہلے باب میں اردو غزل کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی پس منظر، ریختہ کی روایت کے آغاز سے غالب، مومن، ذوق اور بہادر شاہ ظفر تک کے شعرا کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں علی گڑھ تحریک، اکبر، اقبال، اصغر، فانی، حسرت اور جگر کے بعد تحریک پاکستان میں اردو غزل کی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں رومانوی، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور اسلامی ادب کی تحریکوں اور دوسرے حصے میں میر کے رنگِ سخن کی پیروی، 1947 کے فسادات، ناصر کاظمی، عالم تاب تشنہ اور دیگر شعرا کی غزلوں کے نمایاں موضوعات پر مفید طلب بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں 1958 کے بعد اردو اور چوتھے باب میں چند اہم رجحان ساز عصری رویوں پر اظہار خیالات کے بعد اگلے دو ابواب میں غزل کے موضوعاتی اور اسلوبیاتی جہتوں سے متعارف

کرایا گیا ہے۔ چھٹے باب میں مزاحیہ شاعری اور جدید غزل اوراس کی علامتی فضا جبکہ آخری باب میں بیرونی ممالک میں مقیم غزل گو شعرا ،غزل اور شعری ترجمے کی روایت ، جمہوری عہد میں غزل کے ساتھ ساتھ اردو غزل اور اس کے عصری رویوں ان کی اہمیت، مقبولیت اور ہمہ گیریت کو محققانہ شان سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا اختتامیہ مختصر ہونے کے باوصف اپنے اندر جامعیت کے عناصر سمیٹے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی کے نتائج کا حاصل ان نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:

اردو غزل کے عصری رویوں کے عہد بہ عہد مطالعے اور شعری صنف کے طور پر غزل کے فن کے سلسلے میں تحقیقی مہم جوء، سیکڑوں قابل ذکر شعراء کے غائر مطالعے ، معتبر ناقدین کی آراء اور ناقابلِ تردید تاریخی شواہد کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اردو شعری ادب میں غزل کا تعین صرف اور صرف اس کے عہد بہ عہد رویوں کی اثر پذیری اور مقبولیت کی بنا پر ہی ممکن ہے اس لیے کہ فنی طور پر بھی صنف عصر اور روح عصر کو محفوظ کر لینے کی قدرتی صلاحیت رکھتی ہے۔ بلا شبہ اس کی یہ فنی خوبی دوسری شعری اصناف کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔''

''اس کا تحقیقی سرمایہ معیار اور مقدار کے اعتبار سے بھی خصوصی امتیاز کا حقدار ٹھہرتا ہے۔''

'' اپنے آغاز سے لحۂ موجود تک یہ واحد صنف ہے جس کا تتبع سب سے زیادہ کیا گیا اور اسی نے اردو کا بہترین شعری سرمایہ ایک صنف کی حیثیت سے محفوظ کیا۔''

''ہم پورے وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزل عصر کے ساز پر گایا ہوا وہ نغمہ ہے جو وقت کی ہر بدلتی ساعت میں برابر سناتا رہے گا۔ عصری رویوں کی اثر پذیری ، مقبولیت ، ہمہ گیریت اور اہمیت کے پیش نظر اس شعری صنف کا تخلیقی وفور اور اس کے عہد بہ عہد ترقی کے روز افزوں امکانات کم ہوں گے نہ اس کی اہمیت ہی ماند پڑے گی۔'' (ص 537)۔

ڈاکٹر نثار ترابی کی تحقیقی کتاب اردو غزل کے حوالے سے لکھی گئی کتب میں سے سب سے جامع اور مربوط و منضبط ہے۔ ازروئے موضوع یہ کتاب ضرور محدود ہے تاہم مصنف نے صنفِ غزل سے اپنی ذہنی مناسبت اور فکری صلابت وحشمت اور قابلِ ہزار رشک تحقیقی دسترس کی بدولت اسے معاصر عہد کی ایسی دستاویز بنا دیا ہے جس پر مصنف بجا طور فخر کر سکتے ہیں۔ غزل نگاروں کے ساتھ ساتھ یہ کتاب غزل کے شائقین ، ناقدین اور محققین کے لیے انمول تحفہ ہے۔ طاقِ وقت میں رکھا ہوا یہ وہ روشن چراغ ہے جس سے بہت سے نئے چراغ جلائے جا سکتے ہیں۔ فتح محمد ملک نے شاعر دل نواز اور نکتہ رس محقق ڈاکٹر نثار ترابی کے حوالے سے صد فی صد درست لکھا ہے کہ زیر نظر تحقیقی کام ہماری یونیورسٹیوں کی اردو تحقیق کو اندھیروں سے نکال کر روشنیوں میں لے آیا ہے'' (پس

ورق)، پروفیسر سحر انصاری نے مصنف کی وقتِ نظر اور شعور تحقیق کی تعریف کی ہے جبکہ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر نے ان کی فکری بصیرت اور فنی ریاضت کی گواہی دیتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ خود جتنے اچھے غزل گو ہیں، اتنا ہی وہ اس صنف کے اداشناس بھی ہیں۔ انھوں نے غزل کے گھر آنگن میں بکھری عصری حسیت اور اس کے منظر نامے میں برگ و بار لاتے رویے سمیٹنے میں اپنے فکری ریاض اور فنی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے اور کامگار ہوئے ہیں۔ غزل کے نئے مطالعات کے تناظر میں ان کی یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔'' (پس ورق)، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور ڈاکٹر محمد کامران نے بھی ڈاکٹر نثار ترابی کے ذوق تحقیق کو سراہتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے مصنف کے تحقیقی طریق کار کی ستائش کی ہے اور ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ڈاکٹر نثار ترابی کے منفرد انداز تحریر اس کی صفات اور وضاحت کے ساتھ ساتھ ان کے جمالیاتی اسلوب کی قدر افزائی کی ہے۔

''اردو غزل کے عصری رویے'' میں ڈاکٹر نثار ترابی نے غزل گو شعرا کے تخلیقی امتیازات کی بازیافت ہی نہیں کی بلکہ بہت سے شعرا کو ان کے شعری امکانات سمیت دریافت بھی کیا ہے اور یہ جہانِ تحقیق میں قابلِ تحسین اضافہ ہے۔ اعلیٰ درجے کا محقق سابقہ و موجودہ ناموں کے برعکس دیگر مطالعے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ نئی دنیاؤں کی سیر بھی کراتا ہے اور بحیثیت محقق یہ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر نثار ترابی کی یہ کتاب سابقہ تحقیقات میں وقیع اور باوقار توسیع کا درجہ رکھتی ہے۔

''اردو غزل کے عصری رویے'' اس لحاظ سے بھی اہم کتاب ہے کہ ڈاکٹر نثار ترابی نہ تو بڑے ناموں سے مرعوب دکھائی دیتے ہیں نہ وہ ان کی مدلل مداحی پر یقین رکھتے ہیں۔ شاعر اپنے شعر کی اساس پر ہی چھوٹا بڑا ہوتا ہے، ظاہری شہرت بھی اس ضمن میں چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ شہرت اور عظمت دو یکسر مختلف صورتیں ہیں۔ ضروری نہیں جو شاعر بوجوہ زیادہ مشہور ہے، بحیثیت شاعر بھی وہ بڑے مقام و مرتبے کا حامل ہو۔ اس حقیقت کو بہ دل و جاں تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ حقیقی شاعری کی دنیا ہی اور ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے اپنے پیش لفظ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''دورانِ تحقیق میں یہی کوشش رہی ہے کہ اپنے محققانہ نتائج فکر کی پیش کاری میں کسی قسم کا لسانی، گروہی، علاقائی یا نظریاتی تعصب اجاگر نہ ہو اور ذاتی پسند اور ناپسند کو نتائج کو تحقیق پر اثر انداز نہ ہونے دیا جائے۔'' (ص 12) یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ کتاب کی سطر سطر اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ محقق کا انداز حد درجہ متوازن ہے۔ اور تو اور محقق نے معروضی انداز میں حقائق تک رسائی کی قابلِ قدر سعی کی ہے۔ انھوں نے مطبوعہ ثانوی ماخذ

جناب جواز جعفری، جناب غفور شاہ قاسم، جناب نثار ترابی، جناب انوار فطرت، جناب اختر، جناب علی محمد فرشی
جناب رؤف امیر، جناب علی ارمان اور عثمان ناتم

سے ضرور استفادہ کیا ہے مگر اصل متون و ماخذ کے حصول کے لیے انھوں نے وطنِ عزیز کے مختلف شہروں کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے اسفار محض تفریح کی نذر نہیں کیے بلکہ اپنے موضوع کے لیے ضروری مواد جمع کرتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں پاکستان کے غزل گو شعرا کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک سے متعلق گل ہائے سخن اور ان کے رنگوں کی بہار دکھائی دیتی ہے۔ مصنف نے ان غزل نگاروں کے افکار کا جائزہ بھی لیا ہے۔ یوں اردو غزل کے حوالے سے اس کتابی گلدستے میں پھولوں کی نزاکت، رنگوں کی بہار اور خوشبوؤں کی یک جائی سب کچھ مل جاتا ہے۔ گویا یہ سب کچھ ڈاکٹر نثار ترابی کی شبانہ روز محنت، علمی لگن اور ذوقِ فراواں کا وہ ثمرِ شیریں ہے جس کی مٹھاس دیر تک محسوس کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

محترمہ فرخندہ شمیم، جناب نثار ترابی، جناب سلیم مظہر، جناب یعقوب نظامی، محترمہ فریدہ حفیظ، اور دیگر اہلِ قلم

ڈاکٹر نثار ترابی: تخلیقیت کا استعارہ

کار ادب سے جڑے رہنا بھی بڑی بات ہے لیکن ادب اور فن کی تخلیقی سطح پر زیست کرنا ایک عجیب مقام ہے جو ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوتا۔ ”یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا“ کے مصداق یہ مقام معدودے چند ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو میسر آتا ہے۔ ہمارے دیرینہ اور مہربان دوست ڈاکٹر نثار ترابی ایسے ہی معدودے چند ادیبوں اور شاعروں کے قبیلے سے ہیں جو فن کی تخلیقی سطح پر نہ صرف زندگی گزارتے ہیں بلکہ اپنی جولانیٔ طبع اور باطنی توانائی کی بدولت ایسا کرنے پر گویا اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ادب اور شاعری ہے۔ کار دنیا سے جڑی عادات تو درکنار کار دنیا کی معلومات کے معاملات میں بھی وہ اس دھڑلے کے ساتھ بے نیاز ہیں کہ ایک دن دوستوں کی ایک محفل میں چھڑے پلاٹوں کے تذکرے میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہنے لگے: ”حرام ہو جو مجھے معلوم ہو کہ ایک مرلے میں کتنے کنال ہوتے ہیں۔“ ہم نے کہا آپ اس معاملے میں کیوں بے حال ہوتے ہیں، یہ آپ کا شعبہ ہی نہیں، لیکن جب بات ادب، شاعری اور موسیقی کی ہو تو دوستوں کی نجی محفل ہو، کوئی ادبی تقریب ہو، کوئی علمی کانفرنس ہو یا ریڈیو ٹی وی پر کوئی مذاکرہ ہو، وہ متعلقہ موضوع پر نہ صرف معلومات بلکہ گہرے علمی و ادبی مباحث کے دریا بہاتے ہوئے ”وہ کہے اور سنا کرے کوئی“ کے مصداق حاضرین و سامعین کو دم بخود کر دیتے ہیں۔

نثار ترابی سے ہمارا تعلق زمانہ جاہلیت یعنی کالج کے زمانے کا ہے۔ اسی کی دہائی میں ہم نے ایک ساتھ لکھنے لکھانے کا آغاز کیا۔ ریڈیو میں نوجوانوں اور طالب علموں کے پروگراموں میں حصہ لینا، اخبارات کے ادبی صفحات اور ادبی رسائل میں چھپنے کی ابتدائی دنوں کی یاد گار ہے۔ نوجوانی کے اس زمانے میں ڈاکٹر

نذر عابد

نثار ترابی، نثار احمد نثار کے نام سے لکھتے تھے۔ بعد میں نثار ترابی کا قلمی نام اختیار کیا۔ نوجوانی ہی میں ان کی شعری و نثری تحریریں فنون، اوراق، ماہِ نو، نیرنگِ خیال اور ابلاغ جیسے موقر ادبی جرائد میں باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں۔ پنڈی اسلام آباد کے علاوہ واہ کینٹ اور ٹیکسلا کی ہر اہم ادبی تقریب میں وہ بھرپور انداز میں شریک رہتے تھے۔ انہی ادبی تقریبات میں ان کے رؤف امیر، مقبول کاوش اور وسیم کشفی جیسے لکھنے والوں سے دوستی کے رشتے استوار ہوئے۔

نثار ترابی کی پہلی شعری تصنیف ان کے اردو ماہیوں پر مشتمل ''بارات گلابوں کی'' کے نام سے منظرِ عام پر آئی تو ادبی حلقوں میں اسے خاصی پذیرائی ملی۔ بعد میں ان کی اردو غزلوں پر مشتمل مجموعہ ''ہر صدا مسافر ہے'' اور پنجابی غزلوں کا مجموعہ ''اپنی چھاں واسیک'' سامنے آئے تو ادبی دنیا میں ان کے قد کاٹھ اور ادبی وقار و اعتبار میں مزید اضافہ ہوا۔ یوں اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں اپنے خاص انگ اور آہنگ میں غزل گوئی شاعری میں ان کی خاص شناخت بن کر ابھری۔

تخلیقی ادب سے ہٹ کر ڈاکٹر نثار ترابی جب تحقیق و تنقید کی طرف آئے تو اپنی تحقیقی لگن اور تنقیدی بصیرت کی بنا پر اس میدان میں بھی کامیابی کا اپنا بلند معیار قائم رکھنے میں سرخرو ہوئے۔ شاہ مراد خانپوری کی حیات اور شعری خدمات پر وقیع تحقیقی مقالہ لکھ کر نثار ترابی نے ولی دکنی کے ہم عصر شمالی پنجاب سے تعلق رکھنے والے اردو کے ایک قدیم مگر کم نام شاعر کو نہ صرف متعارف کروایا بلکہ تحقیقی طور پر ان کے شعری مقام و مرتبے کا تعین بھی کیا۔ یوں گویا انھوں نے اردو شاعری کے آغاز و ارتقا میں شمالی و جنوبی ہندوستان اور جنوبی پنجاب کے ساتھ ساتھ شمالی پنجاب کا حصہ بھی تسلیم کروانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ''تحقیق و تخلیق زاویے'' ڈاکٹر نثار ترابی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے کلاسیکی ادب کے علاوہ جدید ادب پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ ادبی سطح کی اعلی ظرفی ہے کہ اس کتاب میں ان کے اپنے معاصرین کے اعتراف فن پر مبنی مضامین بھی شامل ہیں۔

حال ہی میں نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے ڈاکٹر نثار ترابی کا نہایت اہم نوعیت کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ''اردو غزل کے عصری رویے'' کے نام سے خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس مقالے میں اردو غزل کی پانچ سو سالہ تاریخ کا ایک ایسا عہد بہ عہد مطالعہ پیش کیا گیا ہے جس کے تحت مختلف ادوار میں غزل جیسی مقبول صنفِ سخن میں برتے جانے والے لسانی، ثقافتی اور سیاسی و سماجی رویوں کو تجزیاتی سطح پر اپنی تمام تر نزاکتوں اور نفاستوں کے

ساتھ سمیٹ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا چونکہ خود غزل سے تخلیقی سطح پر دہائیوں سے ایک گہرا ربط و ضبط رہا ہے اس لیے اس مقالے میں اردو غزل کے تمام تر پوشیدہ زاویے روشن تر ہوتے چلے گئے ہیں۔ اس مقالے میں نثار ترابی کی تنقید میں ایک تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب خواندگی کے اعتبار سے بلند سطح کی حامل قرار دی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی نے ترتیب و تدوین کے حوالے سے بھی قابلِ تحسین کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے داغ دہلوی جیسے غزل کے سربرآوردہ شاعر کے کلام کا انتخاب کیا۔ فیض صدی مکمل ہونے پر "فکرِ فیض" کے نام سے انھوں نے فیض احمد فیض جیسے مقبول شاعر کے فکر وفن کے تجزیاتی مطالعات پر مبنی سینتیس اہم تنقیدی مضامین کا انتخاب شائع کیا۔ اس کتاب کا ایک اختصاص یہ ہے کہ سکہ بند نقادوں کے علاوہ قدرے نئے لکھنے والے ناقدینِ فن کے مضامین بھی اس میں شامل ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کے لیے مضامین مرتب کرتے ہوئے کسی ایک خاص مکتبۂ خیال سے متعلق ناقدین کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا بلکہ اس سلسلے میں وسیع المشربی کا رویہ اپنایا گیا ہے۔ یوں اس کتاب کے توسط سے فیض صاحب کی فکر کو عام کرنے کے مختلف زاویے میسر آگئے ہیں۔ یہی صورت حال ان کے ایک اور تدوینی منصوبے میں بھی برقرار رکھی گئی ہے جس کے تحت انھوں نے ملک کے معروف نقاد اور دانش ور پروفیسر فتح محمد ملک کے فکر وفن کے حوالے سے مضامین کا ایک انتخاب کیا ہے۔ یہ کتاب ابھی اشاعتی مراحل میں ہے۔

نثار ترابی کے ایک اور شعری مجموعے "خوشبو آواز دیتی ہے" کا بھی احباب کو شدت سے انتظار ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ کتاب بھی اپنی اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی اب کالج اور یونیورسٹی کی درس وتدریس سے رسمی طور پر سبکدوش ہوکر کامل اور بھرپور انداز میں کارِ ادب میں منہمک ہیں۔ غیر رسمی طور پر تو وہ اب بھی اردو ادب کے ایک مقبول ومعروف استاد ہیں جن سے تشنگانِ علم وادب ایک کثیر تعداد میں مستفید ہو رہے ہیں تاہم اب وہ اپنے بہت سے ایسے علمی وادبی منصوبوں کی تکمیل کے لیے شب وروز کوشاں ہیں جو ان کی پیشہ ورانہ زندگی کے جھمیلوں میں کسی قدر التوا کا شکار رہے۔ امید ہے وہ اپنے چاہنے والوں کے لیے نت نئی تخلیقات اور وقیع تحقیقی وتنقیدی مقالات منظر عام پر لاتے رہیں گے۔ یوں شعر وادب کی تخلیقی سطح پر زندگی کرنے والا یہ فن کار اپنی فکری تازگی اور روشن خیالی کے طفیل زندگی کو تازہ ذائقوں اور مستنیر پہلوؤں سے ہم کنار کرتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

پیکرِ محبت

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میری نثار ترابی کے ساتھ پہلی ملاقات کب ہوئی۔ یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ شاید یہ 90ء کی دہائی کی بات ہے۔ میں اس وقت گلبرگ میں رہتا تھا۔ فیڈرل بی ایریا میں شمیم بازل رہتا تھا جو شاعر بھی تھا، موسیقار بھی، اداکار بھی اور مصور بھی۔ شمیم اپنے گھر گاہے بگاہے مشاعرہ کراتا رہتا تھا اور موسیقی کی محفلیں بھی۔ شمیم کے موسیقی میں استاد نثار بزمی تھے۔ ایک مشاعرہ کا بلاوا شمیم کی جانب سے آیا کہ پنڈی سے کچھ مہمان شاعر آئے ہیں۔ میں وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹے انتظار کرنے کے باوجود مہمان شاعر کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اتنا معلوم ہوا کہ پنڈی سے سید ضمیر جعفری صاحب، سرفراز شاہد صاحب اور نثار ترابی آئے ہوئے ہیں، یہ محفل ان کے اعزاز میں ہے۔ میرے ساتھ نیوی کا شاہین فصیح ربانی تھا، فصیح کو نو بجے سے پہلے پہلے میس پہنچنا ہوتا تھا۔ ہم نو بجے محفل سے اٹھ گئے تاکہ فصیح کو میس پہنچنے میں زیادہ تاخیر نہ ہو۔ دوسرے دن اتوار تھا میں گھر پر تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف نثار ترابی تھا، معذرت کرنے لگا کہ مجھے کل تاخیر ہو گئی تھی، پتہ چلا آپ آئے تھے اور واپس چلے گئے۔ میں آپ سے ملنے آنا چاہتا ہوں۔ میں نے پتہ سمجھایا۔ نصف گھنٹے بعد نثار ترابی سوٹ میں ملبوس میری قیام گاہ پر پہنچ گیا۔

نثار ترابی کو دیکھا، ایک وجیہ شکل، خوش لباس، گھنے اسٹائلش بال جو ماتھے کو چوم رہے تھے۔ میرے سامنے کھڑا تھا۔ بغل گیر ہوئے۔ کل کی پھر معذرت کی اور پھر ہم گفتگو میں مصروف ہو گئے ایسا لگا کہ میری نثار ترابی سے برسوں کی شناسائی ہے۔ نثار لمحے بھر میں اس قدر بے تکلف ہو گیا کہ مجھے لگا کہ یہ بندہ تو میرے مزاج کا ہے۔ اس کا بھی حلقۂ احباب بہت وسیع ہے، کراچی میں اس کے دوستوں کی تعداد پنڈی کے احباب کے برابر ہی ہوگی۔ نثار ترابی میں کوئی تصنع نہیں، کوئی بڑھائی نہیں، کوئی شوخی نہیں، سادگی کا پیکر، محبت کا مجسمہ۔

اس پہلی ملاقات کے بعد نثار ترابی ایک طرح سے میرے گھر کا فرد بن گیا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نثار پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہا ہے اور پی ایچ ڈی کراچی یونیورسٹی سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کی لگن، محنت، ہمت اور حوصلہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ نثار پی ایچ ڈی کرلے گا۔ 1999 میں نثار ترابی نے کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرائی۔ اس کے پی ایچ ڈی کا موضوع تھا۔ (اردو غزل کے عصری رویے 1949 تا 1997)

نثار ترابی کا علم بھی وسیع ہے، ماشاءاللہ اسے ہر صنفِ سخن پر عبور ہے، شاعری ہو یا نثر اس کا قلم خوب چلتا ہے۔ نثار ایک بالغ نظر قلم کار ہے۔ فکر میں گہرائی ہے، مشاہدات میں وسعت ہے اور قلم میں طاقت ہے۔ نثار ایک بہت ہردلعزیز استاد بھی ہے، جس جس کالج میں رہا طلبا میں پسندیدہ رہا۔

☆☆☆☆☆

سید معراج جامی

ملنسار شخصیت_ ڈاکٹر نثار ترابی

نثار ترابی ایک ایسی شخصیت ہیں کہ میں برملا جانثار نثار ترابی کہلانا پسند کروں گا۔ نثار اور تراب ایسے دو الفاظ جس شخصیت کا حصہ ہوں اس میں عاجزی، انکساری اور جود وسخا ہونا نام کے اثر کے طور پر جزو لاینفک ہے۔

اکہرا بدن جو گزشتہ چار دہائیوں سے استقامت سے اپنی جگہ قائم ہے۔ یعنی ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے، کشادہ پیشانی اور بائیں سے دائیں طرف لٹکتی ہوئی بالوں کی لٹ جسے عام طور سے تو وہ نظر انداز کیے رہتے ہیں تاہم اشعار پہ داد پاتے ہوئے ان میں انگلیاں پھیر کر اسے اپنی جگہ جماتے ضرور ہیں۔

متوازی ابرو اور ان کے نیچے ہمدرد اور پر تفکر نگاہیں۔ ستواں ناک اور نیچے باریک لب۔ عام طور سے چہرے کا جھکاؤ ایک گونا بائیں جانب رہتا ہے۔

نثار ترابی کی جنم بھومی تو تحصیل جنڈ ضلع اٹک مورگاہ ضلع راولپنڈی ہے مگر ان کا گاؤں "دومیل" ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ گاؤں کا نام "دومیل" ہونے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں ہندو آبادی اور مسلمان آبادی دونوں آپس میں میل جول قائم رکھتے تھے اور میلے بالخصوص میلہ مویشیاں ہوا کرتا تھا جس کی یادگار آج بھی دومیل کی مویشی منڈی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ لہٰذا دومیل ہندو اور مسلم تہذیب کا ملاپ تھا۔

نثار ترابی نے بھی زندگی میں دو ہی میل کیے ہیں۔ ان کا پہلا ملن تو اردو ادب بالخصوص اردو شاعری سے ہو گیا تھا اور جس کا ایک عالم گواہ ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ایک شریف مشرقی شخص بالخصوص بے ضرر شاعر ہونے کے باعث ان کا دوسرا میل نکاح بائدہ و واحدہ و قائمہ ثابت ہوا۔ پھر اس کے بعد ان کی استعداد کسی اور میل ملاپ یا ملن کی خوگر نہ ہو پائی۔ اس کا بیّن ثبوت ان کا آلات جدیدہ اور افکار عالیہ سے بغض کی حد تک اغماض اور پرہیز ہے۔ انہوں نے کئی مرتبہ نہایت رسان اور تاکید مزید کے طور پر یہ بات بتائی کہ انہیں حال ہی میں

علی بن عزیز

یو پی ایس اور یو ایس پی کا فرق معلوم ہوا ہے۔ جب کہ میرے نزدیک یہ بات بجائے خود حیرت انگیز ہے کہ بالآخر یہ فرق بھی معلوم ہوا تو کیسے؟

نثار ترابی میل ملاپ کے تو قائل ہیں البتہ اس میں ای میل کو کوئی دخل نہیں۔ اور اگر کوئی غیر نصابی سرگرمی کی خواہاں ہو تو پھر فی میل کو بھی کوئی دخل نہیں۔ لہذا میری دستیاب معلومات میں جتنی خواتین سے ان کا تعلق خاطر ہے ان میں سے ایک کثیر تعداد منہ بولی بہنوں کی ہے اور باقی بیٹیوں اور بھتیجیوں کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ امتدادِ زمانہ نے منہ بولی بہنوں کی تعداد کو بتدریج کم اور بیٹیوں بھتیجیوں کی تعداد کو زیادہ کر دیا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثریت کا تعلق ترابی صاحب کی اہلیہ اور بیٹیوں سے جلد ہی بن جاتا ہے جو بعد ازاں اپنی زنانہ گفتگو میں آپس میں مل کر انہی کی ذات کو اسی صورت ہدفِ تنقید بناتی ہیں جس طرح سے ہمارے ہاں خواتین اپنے قریبی رشتے کے بارے میں بات چیت کرتی ہیں۔

نثار ترابی نے شعر و ادب میں وہ مقام حاصل کیا جو انہی کا خاصہ ہے اور ایسی ایسی منازل سر کیں جہاں سے اکثریت کا گزر بھی مشکل ہے۔ یوں کہا جائے کہ ادب کے حوالے سے نثار ترابی راستی پہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ تاہم اس راستے کا اثر ایسا شدید ہے کہ انہیں عام طور سے کہیں آنے جانے میں راستے یاد نہیں رہتے۔ اور غالباً شاعرانہ وسعت نظری دورِ حاضر کی رہائشی گھمبیرتا سے لگا نہیں کھاتی۔ ایسے میں مستقل وقت اٹھانا تو شرط ہے تاہم یہ بذاتِ خود اسے بھی ذریعہ افتخار ہی سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر نثار ترابی اپنی عمر کے خاص حصے میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر کہلائے۔ لیکن شروع ہی سے تمام تر مذہبی، فرقہ وارانہ علاقائی اور لسانی تعصبات سے دور ہیں۔ ادب برائے زندگی کے قائل اور اس پہ عامل ہیں۔ چنانچہ ان کا کبھی کسی سے سیاسی یا مذہبی اختلاف سامنے نہیں آیا۔ البتہ اگر کسی نے ان کے سامنے غلط شعر پڑھنے کی کوشش کی یا کسی تحقیقی مقالے میں حوالے کی غلطی کی تو اس وقت ان کا مزاج نقطہ انجماد سے نقطہ تبخیر تک جا پہنچتا ہے۔

انسانی رویوں کا دوغلہ پن، معاشرے میں اپنوں پرایوں کی بے وفائی، جھوٹ، منافقت اور لایعنی کی ہرزہ سرائی انہیں کبھی ایک آنکھ نہ بھائی۔ ایسے کسی بھی قصے کا تذکرہ کرتے ہوئے عموماً ان کے منہ سے تواتر سے ادا ہونے والا جملہ یہ ہوتا ہے

"میں حیران ہوں کہ......"..

اور مجھے اس بات پہ حیرت ہے کہ کوئی شخص ایک ہی نشست میں تواتر کے ساتھ یہ جملہ بھلا کتنی مرتبہ ادا کر سکتا ہے۔

بطور مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ عالم ارواح

سے عالم دنیا میں آنے میں انسان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ کی ذات جس وقت جس جگہ جس خاندان میں جس جوڑے کے ہاں اس کا آنا طے کر دے اسے ویسے ہی آنا پڑتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر نثار ترابی صاحب کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے بارگاہ خداوندی سے اجازت عطا ہوئی ہوتی تو یہ کم از کم آج سے تین صدیاں قبل کا زمانہ اپنے لیے منتخب کرتے۔ اگر کسی کو 21 اکیسویں صدی کے بدن میں اٹھارویں صدی کی روح دیکھنا ہو تو حضرت نثار احمد ترابی سے ملاقات اس کے لیے نہایت نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ادبی میدان کی بات کی جائے تو نثار ترابی ہر اس شخص سے جو کوئی شعر موزوں کر رہا ہو کسی مقالے پہ کام کر رہا ہو کسی کتاب کی تالیف میں مصروف ہو یا کسی ادبی نشست کا اہتمام کر رہا ہو، اس قدر تعاون کرتے ہیں اور اس اہتمام سے کرتے ہیں کہ بعض دفعہ منتظم خود عاجز آ جاتا ہے۔

عام زندگی میں بھی ان کا رویہ مبنی بر خلوص اور عملی امداد باہمی پہ یقین اور اس پر عمل در آمد کے گرد گھومتا ہے۔

عہد جدید میں فیس بک کا بہت غوغا ہے۔ اور یہ وصف یا مرض متعدی ہے۔ بات اگر نثار ترابی صاحب کی کی جائے تو وہ فیس بک سے کوسوں دور بلکہ اس کے ناقد اور بعض اوقات اس سے نالاں بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کا چہرہ مکمل طور پر چاہے کتابی نہ رہا ہو، تاہم زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے اس عالم میں گزارا کہ اصل چہرے کے آگے اصل کتاب رہی ہے۔ کتابیں ان کا زیور ہیں، ان کا سرمایہ ہیں، ان کا فخر اور وظیفۂ زندگی ہیں۔

ان کی اردو شاعری اور تحقیق کی کتابیں اپنی جگہ، پی ایچ ڈی کا تھیسز اور اس کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان کی پنجابی کتاب جس کا عنوان
''اپنی چھاں دا سیک'' ہے
خالصتاً ان کے مزاج کا ن مظہر ہے۔ زندگی کی تلخیاں، ناگواریاں، بے ضابطگیاں، لوگوں کے رویے میں غرض سے پیدا ہونے والا مد و جزر، بے اعتنائیاں اور بے وفائیاں اپنے ٹھنڈے مزاج میں گم کرتے چلے جاتے ہیں چاہے اپنے اندر شعلے جل رہے ہوں۔ اظہار اگر ہوتا ہے تو چند اپنوں کے سامنے ''میں حیران ہوں'' کی تکرار کے ساتھ اور یا پھر اپنے اشعار میں ایک حساس شاعر کی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

آخر میں دعا گو ہوں کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت اور میرے استاد محترم اور برادر م کی عمر دراز ہو اور ان کی مزید ادبی کاوشیں سامنے آ سکیں۔

☆☆☆☆☆

نعتؐ

راہ بر ہر دوسرا بس آپؐ ہیں بس آپؐ ہیں
فخرِ خلقِ انبیاؑ بس آپؐ ہیں بس آپؐ ہیں

آپؐ سے تعبیرِ انساں، آپؐ سے تکمیلِ دیں
رہنمائے حق نما بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

آپؐ آئے کھل اٹھا، گلزارِ ہستی کا سفر
خوشبوئے منزل سرا بس آپؐ ہیں بس آپؐ ہیں

از تا انتہا ملتی نہیں جس کی مثال
وہ عطائے بے بہا بس آپؐ ہیں بس آپؐ ہیں

تا ابد ہم عاصیوں کو ہے سہارا آپؐ کا
حشر تک خیرالوریٰ بس آپؐ ہیں بس آپؐ ہیں

سر بسر جود و سخا کی رفعتوں کا معجزہ
سر بسر صدق و صفا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

شافعِ محشر بھی ہیں اور فخرِ دو عالم بھی ہیں
اور امام الانبیا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

نثار ترابی

غزل

بدل رہی ہے ہَوا سب نشاں بدلتے ہیں
سو ہم بھی تجھ سے دلِ بدگماں بدلتے ہیں

وہاں وہاں سے حقیقت کھلے گی منظر کی
جہاں جہاں سے عدو ترجماں بدلتے ہیں

ہیں جن کے ہاتھ میں کردار کی سبھی ڈوریں
انھیں خبر ہے کہانی کہاں بدلتے ہیں

انھیں سکھایا ہے کس نے ہنر سیاست کا
یہ لوگ کون ہیں کیوں داستاں بدلتے ہیں

بس ایک رستہ ہے خود سے نباہ کرنے کا
یقین رکھتے ہیں لیکن گماں بدلتے ہیں

کوئی تو کارِ ہنر ہم جنوں میں کر جائیں
زمیں بدلتی نہیں آسماں بدلتے ہیں

کسی طرح دلِ خوش خیال راضی ہو
چلو نتیجۂ سود و زیاں بدلتے ہیں

انھیں کو ورثے میں ملتا ہے تاجِ سرداری
جو فیصلوں کی گھڑی میں کماں بدلتے ہیں

''بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی''
ستم پسند ستم کے نشاں بدلتے ہیں

یہ دل نہ دھڑکے تو آتی نہیں صدا کوئی
چھٹیں نہ ابر تو موسم کہاں بدلتے ہیں

روش نثار ترابی یہی ہے بستی میں
کہ دل بدلنے سے پہلے زباں بدلتے ہیں

نثار ترابی

غزلیں

اِک دشت میں غزال نے رَم رَم سخن کیا
خوش رو و خوش خیال نے چھم چھم سخن کیا

اِک جلترنگ سی ہو گئی کمرے کے آس پاس
اِس ڈھب سے اس ادا سے اُسے ہم سخن کیا

پروانے جل مرے اُسے دیکھ دیکھ کر
لَو سے دیے نے شب کو جو پیہم سخن کیا

اِک بات نے کسی کی اداسی بکھیر دی
اِک یاد نے کسی کی سرِ نم سخن کیا

چاروں طرف اُسی کی صدائیں سنائی دیں
حالاں کہ اُس کی آنکھ نے کم کم سخن کیا

لوبان جل اُٹھے ہیں ہواؤں کے باوجود
فرقت کدے میں کس نے یہ پُرنم سخن کیا

شاہِ نجف نے اُس پہ عنایت اتار دی
جب بھی کسی ملنگ نے دَم دَم سخن کیا

گھسیٹتے ہی چلے ہیں حیات، پنچھی واس
گزار دیں گے کہیں پھر بھی رات، پنچھی واس

نہ سر پہ چھت ہے نہ اپنی زمین رکھتے ہیں
ہزار ہا ہیں، نہیں پانچ سات، پنچھی واس

یہ جانتے ہیں خموشی میں ہے بھرم ان کا
کہاں کریں گے کبھی دل کی بات، پنچھی واس

ابھی تو کاٹ رہے ہیں زمیں پہ قیدِ حیات
کریں گے پار بھی یہ پُل صراط، پنچھی واس

میں ان کو دیکھ کے اکثر یہ سوچتا ہوں نثار
غموں سے پائیں گے کیسے نجات، پنچھی واس

نثار ترابی

غزلیں

لب پہ آئے گا سدا حرفِ تمنّا کم کم
خود کو رکھیں گے سرِ بزمِ تماشا کم کم

یہ تو شاہوں کو بھکاری سا بنا دیتی ہے
سو مرے دل! ہو تجھے خواہشِ دنیا کم کم

کارِ درویش میں کچھ کارِ جنوں اور ملا
منزلِ عشق میں رکھتے نہیں سودا کم کم

شاخ سے لپٹے ہوئے پھول مہک اُٹھے ہیں
اُس نے گلشن سے گزرتے ہوئے دیکھا کم کم

اے کلی! تجھ میں تھا کس آنکھ کا جادو پنہاں[1]
جو مرے میر کو بھایا ترا کھلنا کم کم

اپنے خوابوں کو جدا کر لے کہ یوں بھی اکثر
میرے رستوں سے ملا ہے ترا رستا کم کم

اُس کی فطرت ہے جسے اپنا بنا لے اُس پر
پڑنے دیتا ہے کسی اور کا سایا کم کم

---

(1) کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
میر تقی میر

یہ جو آنکھ بستی میں رت جگا مُسافر ہے
خواب تو نہیں لیکن خواب سا مُسافر ہے

آنکھ پُوچھ بیٹھے تو مت اُسے خبر کرنا
اب کے خواب رستے پر دُوسرا مُسافر ہے

چُور چُور بیٹھا ہے، وہ جو تیری چھاؤں میں
اے شجر! خفا مت ہو! دُور کا مُسافر ہے

کوئی موج کیا ٹھہرے ساحلوں کے پہلو میں
وقت کے سمندر میں، ہر صدا مسافر ہے

منزلیں کبھی اس کے ہم قدم نہیں ہوتیں
ساتھ ساتھ چل کے بھی راستا مُسافر ہے

نثار ترابی

غزلیں

نظر اُٹھی ہے جدھر بھی اُدھر تماشا ہے
بشر کے واسطے جیسے بشر تماشا ہے

زمیں ٹھہرتی نہیں اپنے پاؤں کے نیچے
پڑاؤ اپنا ہے جس میں وہ گھر تماشا ہے

نہ بال و پر ہیں میسر نہ اذنِ گویائی
تو اس کے معنی ہیں اپنی سحر تماشا ہے

یہاں قیام کرے گا نہ مستقل کوئی
ذرا سی دیر رُکے گا اگر تماشا ہے

خدائے موسمِ گل! بھید یہ کھلے آخر
ہرا بھرا ہے مگر کیوں شجر تماشا ہے

فگار ہو کے بھی رکھے گا آبروئے نمو
نگاہِ زر میں جو دستِ ہنر تماشا ہے

ملا نثار ترابی سرائے حیرت سے
وہ آئنہ جسے اپنی نظر تماشا ہے

نثار ترابی

گزرتی رُت کی نشانی میں چل کے آیا تھا
یہ زخم اپنی روانی میں چل کے آیا تھا

نظر پڑی تو کسی اور داستاں میں ملا
مَیں جس کے ساتھ کہانی میں چل کے آیا تھا

بہا رہا تھا کوئی پھول خشک دریا میں
وہ ایک شخص جو پانی میں چل کے آیا تھا

نہ کارواں کا نشاں تھا، نہ دشت میں خیمے
وہ شاخ سے بچھڑی جوانی میں چل کے آیا تھا

تلاشِ روح کی محنت بھی رائیگاں ہی گئی
بدن بھی شکل پرانی میں چل کے آیا تھا

اک آئینے کے مقابل تھے آئنے کتنے
سو عکس نقل مکانی میں چل کے آیا تھا

اُسے بھی شب کے فسوں نے جکڑ لیا آخر
حالاں کہ شام سہانی میں چل کے آیا تھا

غزلیں

مرا یقین بھی تیرے گماں سے ملتا ہے
کہ جیسے ٹوٹ کے تارا جہاں سے ملتا ہے

اُسے چناب کی موجیں گلے لگاتی ہیں
گھڑا جو ڈوب کے آبِ رواں سے ملتا ہے

مری نظر کی وراثت سمیٹنے والے
ترے جمال کا نقشہ کہاں سے ملتا ہے

مَیں تجھ کو سوچنے بیٹھوں، اُجڑنے لگتا ہوں
ترے خیال کا موسم خزاں سے ملتا ہے

وہ جس کے نام کہانی کا اِنتساب نہیں
اُسی کا ذکر مری داستاں سے ملتا ہے

مَیں میت ریت کے راول میں سانس لیتا ہُوں
یہ میرا رنگِ رَوانی سواں(1) سے ملتا ہے

اُسے نثار ترابی مَیں کیسے لے کے چلوں
وہ یار مارِ صفِ دُشمناں سے ملتا ہے

نثار ترابی

(1) مورگاہ، راول پنڈی سے گزرنے والا دریا۔

ردائے خواب میں پنہاں شبِ ملال کا غم
سُلگ رہا ہے بجھی آنکھ میں سوال کا غم

بُجھیں گے تار تو روئے گی پچھلی رات کی لے
پڑے گی تھاپ تو جاگے گا تین تال کا غم

اُبھرتے چاند سے شامِ زوال کہنے لگی
تُمھارے دَر پہ رُکے گا کوئی کمال کا غم

بنامِ ہجر ستارے بھی کچھ ہتھیلی پر
ہمارے بھاگ میں لکھو اگر وصال کا غم

ہمارے ساتھ ہیں لشکر میں ایسے تیغ بکف
جو اپنی ہار سے زیادہ کریں گے ڈھال کا غم

ہَوا میں زہر بُجھے تیر سنسناتے ہیں
یہ کیسی رُت ہے شجر کو ہے ڈال ڈال کا غم

وہ جب سے دیکھ کے آیا ہے چڑھتے دریا کو
اُسے ستانے لگا ہے بہت جمال کا غم

اُسے دماغ کہاں، آئنے کی جھلمل کا
کہ اُس کے ذہن میں اُترا ہے خدوخال کا غم

اُتر رہے ہیں گھٹاؤں کے قافلے ہر سُو
سو دستِ کوزہ گراں کو ہے برشگال کا غم

غزلیں

سلگتی رُت ہے، بہت پھڑپھڑا رہے ہیں شجر
کہ دُکھ زمیں کے اکیلے اُٹھا رہے ہیں شجر

ملا وجود کو سائے کا پیرہن اکثر
ہمارے جسم کے اندر سدا رہے ہیں شجر

زمیں کی تہہ میں کئی زلزلے تڑپتے ہیں
بہت دنوں سے ہوا کو بتا رہے ہیں شجر

سُنو سُنو کہ سُریلی ہے بانسری اِن کی
ہیں زخم زخم مگر گنگنا رہے ہیں شجر

انھی کی چھاؤں میں پل کر جواں ہوئی دنیا
کسی بشر سے بھلا کب جدا رہے ہیں شجر

قریب آ کے سُنو اِن کے درد کا نوحہ
گئے دنوں کی کہانی سُنا رہے ہیں شجر

کسی امید کی ڈالی ہری نہیں ہے یہاں
سو شہرِ حبس میں خود کو جلا رہے ہیں شجر

نثار ترابی

یہ کیا فسوں ہے کہ پرچھائیاں بولتی ہیں یہاں
گھروں میں جھانکتی تنہائیاں بولتی ہیں یہاں

فقیہہِ شہر نے فرمان کر دیا جاری
لگاؤ پہرے کہ سچائیاں بولتی ہیں یہاں

تمھیں ہے خوف تو رستہ بدل لو شوق سے تم
یہ راہِ عشق ہے رسوائیاں بولتی ہیں یہاں

ملیں جو دل تو مہکتا ہے خواب کا موسم
کِھلیں جو گُل تو پروائیاں بولتی ہیں یہاں

جو صدق دل سے کبھی پوچھا تو یہ کہا دل نے
شبوں کو ٹوٹے بدن کی انگڑائیاں بولتی ہیں یہاں

بہ فیضِ فکر ہی سوچوں کو اذن ملتا ہے
جہانِ حرف کی شہنائیاں بولتی ہیں یہاں

کلی کلی پہ ہے خوشبو قیام کرتی ہوئی
روش روش پہ چمن آرائیاں بولتی ہیں یہاں

غزلیں

سرابِ دید، حجابِ نظر کے ہوتے ہوئے
وہ بے خبر ہے نظامِ خبر کے ہوتے ہوئے

یہ کس مقام پہ لائی اُڑان کی خواہش
جھلس رہے ہیں پرندے شجر کے ہوتے ہوئے

کُھلا کہ قصرِ تمنا ابھی ادھورا ہے
کہ بے گھری کی اذیت ہے گھر کے ہوتے ہوئے

عجب طلسم میں ڈوبے نگر کے باسی ہیں
سحر کو ڈھونڈ رہے ہیں سحر کے ہوتے ہوئے

کہیں سے قافلہ سالار کیوں نہیں آتا
بھٹک رہے ہیں مسافر ڈگر کے ہوتے ہوئے

یہ کس طرح کا ہے جادہ، یہ سمت کیسی ہے؟
کہ ہے غبار میں منزل، سفر کے ہوتے ہوئے

وہاں نثار ترابی گزر ہے اپنا جہاں
بشر ہیں خوف میں لپٹے بشر کے ہوتے ہوئے

یوں دیکھنے کو جہاں میں کہاں نہیں ہیں ہم
جہاں پہ ہونا تھا ہم کو وہاں نہیں ہیں ہم

کوئی تو ردِ بلا کا بھی اسم ہاتھ آئے
کہ ایک عمر سے منزل نشاں نہیں ہیں ہم

نمو کی کوئی بشارت ملے خدایا ہمیں
سرابِ دشت ہیں آبِ رواں نہیں ہیں ہم

ہے اک فریبِ مسلسل تماشا گاہوں میں
خبر نہیں ہے کہاں ہیں کہاں نہیں ہیں ہم

ہمارے عہد سے روٹھا ہُوا ہے موسمِ گل
خزاں زدہ ہیں پہ ہرگز خزاں نہیں ہیں ہم

ہمارے گھر کے در و بام روز روتے ہیں
شکستہ حال ہیں، پختہ مکاں نہیں ہیں ہم

ہمیں نثار ترابی زمیں سے نسبت ہے
خلا سے اُتری کوئی کہکشاں نہیں ہیں ہم

نثار ترابی

نثار ترابی پر اہلِ قلم کے تاثرات

......توصیف تبسم......

ڈاکٹر نثار ترابی حد درجہ مہذب شخص ہے۔ یہ تہذیبی رشتہ ایک سے زیادہ پہلو رکھتا ہے۔ ادبی حوالے سے نثار ترابی کی پہلی وابستگی اس زمین کی تہذیب وثقافت سے ہے۔ یوں نہ ہوتا تو پنجاب کی مقبول شعری صنف "ماہیے" کو اُردو میں فروغ دینے کی مربوط کوشش نہ کرتا۔ اس کے علاوہ تحقیق کے میدان میں شاہ مراد خانپوری پر اُس کا کام اپنی علاقائی تہذیبی وابستگی کا مظہر ہے۔ میں ذرا اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی کہوں گا کہ اپنے مقالۂ سندِ فضیلت کے لیے آخر اُس نے غزل ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ آپ کا جواب میرے نقطۂ نظر ہی کی تائید کرے گا۔

اچھی شاعری پڑھنا اپنی جگہ لطف کا باعث ہوتا ہے۔ غزل اشعار کا فن ہے، جس میں شاعر اپنی ذات محض دو مصرعوں میں مکمل کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ نثار ترابی غزل کی روایات اور اُس کی فنی شرائط وحدود سے پوری طرح باخبر ہے۔ اگر یہ آگاہ نہ ہوتا تو وہ زمینِ شعر میں نئے ذائقہ کی قلم لگانے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا جو اُس کی غزل کی خصوصیت ہے۔

نثار ترابی کی غزل کا اپنا جداگانہ ذائقہ ہے اور یہ بڑی بات ہے، بل کہ اس کو پڑھ کر اس منزل کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے جس کی سمت اُردو غزل امکانی طور پر سرگرم سفر ہے۔

......انور مسعود......

ماہیا___ رُباعی چار مصرعوں کے قطعہ سے مختصر صنفِ سخن ہے۔ اس لیے اُردو میں اس کی گنجائش اور جواز بہرحال موجود ہے وہ ہے دوہے سے کہیں بڑھ کر۔ اس لیے کہ دوہے پر ہندی کی چھاپ ہمارے تہذیبی مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی۔ اور ___ رُباعی کا عروضی ڈھانچہ اور مخصوص آہنگ اُردو زبان کی فطری موسیقی کو سازگار نہیں۔

اس جواز کی بنیاد پر آج کل تین مصرعوں کی اصناف سخن کا رواج عام ہو رہا ہے لیکن اس میں ایک دشواری یہ آن پڑی ہے کہ اک ضدسی ہے جن میں ہیولا سا ہے کوئی___ کچھ ہائیکو اور ثلاثیاں ماہیے علیحدہ علیحدہ پرچوں پر لکھ کر ملا دیئے جائیں اور ان میں سے کوئی ایک پرچی نکالی جائے تو طے کرنا دشوار ہو جائے گا کہ یہ ہائیکو ہے کہ ثلاثی ہے یا ماہیا۔

میں سمجھتا ہوں "بارات گلابوں کی" میں نثار ترابی نے ماہیے کو اس شناختی گڈمڈ سے نکالنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کی پرچی خالص ماہیے کی تحریر کے اثر سے خود بخود بھنگڑا ڈالنے لگتی ہے اور بڑے پرزور طریقے سے اپنی پہچان کرواتی ہے۔

نثار ترابی نے حسرت کے ماہیے کے چراغ کی لَو کو اونچا کیا ہے اس لیے کہ اس نے باقاعدگی اور پورے خلوص کے ساتھ اس صنف کو اپنایا ہے۔ پہلے مصرعے سے اس نے صرف قافیے کا کام ہی نہیں لیا بلکہ اُسے معنوی ربط وضبط کے دائرے میں رکھنے کی معقول کوشش بھی کی ہے۔

ماہیا محبت میں بھیگا ہوا اور دل میں اُتر جانے والا ایک بول ہے۔ نثار ترابی کا ماہیا ایک سچے اور کھرے پاکستانی مسلمان کی جملہ محبتوں کا ترجمان ہے جس میں لمحۂ موجود کا اضطراب اور تنہائی کا زہر بھی سرایت کیے ہوئے ہے نثار

محترمہ اقل ضیا، جناب محمد یوسف، محترمہ روبینہ شاہین، محترمہ مشرف محشر، جناب نثار ترابی، جناب نیر سرحدی اور جناب سلمان علی

ترابی نے اپنے دل کی کسک اور بجھی کے روپ کو بڑے توازن سے ملا دیا ہے اور اس خوبصورت امتزاج سے وہ انمول بول تخلیق ہوا ہے جسے ماہیا کہا جاتا ہے ایسا لگتا ہے کہ نثار کے دل میں کوئی فراق زدہ کونج کرلانے لگی ہے۔

محسن بھوپالی......

ڈاکٹر نثار ترابی کی ادب کے ترقی پسندانہ نظریے سے شعوری طور پر وابستگی اور تنقیدی شغف کے خوب صورت امتزاج کا ہی ثمر ہے کہ اُن کی غزل فکر وفن کی شائستگی اور زندگی آمیز مثبت قدروں کی آئینہ دار بھی ہے اور آئینہ بردار بھی۔ نثار ترابی نے غزل میں نئے مضامین تراشنے کے علاوہ نئی زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور اس کے لیے اُنھوں نے کوئی شعوری کوشش نہیں کی بل کہ یہ سب کچھ اُن کے مخصوص طرزِ فکر کی عطا ہے۔ وہ شعر برائے شعر کہنے کے قائل نہیں ہیں بل کہ اپنے تجربے اور جذبے کو احساس کی سطح پر پرکھنے کے بعد شعر کہتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں لہجے کا تنوع اور مصرعوں کی تراش قابلِ دید بھی ہے اور لائق داد بھی۔

محسن احسان......

ڈاکٹر نثار ترابی زندگی کی عمیق اتھاہ میں اُتر کر اُس کے نشیب وفراز اور اُس کے کیف وکم سے لذت اندوز ہونے اور اپنے قارئین کو اُس سے فیض یاب کروانے کا سلیقہ اور قرینہ جانتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے ساتھ براہ راست حقیقت پسندانہ رشتہ اُستوار کر رکھا ہے وہ فضا میں آنکھیں بند کر کے سانس نہیں لیتے بل کہ اردو گرد رونما ہونے والے واقعات و حادثات کا لمحہ بہ لمحہ جائزہ لیتے ہیں۔ اُس کی صداقتوں، مسلمات اور تضادات پر نظر رکھتے ہیں اور حیات وکائنات کے مسائل کو تنظیمِ فکر کا مرکزی نقطہ بنا کر شاعری کرتے ہیں۔ وہ شائستگی اور تہذیب کے امانت دار کی حیثیت سے غزل کی کلاسیکی روایات سے وابستہ ہیں اور زبان و بیان کے نئے نئے تجربات کے بھی قائل ہیں۔ وہ معاشرے میں روز بروز بڑھتی ہوئی منفی قدروں پر بھی دُکھ کا اظہار کرتے ہیں اور انفرادی واجتماعی زندگی کے مشاہدے سے بھی تڑپ اُٹھتے ہیں۔ یہی پُرخلوص بے باکی اُن کے فن کو نکھار عطا کرتی ہے۔

ریاض مجید......

شاعری، تدریسی پرکھ، پڑچول تے ریڈیو، سٹیج تے ٹیلی ویژن دی میزبانی...... ایہہ سبھے اچیچے فکری تے فنی حوالے نیں جنہڑے ڈاکٹر نثار ترابی دے سونے تے سلکھنے ادبی علمی سفر

دا اعتماز بن کے عالمی پدھر تے اپنے ہوون دا ثبوت رکھدے نیں۔ ایس پنجابی شعری پراگے توں پہلاں اوہناں دے دو اُردو شعری مجموعے چھپ کے سنجیدہ ادبی حلقیاں وچ بڑی سلاہنا حاصل کر چکے نیں۔

نویں نسل دے ایس مہان شاعر جے اک سے اپنی معیاری شاعری تے اپنی مسلسل علمی، ادبی ریاضت پاروں ڈھیر ساری شہرت حاصل کیتی اے تے دوجے پاسے اک سچا فنکار ہوون پاروں اوہناں نیں اپنی ماں بولی نوں وی اپنے منوں نہ وسار یا تے اوہنوں وی اپنے شعری اظہار دا ذریعہ بنا کے اوہدی خدمت دا حق ادا کیتا اے۔

......امجد اسلام امجد

نثار ترابی کے اردو ماہیوں پر مشتمل کتاب ”بارات گلابوں کی“ نہ صرف اس مخصوص صنف کے حوالے سے ایک خوبصورت اور تخلیقی امکانات سے پُر مجموعہ ہے بلکہ اس میں شاعر کا تخلیقی جوہر اُن تمام فنی محاسن اور استعدادِ شعری کی بھرپور تا کے ساتھ سامنے آیا ہے جو نوجوان شعرا کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ نثار ترابی کے ان ماہیوں میں جہاں پنجاب کے کلچر، تہذیب اور پنجابی رہتل کی خوشبو ہے وہاں اس میں اُردو کا جو ذخیرہ الفاظ استعمال کیا گیا ہے اُن کی نغمگی، شعریت اور پنجابی مزاج سے قربت بھی ایسی خوبیاں ہیں جنھوں نے اس کتاب کے مجموعی تاثر کو ابھارنے اور بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُردو زبان کے شعر و ادب میں دیگر پاکستانی زبانوں کی اصناف اور پیرائیوں کے اشتراک کا یہ عمل خوش آئندہ ہی نہیں وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ سو، یہ ماہیے میرے نزدیک نثار ترابی کی ذاتی واردات کا خوبصورت اظہار تو ہی ہیں، ان میں موجود یہ تہذیبی اشتراک کی فضا ایک ایسا انسانی وصف ہے جس کے لیے وہ علیحدہ سے تعریف اور شاباش کے مستحق ہیں۔

......رشید امجد

ڈاکٹر نثار ترابی شاعر، نقاد اور محقق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ”اُردو غزل کے عصری رویے“ ان کا تحقیقی کام ہے۔ انھوں نے جس وقتِ نظر سے اُردو غزل کے عصری رویّوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ قابلِ توجہ ہے۔ مواد جمع کرنے میں ان کی محنت کی داد دینا پڑتی ہے اور پھر اس مواد کا انھوں نے جس تحقیقی اور تنقیدی شعور سے جائزہ لیا ہے وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی خود ایک اچھے شاعر ہیں اس لیے موضوع کی مناسبت سے ان کا طریقہ کار بہت عمدہ ہے۔ انھوں نے نہ صرف عصری غزل کے مختلف رویّوں کی نشان دہی کی ہے بلکہ ان کا فکری اور فنی جائزہ بھی لیا ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی نے عصری رویّوں کی نشان دہی کرتے ہوئے مختلف ادوار اور اُن ادوار کے سیاسی حالات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ غزل کے رجحان ساز رویّوں کے پہلو بہ پہلو اہم شعراء کے فنی و فکری طریقہ کار کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ معاصر غزل کے رویّوں کے ساتھ ساتھ ایک فکری مطالعہ بھی ہے جس میں تحقیق و تنقیدی لوازمات کے معیار کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ عصری غزل کو فکری و فنی دونوں سطحوں پر سمجھنے کے لیے یہ تحقیقی کام ایک اہم دستاویز ہے۔

......صابر ظفر

نثار ترابی نے اپنے لفظوں، استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں کی کے تکراری استعمال کی یکسانیت سے گریز کر کے فکر اور جذبے کو ترجیح دی ہے۔ مزید یہ کہ بلند آہنگی کے بجائے نرل اور کومل طرزِ اظہار کو اپنایا ہے جس سے ایک غنائی لہجے نے جنم لیا ہے۔

جناب انور جمال فاروقی، جناب محمد شیراز، جناب ظہور احمد، جناب افضل خان، جناب نثار ترابی، جناب محمد لیٰسین بھٹی
جناب یعقوب نظامی، محترمہ غزل انصاری، جناب نسیم انصاری اور دیگر اہلِ قلم

سید اختر امام رضوی......

نثار ترابی بیسویں صدی کے آواخر میں اپنے لوک وجدان کی ایک ایسی گونج لے کر اُبھرا ہے جس میں دھرتی اور آسمان کے درمیان اُٹھنے والی ہر قدرتی آواز کا پیکر موجود ہے کیونکہ اس نے اپنے تخلیقی عمل کے دوران میں نہ تو اپنے پاؤں زمین سے بچھڑنے دیئے ہیں اور نہ سر پہ چھائے ہوئے آسمان کو کہیں کھسکنے دیا ہے۔ اور یہ بات اس کی فنی مہارت عمیق مشاہدے اور لوک وسیلوں سے مضبوط رابطے پر گواہ ہے۔

نثار ترابی ایک جدید غزل گو بھی ہیں، جس کی شاعری خارج سے ہر منظر بھی اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو ایک حساس شاعر کے در دل میں ہلچل مچا کر اُسے کرب پر مجبور کر سکتی ہے

جانِ جگر ڈاکٹر نثار ترابی سے اظہارِ محبت

نسیم سحر......

کثیر الجہات قلمکار، ادب کی تقریباً ہر صنف میں تخلیقی و تنقیدی اسلوب رکھنے والے بہت پیارے دوست ڈاکٹر نثار ترابی سے میری گہری دوستی اب کوئی نصف صدی کا قصہ ہے۔ انھوں نے میرے بارے میں کئی مضامین تحریر کیے اور مجھے بھی اُن کی ہمہ جہت شخصیت کے بے شمار پہلوؤں پر تھوڑا بہت لکھنے کا اعزاز ملتا رہا، مگر اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے بارے میں لکھا تو سہی، مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ان کی شخصیت منافقت سے یکسر مبرّا ہے، اور اس کا ایک اہم ترین پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جس منفرد اسلوبیانہ انداز میں لکھتے ہیں، مائک پر زبانی اظہارِ خیال بھی اسی باکمال انداز میں کرتے ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

ڈاکٹر نثار ترابی کی اس کتاب میں شمولیت کے لیے مجھے مختصر اظہارِ خیال کے لیے کہا گیا ہے جبکہ میرے لیے یہ اظہارِ محبت بلاشبہ اقرارِ محبت کے برابر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیتیں ادب کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کے دوسرے شعبوں تک بھی پھیلی ہوئی ہیں جو سب ایک طویل اور جامع مضمون کی متقاضی ہیں، چنانچہ یہ مختصر اظہاریہ کسی طور ان کی ہمہ جہت شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وقت کی کمی اور کتاب کی اشاعت کے آخری مراحل میں داخل ہونے کے سبب یہ چند ٹوٹے پھوٹے ہوئے الفاظ کو صرف میری حاضری سمجھا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں یونہی اضافہ فرماتے رہیں۔

نجیب جمال......

ڈاکٹر نثار ترابی نہ صرف اُردو اور پنجابی کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں بلکہ وہ اردو شاعری کی کلاسیکی اور جدید روایت کا پختہ شعور بھی رکھتے ہیں۔ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیق کے میدان

جناب ماجد ریاض خان، جناب راشد محمود، جناب نثار ترابی، جناب امجد طفیل، جناب ریاض احمد، جناب آغا قیصر عباس اور جناب آفتاب خان

میں بھی اپنی ایک الگ قابلِ قدر حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ معلم بھی ہیں۔ دانشور بھی اور اردو ادب کے سماجی مورخ بھی۔ وہ شعروادب کے ہر زمانے کی تاریخ، تہذیب اور سماجیات کا شعور رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ اردو شاعری کے بلند و پست سے شناسائی رکھتے ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے بھی ان کی کاوشیں شاعری کے معیار کو بلند کرنے کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں فکری سنجیدگی کی حامل ہیں۔ ہمہ خیال اور شعور ان کی تحریروں کا خاصا ہے وہ روایت کے ساتھ ساتھ ہر دور کے بدلتے تقاضوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

حسن نثار......

کالم نگاری میری شاعری کو زندہ نگل گئی اور اب تو کسی کے یاد دلانے پر بھی یاد نہیں آتا کہ میں کبھی شاعر تھا سو جب مجھے نثار ترابی کی شاعری کے نمونے دکھا کر ”ہر صدا مسافر ہے“ کا فلیپ لکھنے کے لیے کہا گیا تو میں نے کہا ”بھائی! شاعری پر کسی شاعر سے لکھواؤ“ تب مجھے میرے شعر سنائے گئے تو ”او کھے سو کھے“ میں نے اپنے آدھے ہم نام نثار ترابی کی شاعری پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ میں نام بدل کر خود اپنے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ چونکا دینے و الی شاعری ہے اور ایسی شاعری کو نظر لگنے کا امکان ہوتا ہے۔ میں نثار ترابی کی شاعری کو نظر بد سے بچنے کی دعا دیتے ہوئے پیشگوئی کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں روایت پسندی جدیدیت اور شعریت سے لبالب شاعری کے خالق نثار ترابی کا شمار ان میں ہوگا جن پر خود شاعری فخر کرتی ہے۔

(2004)

رفیع الدین راز......

نثار ترابی کوئی ایسا نام نہیں جسے ہم سرسری طور پر سوچیں اور گزر جائیں۔ اس عہد کے معروف اور جدید طرزِ فکر رکھنے والے شعراء میں یہ نام ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنا رشتہ روایت سے بھی نہیں توڑا اور عہدِ حاضر کے تقاضوں سے بھی کامیابی سے جڑے ہوئے ہیں۔

محمد امجد عابد......

نثار ترابی (پ_1961ء) کا شمار ہمارے عہد کے ان توانا فکری شعرا اور ناقدینِ ادب میں ہوتا ہے جن کے ہاں جمالیات کا عنصر پورے وفور کے ساتھ ان کی تخلیقات کے بین السطور جھلکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں شاعری سے رومانوی رویوں اُن کی تلاش اور ان کے ماحصل سے تخلیقی سطح پہ حظ اندوزی کا رجحان غالب ہے۔ دنیا اور اس کے مظاہر کو ایک شاعر کی نظر سے دیکھنا اور عصرِ نو کے خواب آگہیں ماحول میں

شعر پیش کرنا ان کے فن کی ایک خاص جہت ہے۔ اس حوالے سے ان کے شعری مجموعے ''ہر صدا مسافر'' (2004) کی غزلیں میرے موقف کی تائید کرتی ہیں۔
بطور نقاد ان کی تصانیف مراد خانپوری'' حیات و فن''، ''فکرِ فیض''، تحقیقی و تخلیقی زاویے'' اور ''اردو غزل کے عصری رویے'' اب ''فتح محمد ملک کی تنقید نگاری'' ان کے تنقیدی کام کی اہمیت و افادیت کو سامنے لاتی ہیں۔ ان کے ہاں تنقید میں توازن کا عنصر نمایاں ہے وہ اپنے گہرے مطالعے سے کسی بھی فن پارے کے بنیادی طرز احساس کو پہچانتے اور اس کو جدید ادبی رویوں کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔
ماہنامہ اخبار اردو (اسلام آباد) میں حال ہی میں ان کا ایک تنقیدی مضمون بہ عنوان ''پاکستان میں اردو تنقید کے پچھتر سال'' شائع ہوا، میں تنقید کے تصور کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھتے ہیں:
تخلیق کا درجہ کوئی بھی ہو اس کی جانچ پرکھ پر مشتمل فنی و فکری پیمانوں کو بروئے کار لائے بغیر اس کی تحسین، تشریح اور قدر بندی کا فریضہ انجام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ جمالیات کی وہ شاخ جو فنونِ لطیفہ کی حامل تخلیقات میں حسن اور حسن پسندی کے امتیازات کا فسوں سامنے والی ہے پسند و ناپسند میں حدِ فاصل قائم کرتی ہے، کسی تخلیق کو ادب کے عمومی مفہوم سے بلند کر کے ادب پارے کو مرتبہ عالی پر فائز کرتی ہے، ''تنقید'' کہلاتی ہے۔''
نثار ترابی جب کسی شاعر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں تو اس کے علمی و فکری زاویوں اور اسلوبی پیش کش کی بخوبی وضاحت کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے عہد میں دیگر شعرا کے بالمقابل اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔

...... اظہار اللہ اظہار

ڈاکٹر نثار ترابی کو عام شعرا میں شمار کرنا یقیناً انتقادی بے حسی کی دلیل ہوگی۔
موصوف کا شعری سفر عہد کی ریاضتوں سے گزر کر اس قدر ہمہ جہت، فراواں اور درخشاں ہو گیا ہے جو عالمی انسان کی فکری ہمہ گیریت کو اپنی سانسوں میں بسا کر قاری سے مکالمہ کا آسان راستہ پیدا کرتا ہے اور ہر مشکل، پیچیدہ اور گنجلک موضوع کو نہ صرف سہل اور قابل فہم بناتا ہے بلکہ رومان کے ایک نئی کہکشاں میں قاری کو لے جاتا ہے۔
زیادہ گہرائی اور تفصیل میں جانے سے قطع نظر، ڈاکٹر نثار ترابی صاحب کے شعری محاکات اور تمثال گری کو بھی اگر یکجا کیا جائے تو ان کے عہد مضطرب کا بے اطمینان خاکہ آنکھوں کے سامنے متحرک ہو جاتا ہے دوسری جانب اس لازوال روحانی کرب سے بھی آشنائی ہوتی ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری نامکمل بلکہ بے معنی محسوس ہوتی ہے
ڈاکٹر صاحب کی نظم و نثر میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے لیکن وہ یہ قرینہ جانتے ہیں کہ غزل کس طرح بنی چاہیے اور نظم کی مانگ کو کس طرح بھرنا ہے۔

...... تسنیم کوثر

ڈاکٹر نثار ترابی کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں، وہ معلم و محقق ہیں، شاعر و ادیب ہیں اور ان سب کے ساتھ ساتھ وہ رواداری اور محبت کی نادر مثال ہیں۔ شعر و سخن ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، وہ غزل

اور نظم دونوں پہ عبور رکھتے ہیں البتہ غزل ان کا معتبر حوالہ ہے۔ان کی غزلیں انفرادیت کی حامل ہیں انہوں نے حمد، نعت اور سلام بھی کہے ہیں ان کا لہجہ دبنگ ہے اور ادائیگی کا انداز بھی خوب ہے۔ادبی تقریبات میں ان کی شرکت سے محفل کا رنگ دونا ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر نثار ترابی پاکستان اور پاکستان سے باہر بھی کئی ممالک میں مشاعرے پڑھ چکے ہیں وہ جہاں بھی گئے ہیں انہیں توقیر و منزلت نصیب ہوئی ہے۔انکساری ان کی طبیعت کا خاصا ہے ان کے لہجے کی نرمی اور ان کے مزاج کی حلیمی انہیں ہر دلعزیز بنائے ہوئے ہے۔وہ ایک حساس اور درد مند دل رکھتے ہیں اپنے پرائے سبھی کے دکھ درد سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ڈاکٹر نثار ترابی دوستوں کے دوست ہیں، وہ دوستوں کے دوستوں سے بھی رابطے میں رہتے ہیں گزشتہ دنوں زندگی کچھ گردش میں رہی بڑی بہو نے سنگین بیماری جھیلی، اور رخصت ہو گئی، ڈاکٹر نثار ترابی وقتاً فوقتاً فون کر کے خیریت دریافت کرتے رہے، زخموں پہ مرہم رکھنا ہر اک کے بس کا روگ نہیں ڈاکٹر نثار ترابی ایک بے لوث شخصیت ہیں ان میں وہ خو بو نہیں ہے جو اکثر بڑوں کی فطرت ہوتی ہے جن کی گردن کا اکڑاؤ انہیں کسی دوسری سمت دیکھنے ہی نہیں دیتا اور وہ اپنی نرگسیت سے ہی نہیں نکلتے۔ڈاکٹر نثار ترابی ادب نواز شخصیت ہیں ان کی طبیعت کی عجز و انکساری نے انہیں مقبول بنایا ہوا ہے رب عظیم کی بنائی ہوئی اس بوقلموں دنیا میں ، زندگانی کے اس سفر میں یوں تو بہت سے لوگ ملتے ہیں مگر یاد صرف وہی رہتے ہیں جو اپنا بنانے کا فن جانتے ہیں اور ڈاکٹر نثار ترابی انہی لوگوں میں سے ہیں۔

...... **ڈاکٹر محمد یوسف** ......

عزت مآب جناب نثار ترابی صاحب اکیسویں صدی میں اردو کی نئی چنی، توانا اور معتبر آوازوں میں ایک منفرد اور بے باک آواز ہیں۔نقد و نظر میں ایک ثقہ نقاد، جن کی رائے ہمیشہ نپی تلی اور بے لاگ ہوتی۔ تحقیق و جستجو کے بحر بے پایاں کے وہ "سا پکا" شناور جو اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر وہ گوہر آبدار ڈھونڈ کر لاتے ہیں جن تک اچھے اچھوں کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

تخلیق کے ایسے چلبلے فنکار جن کی تخلیقی جوہر کا خمیر شعلہ و شبنم کا حیران کن آمیختہ ہے۔ان کی فنکارانہ اپج اگر ایک طرف شمیم جاں فزا ہے تو دوسری طرف قلب و نظر کے لیے حشر سامانیوں بھری دھنک ہے، جس کا ہر رنگ حساس طبیعتوں پر وجد وکیف اور از خود رفتگی طاری کرتا ہے۔

بطور انسان ، نثار ترابی صاحب مجسم محبت ہیں۔ان کی تو بتو شخصیت کا ہر جلوہ، جلوہ محبت ہے۔ترابی صاحب کی شخصیت میں جھوٹی انا، گھمنڈ اور تکبر نام کو بھی نہیں ہے۔...

...... **سلمان علی** ......

جس دور میں ہم رہ رہے ہیں یہ مادیت پرستی کا دور ہے جس میں اقدار بتدریج ختم ہو رہی ہیں اور بحیثیت مجموعی ہمارا معاشرہ زبوں حالی اور تنزل کی طرف تیز رفتاری سے گامزن ہے اس زبوں حالی اور تنزل کی راہ میں اگر کہیں کوئی رفتار شکن صورت سامنے آتی ہے تو وہ یقیناً ہمارے معاشرے کے وہ کردار اور اشخاص ہو سکتے ہیں جو اپنی تہذیب رکھ رکھاو محبت و مروت اور روحانی اقدار سے تنزل اور زبوں حالی کی رفتار کے سامنے ایک آہنی بند کی مانند سامنے آتے ہیں غنیمت ہے

جناب شبیر آکاش، جناب نذر عابد، جناب ناصر بشیر، جناب نثار ترابی، جناب نعمان منظور، جناب عادل سعید قریشی
جناب قمر زمان راجہ اور جناب قدیر اقبال

کہ ایسی ہستیاں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں نثار ترابی کا شمار اس دور کی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جو سرتاپا محبت اور خلوص کے پیکر ہیں علمی وادبی مسائل میں ہمہ وقت طلبا کے لیے مستعد زندگی کے جھمیلوں میں گرفتار یار دوستوں کے لیے تن من دھن لیے بے قرار، شعروشاعری اور موسیقی کا ایسا نکھرا ذوق کہ دوست احباب ان کی صحبت میں زمان ومکان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں باوجود ان تمام صفات کے سب سے بڑی بات یہ کہ انکساری اور معصومیت کی ایسی لہریں ان کی شخصیت کا احاطہ کیے ہوئے ہیں کہ غیر موجودگی میں بھی ان کی خوشگوار موجودگی کا احساس ہوتا ہے میرے خیال میں یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ کسی انسان کی غیر موجودگی میں نہ صرف ان کی کمی محسوس کی جائے بلکہ اچھے لفظوں میں ان کا ذکر بھی کیا جائے مختار مسعود نے کیا سچے کی بات کی ہے کہ قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بھی کچھ اصول ہوں گے یا یہ لگتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے جاتے ہیں------ '' اس دور پر فتن میں نثار ترابی جیسی شخصیات کا وجود کسی بھی طرح انعام سے کم نہیں۔

آفتاب خان......

ڈاکٹر نثار ترابی جیسی ہمہ جہت اور گوناگوں خوبیوں کی حامل شخصیت فی زمانہ خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ شعرو ادب سے دیوانگی کی حد تک محبت کرنا ان کے خمیر میں شامل ہے چنانچہ وہ دن رات ادبی تحقیقی سرگرمیوں میں دل وجان سے مگن رہتے ہیں۔ شعر ہو یا نثر وہ یکساں مہارت سے حروف قرطاس پر اتارتے ہیں۔ ان کی غزل میں نہ صرف عصری رجحانات کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے بل کہ جمالیات کے پہلو بہ پہلو وہ جدید طرز سخن میں بھی اپنا ایک جداگانہ اسلوب رکھتے ہیں۔ ان کی ایک غزل سے دو اشعار دیکھیں:

اک دشت میں غزال نے رم رم سخن کیا
خوش رو خوش خیال نے چھم چھم سخن کیا
پروانے جل مرے ہیں اُسے دیکھ دیکھ کر
لَو سے دیے نے شب کو جو پیہم سخن کیا

....

ان کی شاعری اور نثر میں بہتے دریا کی سی روانی اور غنچوں کے چٹخنے جیسی کوملتا محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ حرف اور الفاظ کے رشتوں سے بخوبی آشنائی رکھتے ہوئے جملے کی ساخت میں انھیں لفظوں کا چناؤ کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے قریبی اور گویا ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسی جملہ سازی وہی ادیب کر سکتا ہے جس کے پاس ڈھیر سارا ذخیرۂ الفاظ موجود ہو۔

یہ فیضِ نور ہے، بخشش کا اک خزینہ ہے

فرزند علی ہاشمی......

راول دیس کی ادبی روایت اب کے دبستان کا روپ

دھار رہی ہے جہاں شعر و ادب کا مزاج چوکھا اور جدا ہے۔ اس کے ادبی معیارات اور امتیازات تشنگانِ علم و ادب پر پوری آب و تاب کے ساتھ واضح ہو رہے ہیں۔ دبستانِ راولپنڈی کی راہ ہموار کرنے میں نثار ترابی ایسے جید تخلیق کاروں کا کردار اپنے اپنے عہد میں تاباں و فروزاں رہا ہے جو اپنی مٹی سے ہر دم جڑے رہنے کی بہر طور سعی کرتے رہے ہیں۔ یہی لوگ اپنی مٹی کے مزاج سے آشنا ہوتے ہیں۔ ان کے مصارع، ان کی اپنی دھرتی، ثقافت اور روایات سے وابستگی کے شاہد ہوتے ہیں۔ نثار ترابی دنیائے شعر و ادب پر پہلے پہل نثار احمد نثار کے نام سے ابھرے۔ ازاں بعد مٹی سے محبت اور ابوتراب سے نسبت کے باوصف نثار ترابی ہو گئے۔ ان کی ذات مٹی کے خصائص سے مزین ہے۔ عجز و انکسار ہے حلاوت اور ایک عجب حلیمی اور شیرینی ہے۔ لہجہ نرم و ملائم ہے۔ ان کے مصرع مٹی کی مہک سے لبریز ہیں۔ ان کا کلام معطر و مطہر ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے باب العلم سے اکتساب کیا ہے دنیا جہاں کے سبھی علوم کا گزر اسی چوکھٹ سے ہوتا ہے۔ نثار ترابی نے اس چوکھٹ پر سر رکھا اور دہلیز کو بوسہ دیا ہے۔ بوتراب کی نسبت سے ترابی ہونے کی منظوری بارگاہ رسالت سے ہوتی ہے۔ منظوری ہو جائے تو اطوار بدل کر رہ جاتے ہیں۔ تخلیق کے ضمن میں زندہ رہنے والے جملے اور مصرعے عطا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ برصغیر کے ممتاز شاعر اسد جعفری نے ڈاکٹر نثار ترابی کے باب میں کہا تھا:

یہ بات باعثِ اعزاز ہے تمہارے لیے
غلامِ پنج تنِ پاک ہو، ترابی ہو

.......بسمینہ سراج

ڈاکٹر نثار ترابی کی طبیعت اور مزاج کو اخلاص کے ساتھ ساتھ کڑی محنت اور ریاضت کے ساتھ گوندھا گیا ہے۔ اس لیے رک جانا، ٹھہر کر وقفہ کر لینا یا ایک ہی راستے اور ڈگر پر قدم بڑھانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مشاہدے کی ایک بھرپور قوت عطا فرمائی ہے۔ وہ ایک بہترین تنقیدی نگاہ رکھتے ہیں، جس نے ان کے تنقیدی شعور کو بیدار کر رکھا ہے۔ چوں کہ وہ خود ایک تخلیق کار ہیں اس لیے ان کا معیارِ نقد الگ اور منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ناقدانہ صلاحیتوں کا حامل بھی ہے۔ ایک تنقید نگار اگر خود تخلیق کرنے والا بھی ہو تو وہ جانتا ہے کہ کوئی ادیب اور شاعر دورانِ تخلیق کن کن مراحل کا سامنا کرتے ہوئے ایک تخلیقی سرمائے کو وجود بخشتا ہے۔ لہٰذا اسے ناقد کا تبصرہ، تجزیہ، تاثر اور رائے معتبر تصور کی جائے گی۔ ڈاکٹر نثار ترابی "تحقیقی و تخلیقی زاویے" میں ایک ایسے ہی نقاد بن کر ابھرے ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر نثار ترابی نے اپنی ان نثری کاوشوں کو نقد و نظر کے اعتبار سے تخلیقی و تاثراتی تنقید کے زمرے میں رکھا ہے، مگر ناقص رائے یہ تحریر کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ بحیثیت نقاد ڈاکٹر نثار ترابی اپنے ان 27 مضامین میں ایک منفرد تنقیدی انداز کے حامل نظر آتے ہیں۔

جون 2017 کی ایک مہربان دوپہر

.......حماد ریاض

استاد ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر صدر شعبہ اردو (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد) کے دفتر کے باہر میں اپنی باری کا منتظر تھا کہ مجھے اپنے ایم فل کے نگران کا علم ہو سکے۔

ساحر صاحب نے ڈاکٹر نثار ترابی کا نام مجھے لکھوا دیا۔

چند روز بعد مجھے استاد ڈاکٹر نثار ترابی سے پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور خدا کا شکر ادا کیا

کہ ایسی شفیق، علم دوست، اور ادب پرور شخصیت کی سرپرستی میسر آئی۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ سینئر سکالرز کی زبانی نگرانوں کے سکالرز کو ذلیل اور زچ کرنے کے واقعات سن رکھے تھے لہٰذا یک گونہ دل میں اندیشہ بھی تھا کہ:

"یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے۔"

لیکن آئندہ ملاقاتوں میں اندیشہ زائل ہو گیا۔ انھوں نے جلد ہی میرا رابطہ بیاض کے روحِ رواں جناب نعمان منظور سے کروا دیا اور ان دو مہربان شخصیات کے تعاون سے میں نے "ماہنامہ بیاض کی علمی و ادبی خدمات (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)" کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ مکمل کیا۔

ڈاکٹر نثار ترابی استاد الاساتذہ ہیں اور میں ان کا ادنیٰ سا طالب علم!

جہاں ان کے علم و فن پر اردو کے مستند نقاد، دانشور، اور ادیب خامہ فرسائی کر چکے ہیں وہیں عہدِ رواں کے جدید سکالرز ان کی ادبی جہتوں کا مختلف زاویوں سے تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں۔

ان کی علمی قد و قامت میری لفظ گری سے کہیں بالاتر ہے مگر میں استاد کے ہمراہ طے کیے گئے علمی و ادبی سفر کے محسوسات احاطہ تحریر میں لانا ضروری خیال کرتا ہوں۔

اگرچہ دنیائے اردو کے تمام ادبی حلقوں میں ترابی صاحب کی شعری و نثری تخلیقات کا ڈنکا بجتا ہے۔ مگر حال ہی میں ان کی دو تحقیقی و تنقیدی کتب "تحقیقی و تنقیدی زاویے" اور "اردو غزل کے عصری رویے" نے ادب کے ناقدین اور سکالرز کو خصوصی طور پر متوجہ کیا ہے۔

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دو کتب کے مطالعے سے ایک نو آموز سکالرز علمی اور تنقیدی عبارت تحریر کرنا سیکھ جاتا ہے۔ ایسے پر مغز اور بھرپور جملے اور عبارات ہیں کہ قاری کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔

......نعمان منظور

جس درخت سے جتنے زیادہ پھل ہاتھ لگنے کی اُمید ہوتی ہے، اُس پر پتھر بھی اتنے ہی برستے ہیں۔ یہی منظرنامہ ڈاکٹر نثار ترابی کا ہے۔ اپنی کتابوں پر حروفِ اعتبار لکھوانے والوں کا ایک انبوہ کثیر ہے۔ سینئرز بھی اور نئے لکھنے والے بھی، ان کے گرد جمع رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چار دہائیوں سے شعری حلقوں میں مقبول ڈاکٹر نثار ترابی کا حلقہ احباب نہایت وسیع ہے۔

یورپ، برطانیہ اور خلیج کا شاید ہی کوئی شہر ہو جہاں انھوں نے اپنے شعری مقبولیت کے جھنڈے نہ گاڑے ہوں۔ پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں سے وابستہ ہیں اور زیادہ وقت سفر میں گزارتے ہی یا پڑھتے لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر نثار ترابی ہرفن مولا ہیں مگر ان کا ہر فن ادھورا نہیں یہ ایک ذمہ دار قلم کار ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی، پوٹھوہاری زبان میں شاعری بھی ان کا خاصا ہے۔ ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے ملی نغمہ لکھنے پر پہلا ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کے لاتعداد پروگراموں کی نظامت بھی کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بات لکھنا بھی ضروری ہے ڈاکٹر نثار ترابی مکمل تحقیق، جستجو اور دلیل کے ساتھ بات کہنے کے عادی ہیں۔ انھیں وہی تحریر پسند آتی ہے جو حقیقت پسندانہ اور استدلال کے ساتھ ہو، ان کی اپنی تحریریں بھی بڑی فکر انگیز ہوتی ہیں اس لیے کہ ان میں ان کا خونِ جگر بھی شامل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی ایک ایسے عالم فن ہیں جو شعر اور نثر کی صداقت پر اعتبار کرتے ہیں، اُسے ترازو میں تولتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نظرے وخوش گزرے

نیطشے کے بارے میں بجا طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ فلسفیوں میں شاعر ہے اور شاعروں میں فلسفی اس لیے کہ وہ فلسفہ فلسفیوں، کانٹ، ہیوم، بارکلے، رسل کی طرح نہیں لکھتا شاعرانہ زبان میں لکھتا ہے۔ یوں وہ ہائنے کے بعد ہائنے کی ٹکر کا جرمن زبان کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ نیطشے کا یہ اعلان God is dead ہر اردو ادیب نے پڑھ اور سن رکھا ہے، اور اس پر حاشیہ آرائی بھی کی ہے اور بزعم خویش نیطشے شناسی کا مدعی بھی خود کو ثابت کرنا چاہا ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ نیطشے نے کس سیاق و سباق میں مرگ خدا کا اعلان کیا ہے اور کیوں کیا ہے۔ خدا سے اس کی مراد کون خدا ہے؟ اس نے ساری بات یوں کی ہے۔

''کیا تم نے اس پاگل آدمی کے بارے میں سنا ہے جو دن چڑھے چراغ لیے بازار کی طرف بھاگا اور مسلسل چلانا شروع کر دیا: میں خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں، میں خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں...... خدا کہاں ہے؟ وہ چلایا۔ میں تمھیں بتاؤں گا۔ ہم نے اُسے مار ڈالا ہے، تم نے اور میں نے مل کر۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کام کیسے کر لیا؟ سارے افق کو پونچھنے کے لیے ہمیں صافی (Sponje) کس نے دی؟ خدا مر گیا۔ (God is dead) وہ مرا رہے گا اور ہم نے ہی اسے مارا ہے۔ اس سے بڑا کارنامہ کبھی نہیں ہوا اور جو کوئی بھی ہمارے بعد دنیا میں آئے گا، اس کارنامے کی وجہ سے برتر تاریخ سے تعلق رکھنے والا ہوگا اب تک کی تاریخ کے مقابلے میں۔''*

ان سطور میں نیطشے کا پیغام یہ ہے کہ خدا کی موت درحقیقت خدا پر ایمان کی موت ہے۔ اس خدا پر ایمان کی موت جو غیر معلوم زمانے سے لوگوں کا خدا چلا آ رہا ہے۔ یہ ایمان لوگوں کے اعمال و افعال اور کردار پر اثر انداز رہا ہے۔ اب ایسا نہیں۔ ان کے اعمال، کردار اور رویوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی کا خدا ایمان نہیں رہا۔ خدا پر ایمان رکھنے والوں کا زندگی کے بارے میں رویہ اور تھا اور آج کے لوگوں کا رویہ اور ہے۔ آج کے لوگ خدا پرست نہیں منافق ہیں

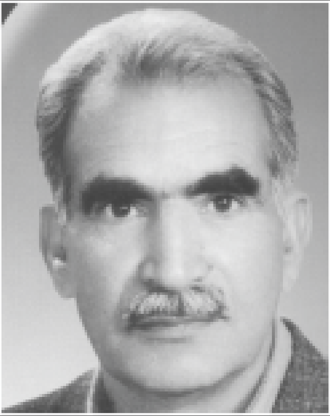

محمد ارشاد

* Gay Science

لیکن اپنی منافقت کا علی اعلان اقرار نہیں کرتے۔* یہ نہیں کہتے کہ ہم خدا کو نہیں مانتے۔ نطشے کو اس بات سے یعنی اس سوال سے غرض نہیں کہ خدا ہے یا نہیں یہ سوال اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ جس خدا کی بات کر رہا ہے Judeo-Christion God ہے:

"The belief in the Christion God is unbelievable"

ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس نے کوئی اور خدا متصور کر رکھا ہے۔

نطشے نے جس پاگل آدمی کا ذکر بطور تمثیل کیا ہے وہ ایک حقیقی کردار ہے لیکن ایسا نہیں جیسا نطشے نے اسے پیش کیا ہے۔ یہ پاگل آدمی (madman) یونانی فلسفی دیوجانس کلبی ہے جس کا ذکر مولانا رومی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

....

(کل شیخ چراغ لیے شہر کے گرد چکر لگا رہا تھا کہ پالتو اور وحشی جانوروں کے ہاتھوں ملول ہوں۔ انسان کی تلاش ہے۔ میں نے کہا کہ ہم نے بہت ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نہیں پائے گا۔ کہا وہ جو کہیں نہیں مل پائے گا اسی کو تو ڈھونڈ رہا ہوں)

رومی کے ان اشعار کو اقبال نے بھی اپنی مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی میں نقل کیا ہے۔ رومی اس سے انسان تلاش کروا رہے ہیں اور نطشے خدا۔ نطشے نے اسے Madman کہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا ہے کہ وہ abnormal آدمی تھا۔

دیوجانس کلبی نے اپنی ساری زندگی اپنے تابوت میں رہ کر گزاری یہی تابوت اس کا گھر بھی تھا۔ ایک بار ایک تیرانداز پر نظر پڑی، تابوت سے اٹھا اور دوڑ کر ہدف کے آگے جا کھڑا ہو گیا۔ تیرانداز نے کہا کہ دیکھتے نہیں کہ میں تیراندازی کر رہا ہوں اور آپ ہدف کے ساتھ لگ کر آن کھڑے ہو گئے۔ دیوجانس نے کہا کہ میں بڑی دیر سے تمھیں تیر چلاتے دیکھ رہا تھا لیکن کوئی ایک بھی تیر ہدف پر لگتا نہیں دیکھا مجھے محفوظ ترین جگہ یہی نظر آئی سو یہیں آن کھڑا ہوا۔ سکندر نے اس کا شہرہ سنا تو ملاقات کو جا پہنچا۔ سردیوں کے دن تھے۔ دیوجانس اپنے تابوت میں لیٹا دھوپ تاپ رہا تھا۔ سکندر اس رخ سے کھڑا ہوا کہ اس کا سایہ دھوپ کو روک رہا تھا۔ سکندر نے نیازمندی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کوئی حاجت ہو تو بتائیں ابھی پوری کر دی جائے گی۔ دیوجانس نے کہا کہ تم نے دھوپ کو مجھ تک پہنچنے سے روک رکھا ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ دیوجانس خوشبو پاؤں کی انگلیوں میں لگایا کرتا تھا اور وجہ یہ بتاتا کہ نتھنوں کا رخ پاؤں کی جانب

---

* یہی کچھ آج کل مسلم دنیا میں ہو رہا ہے اور باقی دنیا میں بھی۔

ہے او پاؤں کی انگلیاں خوشبو کے لیے
مناسب ترین جگہ ہیں۔
ہے دیوانہ ولیکن بات کرتا ہے ٹھکانے کی
نطشے بھی اپنے دور کا دیوجانس کلبی تھا۔ آخری چار پانچ سال جذب و جنوں کی حالت میں گزرے۔ کتابوں کا ذکر ہوا تو کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ کچھ کتابیں میں نے بھی لکھی ہیں۔ یہ کہہ کر پھر از خود رفتگی کے عالم میں چلا گیا۔ اقبال نے اسے مجذوب فرنگی کہا تو کچھ غلط نہیں کہا:
اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

....

لیکن اقبال نے اپنی اور نطشے کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا۔ نطشے وہ فلسفی ہے جس نے فلسفے کی پوری تاریخ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ سقراط کی موت کو خودکشی قرار دیا۔ افلاطون نے سقراط کو بچ نکلنے کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ زندگی اتنی قیمتی شے ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں جب بچ سکتی ہو نہ بچانا خودکشی ہے۔ یہی نہیں نطشے کے نزدیک سقراط مجرمانہ ذہن کا مالک تھا اپنے چہرے مہرے سے بھی۔ اس کے غیر یونانی خدوخال اور بھدی صورت دیکھ کر ایک قیافہ شناس نے اس سے کہا تم مجھے جرائم پیشہ لگتے ہو تو سقراط نے کہا آپ نے ٹھیک پہچانا۔ وہ جرم کیا ہے؟ فلسفہ قبل از سقراط کائنات و حیات کے بارے میں تفتیش تھا۔ سقراط نے اسے اخلاقیات کی پٹری پر ڈال دیا۔ سائنٹیفک attitude کو Moral attitude سے بدل دیا۔ نطشے ابھی طالب ہی تھا کہ اس کے پروفیسروں نے یہ کہہ دیا کہ ہم سے زیادہ لسانیات جانتا ہے۔ چنانچہ بائیس سال کی عمر میں ہی فل پروفیسر شپ کی پوسٹ پر اس کا تعین ہوا
Precocity اس حد تک تھی کہ جب عالم ہوش تھا تو مغرب کے اقتصادی نظام کو پیش نظر رکھتے ہوئے عالمی جنگوں کی پیش گوئی کر دی۔ اقبال خوش قسمت تھے کہ مجذوب فرنگی ان کے زمانے میں بلکہ اقبال اس کے زمانے میں نہیں ہوئے۔ ورنہ خدا تو کیا، خودی کا نام تک نہ لیتے۔ وہ نہ infinito ego کا قائل نہ Finite ago کا۔ وہ ego کو fable
اور Fiction play on words
کہتا ہے اور میں (I) سہولت بیان ہے اور بس۔ اقبال اختیار کے قائل اور نطشے کے نزدیک اختیار جلاد کا قانون تاکہ پادری جسے چاہیں صلیب پر لٹکا سکیں۔ وہ نسل پرستی کا سب بڑا مخالف تھا لیکن اس کی نسل پرست بہن الزبیتھ نطشے جو نازیوں اور ہٹلر کی سب سے بڑی مؤید تھی اسے نسل پرست کے پر میں پیش کیا، ایک بھیانک دیوتا کے روپ میں۔ نطشے اور اقبال کے فلسفے میں اگر کوئی ہم آہنگی ہے تو نسل پرستی کے خلاف۔ نطشے نسل پرستی کے اس حد تک خلاف ہے کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تباہی کو اپنے ہم قوم جرمن Knights کا عیسائی ہونے کے سبب سب سے بڑا جرم قرار دیتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا اور اسلام کا اتنا بڑا مداح ہے کہ وہ یونانی اور رومی تہذیب و

تمدن کو ہیچ اور بے قدر و قیمت ٹھہراتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام مردانہ اخلاقیات کا درس دیتا ہے اور عیسائیت مردوں میں زنانہ پن پیدا کرتی ہے۔

Christianity robbed us of the harvest of the ancient world, later went to rob us of the harvest of culture of Islam. the wonderful Moorish cultural world of spain more closely related to us at Bottom, speaking more directly to our senses and taste than greece and Rome was trampled down (-I do not know what kind of feet-) why because it was noble, because it owed its origin to manly instints, because it said Yes to life even in the rare and exquisite treasures of Moorish life... Later on, the Crusaders fought agaist something they would have done better to lie down in the dust before _ a culture compared with which even our nineteenth century may think itself. very impowerished and very' late;- They wanted booty, to be prejusiced! the crusades_ higher pirocy that is all! the German knighthood the viking knighthood at bottam was there in its element....

معلوم نہیں علم و ادب کا کس قدر بے مثال ذخیرہ سپین میں اور اس کے بعد صلیبیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا- بعد ازاں منگولوں کے ہاتھوں- اس میں کچھ قصور مسلمانوں کا بھی تھا- غرناطہ کے آخری حکمران ابو عبداللہ (Boabdil) نے مسیحی حملہ آوروں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے بزدلی دکھائی- جب اسے ہسپانیہ بدر کیا جا رہا تھا تو رو رہا تھا- اس کی ماں نے یہ تاریخی الفاظ کہے: مردوں کی طرح دشمنوں کا مقابلہ نہیں کیا اب عورتوں کی طرح رو پیٹ رہے ہو- شرم کرو ابو عبداللہ شرم کرو-

بات یہ ہے کہ پورا ہسپانیہ طوائف الملوکی کا

شکار تھا۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے حکمران تھے وہ بھی غیر متحد۔ عیسائیوں نے ایک ایک کر کے سب کو شکست دی۔ صرف غرناطہ رہ گیا تھا جہاں کا آخری حکمران ابوعبداللہ تھا۔ بہادر ماں کا بزدل بیٹا۔ حملہ آوروں نے یہی نہیں کیا کتب خانوں کو بھی آگ لگا دی۔ عربی شعروادب کا بہت بڑا ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ اس کے باوصف اٹلی اور سسلی کے حکمران فریڈرک ثانی نے جسے بیٹشے نے First Eurapean according to my taste کہا عربی شعروادب کا معتدبہ ذخیرہ بچائے رکھا۔ فریڈرک عربی زبان، مادری زبان کی طرح بولتا تھا۔ اس کے دربار اور حرم میں بھی عرب خواتین موجود تھیں۔ ول ڈیورانٹ نے لکھا ہے کہ اسے نو زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ پوپ کے خلاف اس کی لڑائیاں تاریخ کا حصہ ہیں۔ میتھیو پیرس نے اسے منافق کہا ہے یعنی اندر سے مسلمان تھا اور بظاہر عیسائی۔ عربی شاعری میں اسی دور میں دو نئی اصناف وجود میں آئیں زجل اور موشح جن سے ایشیائی عربی شاعری نابلد ہے۔ زجل سات سات مصرعوں پر مشتمل نظم تھی اور موشح بھی۔ لبنان کے محمد غنیمی ہلال نے الادب المقارن (The Comparative study of literature) میں ان کی مثالیں بھی نقل کی ہیں اور ساتھ اطالوی تراجم بھی نقل کیے ہیں مغرب میں سات مصرعوں کو چودہ کر دیا گیا اور اس کا نام Sonnet رکھا۔* محمد غنیمی لال کے علاوہ محمد شوقی ضیف نے ہسپانوی عربی شاعری پر بھی بہت کام کیا جو الگ مضمون کا متقاضی ہے۔ انھی Sonnets میں ایک سانیٹ Drayton کا بھی ہے۔

Since ther's no help, come let us kiss and part, Nay I have done, you get no more of me:

جسے پڑھ کر ساحر لدھیانوی نے:

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

لکھی اور داد پائی۔ یاد رہے کہ قدیم یونانی اور لاطینی شاعری بلینک ورس تھی، قوافی کا استعمال جو ہمیں انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں نظر آتا ہے عربوں کی دین ہے۔ اہل مغرب نے صرف شاعری میں عربی شاعری سے استفادہ نہیں کیا بلکہ موضوعات و مضامین بھی اپنائے۔ مسلمانوں میں معراج کا واقعہ ہر کسی کو معلوم ہے دانتے (Dante) کو کی ڈوائن کمیڈی کو سپین کے محقق Asin Y Placois نے اپنی کتاب Islam and Divine Comedy رسول اللہ کے واقعہ معراج کی بھونڈی نقل قرار دیا۔ دانتے

* معلوم نہیں یہ صنف ہسپانوی عرب شعرا کی اختراع ہے یا وہاں کے عیسائی شعرا کی کہ عربی شعرا کا بہت سا کام ضائع ہو چکا ہے۔

(1265-1321) کے اپنے زمانے میں عربی علم وادب کے تراجم شروع ہو چکے تھے بلکہ سوسال پہلے سے۔ مترجمین کی پوری ایک کھیپ وجود میں آ چکی تھی جنھیں عربی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ ہو سکتا ہے آزاد منش شاعر ابوالعلا معری کا رسالتہ الغفران بھی دانتے کی نظر سے گزرا ہو، جس میں ابوالعلا معری نے بھی عالم بالا کی سیر کا ذکر کیا ہے۔ مارگریٹ سمتھ نے اپنی کتاب Moslem Mystics میں اسلامی تصوف کے عیسوی تصوف پر اثرات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ استاذ الاستاذی پروفیسر ایم ایم شریف نے اپنی کتاب Muslim Thouth of its Achievement میں دیکارت کی Discourse on method کو تقابلی جائزے کے بعد غزالی کی المنقذ مین الضلال کی نقل ثابت کیا ہے۔ ایم اے میں میرے دور کے نصاب میں ایک پرچہ نفسیات مذہب کا بھی تھا، جس میں دیگر کتابوں کے علاوہ ایک کتاب پروفیسر Thouless کی سائیکالوجی آف ریلیجن بھی شامل تھی، جس کے پہلے ایڈیشن میں پروفیسر مذکور نے دعویٰ کیا کہ غزالی نے دیکارٹ سے چوری کی ہے لیکن جب پتہ چلا کہ غزالی تو دیکارٹ سے پانچ صدیاں پہلے گزرے ہیں تو دوسرے ایڈیشن میں کہا کہ دونوں آزادانہ طور پر ایک ہی نتائج تک پہنچے ہیں۔ پہلے سرقہ اور اب توارد۔ اہل مغرب دانتے کے سرقہ کو سرقہ نہیں جانتے۔ مشہور و معروف شعر شناس ٹی ایس ایلیٹ نے منہ سے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے کہ اپنا منہ قابلِ دید بنا دیا ہے۔

Dante and Shakespears divide the world between: them, there is nothird.

پوری دنیا کے بجائے پورا مغرب لکھا ہوتا تو بات بھی بنتی۔ شیکسپیئر کے بارے میں تو خود انگلستان کے محققین میں پانچ دہائیاں پہلے یہ بحث گرم رہی ہے کہ اس سے منسوب ڈرامے اور شاعری اسی کا مال ہے یا کرسٹوفر مارلو کا۔ تاریخی اعتبار سے شیکسپیئر ایک مجہول شخصیت تھا۔ اس کے سوانح دس جملوں میں بھی بیان نہیں کیے۔ حقیقت کچھ بھی ہو اس بحث میں دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب وہاں آباد برصغیر کے مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک نے کہا کہ شیکسپیئر کا اصل نام شیخ زبیر تھا جو کئی نسلوں سے وہ آباد بزرگوں کا چشم و چراغ تھا۔ تعصب کی وجہ سے مجہول رہا اور وہاں کے انگریز اس کے سوانح حیات سے ناواقف ٹھہرے۔ دوسرے کو اور دور کی سوجھی، کہا وہ شیخ تھا پھر پیر بن گیا۔ اس کے نام کی اصل ''شیخ سے پیر'' ہے بحث کا اختتام برصغیر کی عام کہانیوں کی طرح یہ ہوا کہ سارے وہنسی خوشی رہنے لگے۔'' شیکسپیئر کے ساتھ ٹریجڈی کامیڈی میں بدل گئی۔

عربی علوم وفنون اور شعروادب کا بہت بڑا حصہ مغربی زبانوں میں منتقل ہو چکا تھا اور دانتے

اس سے آگاہ تھا، جبھی تو وہ ڈوائن کامیڈی میں بوعلی سینا اور ابن رشد کا ذکر یونانی فلسفیوں کے ساتھ کرتا ہے اور انھیں اعراف (Purcatery میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

(Canto IV Circle I : The great Pagans pp 54)

And raising my a little I saw on high
Aristotl, the master of those who know ringed by the great souls of phisophy
All wait uone him for their honor and his I saw socrates and plato at his side before all others there Democratis

اس کے بعد دیوجانس، ثالیس (Thales) انکسا غورس، زینو، ایمڈورکیس آرفیوس، ٹلی، لائینس، سینیکا، اقلیدس، بطلیموس، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا اور ابن رشد کا ذکر کرتا ہے۔

Euclid the geometer and ptolmy
Hippoerates, Galen,
Avicenna And
Averhoes of Great Commentry.

مقام اعراف (Purgatory) میں انھیں دکھانے کے بعد Hell کا ذکر کرتا ہے۔ اس Conto کی آخری دو لائنیں یہ ہیں:

and trembling air of I pass from light into the kingdom of eternal night.

اور جہنم میں جا کر دانتے کی دریدہ دہنی اپنی مثال آپ بن جاتی ہے۔ اس نے محمد مصطفےٰ اور علی مرتضےٰ کو جس حال میں دکھایا اسے نقل کرتے ہوئے قلم بھی لرزتا ہے۔ لیکن نقل کفر کفر نہ باشد

see how Mahomet's mangled and split split open!
Ahead of me walks Ali in trars, his head cleft from the top-Knot to the chin. (In for no Canto XXVIII circler 8 pp-236)

پروفیسر شوکت واسطی نے ڈوائن کامیڈی کا ترجمہ طربیہ خداوندی کے نام سے کیا ہے جو میری نظر سے گزرا۔ پروفیسر شوکت واسطی تاریخ کے پروفیسر تھے، شاعر بھی تھے اور ادب پرور بھی، معلوم نہیں دانتے کی ہرزہ گوئی کا انھوں نے کیا ترجمہ کیا ہو گا۔ مسلمان حضرت عیسیٰ کی اہانت کا سوچ بھی نہیں سکتے حتیٰ کہ عیسائیوں کے Saints کا ذکر بھی ادب و احترام کے ساتھ کرتے

ہیں۔ کسی بھی دین، مذہب اور فرقے کے زعما کے خلاف ہرزہ گوئی اخلاقی پستی اور گراوٹ کا ثبوت ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اپنے واحد انگریزی میں لکھے گئے مضمون میں کہا کہ انھوں نے محمدؐ کے نام پاک کو (نامناسب لفظ) بجتے پڑھا ہے۔ وہ Mehomet کی املا کو بھی نام کا بگاڑ سمجھتے تھے حالانکہ ایسا نہیں۔ جس دور میں ایسا ہوا عثمانی ترکوں کے یورپ پر تسلط اور وسیع فتوحات کا زمانہ تھا۔ بحیرہ روم میں کسی یورپی ملک کو جہاز تو کیا کشتی ڈالنے کی جرأت نہیں تھی۔ کلیساؤں میں ترکوں سے پناہ مانگنے کی دعائیں مانگی جاتی تھیں برطانیہ نسبتاً محفوظ ملک تھا وہاں ترکزم (اسلام) اور ترک پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خوف آوری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ترکوں کے ووکل گلینڈ جس نہج پر ڈویلپ ہوئے ہیں وہ محمد کو Mehomet ہی بول سکتے ہیں۔ خود ہمارا یہ حال ہے کہ ہم 'ح' کو 'ہ' بولتے ہیں۔ ذ، ز، ظ اور ض کی آواز میں فرق نہیں کر سکتے۔

رحمان (Rahman) کو Rehman بولتے ہیں، محمدؐ کو مہمد۔ محمدؐ کا نام پاک (نامناسب لفظ) ضرور بنا ہے، اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو شیکسپیئر کے ڈرامے Twelveth Night ہیں۔ یوں یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی میں ٹی ایس ایلیٹ کے الفاظ کے مفہوم کے مطابق

Dante and Shakespeare divide the world; there is no third.

ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن، ہرزہ سرائی ڈوائن کامیڈی کا نمایاں ترین سین ہے، اس وقت سے جب ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اور اولاد آدم کو گمراہ کرنے کی مہلت مانگی جو اسے مل گئی تھی۔ ڈوائن کامیڈی کیا ہے؟ بزبان عبدالحمید عدم:

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہو گا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

☆☆☆☆☆

(نوٹ:) نظر سے خوش گزرے، اور کیاب نامہ چند ماہ پہلے لکھ لیا تھا۔ بھجوانے کی نوبت نہیں آئی۔ جون کا بیاض زیادہ ثروتمند لگا۔ کسی نے چند سال پہلے یہ نقطہ اٹھایا تھا کہ کیوں 'بیاض' کا وہ معیار نہیں جو 'فنون' اور 'اوراق' کا ہوا کرتا تھا۔ اعجاز رضوی نے شافی جواب دیا کہ وہ لکھنے والے ابھی تو نہیں رہے۔ ہم وہی چھاپتے ہیں جو موصول ہوتا ہے اسی ضمن میں اب عربی کا شعر بے محل یاد آیا:

اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ
وَکُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ مَا فِیْہِ

یعنی: از کوزہ ہمی تراود کہ در اوست
برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔

....

رباعی میری محبوب ترین صنفِ سخن ہے۔ گلزار بخاری کا دم غنیمت ہے جو ایک مدت سے اسے بحال رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اب انھیں کیا ہو گیا ہے کہ فارسی کی تین انتہائی معروف رباعیوں کا ترجمہ کر ڈالا اور نہیں بتایا کہ یہ ترجمہ ہے۔ کوئی اور ہوتا تو سرقہ کا الزام لگاتا۔

میں روز ازل سے ہوں الستی یا رب
ابریق ہے مرا شکستی ربی
منکر نہیں تیری مری ہستی یا رب
برمن در عیش را ہستی ربی
مٹی میں ملائے مرے اسباب حیات
برخاک تگندی مے گلگونِ مرا
خاکم بدہن کیا کہیں یارب
خاکم بدہن مگر تو مستی ربی
(عمر خیام)

اک فاحشہ میں شیخ نے دیکھی مستی
شیخ بزن فاحشہ گفتا مستی
بولا کہ جنوں خیز ہے تیری ہستی
ہر لحظہ بدام دیگراں پا بستی
عورت نے کہا جو ہوں نظر آتی ہوں
زن گفت من آنکہ می نمایم ہستم
کیا آپ کی ہستی بھی ہے ایسی ہستی
تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی
(عمر خیام)

حد چاہے خطا میں نہیں چھوڑی باز آ
باز آ باز آ ، ہر آنچہ ہستی باز آ
عصیاں کی طرف زندگی موڑی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
رحمت کا یہ در در نہیں مایوسی کا
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
سو بار بھی توبہ جو ہو توڑی باز آ
صدبار اگر توبہ شکستی باز آ
(منسوب بہ ابوسعید ابوالخیر) باز آ (لوٹ آ)

فارسی میں باز آ کے معنی لوٹ آ، واپس آ کے ہیں جبکہ اردو میں یہ الفاظ ان معنوں میں مستعمل نہیں۔ جلیل مانک پوری یا جلال لکھنوی میں سے کسی ایک کا شعر ہے:

بعد یک عمر بھی جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

شاعری میں مصرع کہنا اصل کام نہیں، پیش مصرع کہنا اصل کام ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

مصرع برجستہ باید گو پس از ماہے رسد

طالب آملی کا شعر ہے:

زعارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

....

پہلے مصرع کے بارے میں کہا گیا ہے کہ برائے ایں شش ماہ فکر کردہ و پیش مصرع رسانده۔ صائب تبریزی غنی کشمیری سے ملنے کشمیر گیا۔ غنی گھر میں موجود نہیں تھا۔ دروازہ کھلا تھا، اندر بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے فکرِ سخن کرنے لگا۔ کاغذ کے ایک پرزے پر یہ مصرع لکھا۔ پیش مصرع بن نہیں پا رہا تھا:

کہ از لبِ تو بوئے کباب می آید

غنی آیا، مصرع پڑھا تو یہ مصرع بطور پیش مصرع لکھ کر شعر پورا کر دیا:

کدام سوختہ جاں دست زد بہ دامانت
کہ از لباسِ تو بوئے کباب می آید

....

گلزار بخاری آج کے شاعروں میں میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ اپنا مجموعہ کلام "ہوا پتے سرائے گی" انھوں نے مجھے بھی بھجوایا تھا۔ جس برجستگی سے وہ شعر کہتے ہیں بہت کم شاعران کے مقابل ٹھہر سکتے ہیں:

خود سے ہی رہی لڑائی میری
قائم رہے کیا اکائی میری

....

اس غزل کا ہر شعر بطور مثال نقل کیے جانے کے قابل ہے۔ یہی حال دیگر غزلوں کا ہے۔
میں یہ بات انھیں خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ دل میں کچھ زباں پر کچھ اور، منافقت ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

☆☆☆☆☆

بت خانوں کے پروہت اور اُن کی رسمیں

سنگ تراش خدا تخلیق کرنے والے ہو گئے۔

خداؤں کے اس کاروبار نے ان کی معیشت کو سہارا دیا۔ کاروبار کیسا بھی ہو، نفع تو حاصل ہوتا ہے۔ مگر جب خداؤں کے اوپر ہر استھان پہ ایک ایک پروہت بیٹھ گیا تو پھر ان پروہتوں نے باقی سب لوگوں کو یرغمال بنا لیا۔

نئی نئی کہانیاں بنا کے رائج کر دیں۔

مقصد ایک ہی تھا۔

لوگوں کا مال،

ان کے مویشی، زر، عورت اور زمین زیادہ سے زیادہ مندر کے نام پہ نذرانے میں چڑھائی جائے۔

مذہبی راہنما پروہت کی اجارہ داری رہے۔

لوگ دُور دراز کے ملکوں کا سفر کر کے ریشم، مصالحے، سونا اور چاندی لاتے۔ پروہت مندر کی دہلیز پہ بیٹھا بیٹھا، اپنے تیروں کے الٹ پلٹ سے ان سب سے زیادہ حصہ سمیٹ لیتا۔

اکثر پروہت موٹے موٹے تندیل ہو گئے تھے۔

ہولے ہولے عجیب عجیب سی رسمیں اس معاشرے میں جڑ پکڑ گئیں۔

چونکہ اس معاشرے میں اونٹ، اونٹنیاں اور بھیڑ بکریاں ہی اصل رائج الوقت کرنسی تھی۔ اس لیے ان رسموں کا رُخ انہیں کی طرف تھا۔ عرب کا اپنا کوئی سکہ نہیں تھا۔ قریب دو بڑی سلطنتیں تھیں۔

ایران کا تانبے کا درہم یہاں بھی چلتا تھا۔

روم اور ایران کے سونے کی دینار کی یہاں بھی بہت قدر تھی۔

ایک دینار میں کوئی پچاس ہزار درہم مل جاتے تھے۔

مگر مقامی کاروبار سارا اونٹ بھیڑ بکریوں کی گنتی سے چلتا تھا۔

یوں بتوں کا پیٹ پالنے کے لیے پروہتوں نے لوگوں کے حلق سے ان کے نوالے چھیننے شروع کر دیے۔ اونٹ اونٹنیاں صرف کھانے اور دودھ دینے کے لیے ہی نہیں تھیں۔

وہ اس سماج کی پوری ٹرانسپورٹ تھی۔

یہ واحد سواری تھی جو لوگوں کو عرب کے ریگزاروں میں لیے پھرتی تھی۔ پروہتوں نے ان اونٹ اور اونٹنیوں کے لیے تین چار مقدس نام گھڑ لیے۔

اُن کے گروہوں میں معزز وہ عورت سمجھی جاتی جس نے زیادہ بچے جنم دیے ہوں۔ بچے اس کی عزت کرتے اُس کے لیے مال و اسباب لاتے۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اُس عورت اور اُس

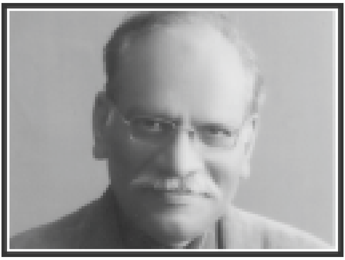

ابدال بیلا

عورت کے مرد کو باعث عزت سمجھتے۔ اس پیمانے سے انھوں نے اونٹوں اور اونٹنیوں کے لیے آبرومندی کی تاویل تخلیق کرلی۔

دس بچے جنم دینے والی اونٹنی عرب سماج میں بڑا اونچا مقام رکھتی تھی۔

پروہتوں نے فتویٰ جاری کر دیا یہ مقدس اونٹنی ہے یہ دس بچے جنم دے چکی ہے، اب اس پہ کوئی سواری نہ کرے۔ اِسے مندر کے نام پہ آزاد کردو۔ تاکہ صرف پروہت اس کے دودھ سے لطف اندوز ہوسکیں۔ پروہتوں نے اُن اونٹنیوں کو چرانے کے لیے کہاں جانا تھا وہ تو سارا دن مندر کی دُکان پہ بیٹھا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ قانون بھی بنا دیا کہ یہ مقدس اونٹنی جہاں چاہے پھرے، چرے کوئی اُسے منع نہیں کرسکتا۔

انھوں نے ایسی اونٹنی کا خاص نام بھی رکھ دیا۔

''بحیرہ''۔

بحیرہ سے نسبتاً کم درجے کی بھی اونٹنیاں ہوتی تھیں۔

یہ وہ اونٹنیاں تھیں، جنھوں نے دس بچے جننے کا سکور پورا نہیں کیا ہوتا تھا، کم عمر ہوتی تھیں۔ مگر ان کے مالکوں نے کسی نذر نیاز میں انھیں کسی پسندیدہ خدا کے مندر کے لیے وقف کر دیا ہوتا۔ ان پہ مال اسباب نہ رکھا جاتا۔ یہ بھی جہاں مرضی چرتی تھیں کوئی منع نہ کرتا۔

انھیں ''سائبہ'' کہا جاتا۔

کوئی اونٹ اگر ایسی شرطیں پوری کر دیتا تو وہ ''سائبہ'' کہلاتا۔

وہ اونٹ جس کا اپنا بچہ جفتی کے قابل ہو جاتا تو بھی پروہتوں کی نظر میں آ جاتا۔ وہ کہتے بس، بہت ہوگیا۔ اب اس کی پشت سے دس نر بچے ہو چکے ہیں اِسے آزاد کردو۔ جدھر چاہے چرے، پیئے، جفتی کرے۔

یہ ''حام'' ہوگیا ہے

اُس کا نام مقدس حام رکھ دیا۔

بھیڑوں کو بھی اونٹوں کی طرح مقدس بننے کے عمل سے پیچھے نہ رکھا گیا۔ جو بھیڑ سات مرتبہ دو مادہ بچے جنے اور آٹھویں بار ایک نر بچہ، تو وہ مقدس ہوگئی۔ اُس کا نام الگ دے دیا گیا۔

''وصیلہ''۔

اُسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جاؤ جدھر مرضی چرو پیو۔

اُس کا دودھ بہر حال صرف مرد پی سکتے تھے۔

پروہتوں کی اس حکومت نے اونٹ اور بھیڑوں کی طرح فصلوں اور زمینوں پہ بھی مندروں کے خداؤں کی اجارہ داری قائم کردی۔ کہنے کو وہ اپنی زمینوں میں ایک حصہ اللہ کا بھی رکھتے۔ کیونکہ اللہ کے گھر کے متولی ہونے کے ناطے انھیں اللہ کے نام سے بھی شرم آتی تھی۔ اللہ کا صرف ایک حصہ رکھتے۔ جبکہ اپنے من گھڑت خداؤں کے حصے ایک سے زیادہ۔ کبھی نہیں جب جی چاہتا اللہ کے نام کا حصہ کاٹ کے بتوں کے نام پہ چڑھاوا چڑھا دیتے۔ مگر بتوں کا حصہ کاٹ کے بھی اللہ کے نام پہ خرچ کرنے کی انھیں توفیق نہ ہوتی۔ ہولے ہولے مندروں کے آس پاس کئی چراگاہیں ایسی ہوگئیں جن میں عوام الناس کے اونٹ، اونٹنیاں یا بھیڑیں نہیں چرائیں جاسکتی

تھیں۔ صرف مندروں کے نام پہ چھوڑے ہوئے جانوروں کی وہ جگہ ہوتی۔

ان بت کدوں میں عجیب وغریب رسمیں ادا کی جاتی۔ کہیں آگ مسلسل جل رہی ہے۔ اس کی پوجا ہو رہی ہے۔ کچھ پروہتوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ ان کے قبضے میں جنات ہیں۔ وہ ان سے مشورہ کر کے آنے والے وقت کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔

سورج، چاند، ستارے اور انوکھی شکل کے درختوں کی تو عام پوجا تھی۔

بنو اسماعیلؑ کے بارے میں کہا جاتا ہے، وہ عام طور پہ ان مندروں سے زیادہ وابستہ نہیں ہوئے۔ انہیں اپنے آبا کے بنائے اللہ کے گھر سے پیار تھا۔ مگر چونکہ انہیں بھی تجارت کی غرض سے ملک در ملک پھرنا پڑتا تھا تو مکہ سے جاتے ہوئے بنو اسماعیلؑ کے لوگ عقیدت کے طور پہ خانہ خدا کی دیوار کا کوئی ٹوٹا ہوا پتھر قمیض کی جیب میں ڈال کے چلے جاتے۔ سفر میں جہاں فروکش ہوتے، وہیں جیب سے پتھر نکال کے زمین پہ رکھتے اور اُس کا طواف شروع کر دیتے۔

دھیرے دھیرے پھر یہ امتیاز بھی ختم ہو گیا۔ جہاں کہیں کوئی خوش شکل پتھر نظر آیا اس پہ گھومنے لگے۔ یہاں تک کہا جاتا کہ جب کوئی خوش کن پتھر نہ ملتا تو مٹی کی ڈھیری بنا کے اس پہ بکری کے دودھ کا پوچا کر کے اس کا رنگ روپ نکالتے اور اپنے مذہبی فرائض پورے کرنے لگتے۔ ہولے ہولے دینِ ابراہیم سوائے چند ایک لوگوں کے، لوگوں کی زندگیوں سے نکل گیا۔ کہنے کو حج اور عمرہ کے لیے لوگ اسی ذوق وشوق سے آتے۔ اللہ کے گھر کا طواف بھی ہوتا۔ احرام بھی باندھا جاتا۔ منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں وقوف بھی ہوتا مگر تلبیہ میں ڈنڈی ماردی۔ پہلے تو کہا جاتا تھا

"لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک"

"حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔"

اب کہنے لگے

"لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک،
الا شریکا ھو لک تملکه وما ملک"

"حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جس کا تو مالک ہے اور اس کے ملک کا بھی۔"

بس، اس بظاہر اس چھوٹے سے "الا" سوائے کہہ کے حاضری کی ساری پاور تا کو پلیت کر دیا۔ یہ سارے نقص بنو خزاعہ کے اُسی سردار عمرو بن لحی کے دور میں پیدا ہوئے اور وقت کے ساتھ ان میں اور گراوٹ آتی گئی۔

کہنے کو پورے عرب کے علاقے میں بتوں کی بہتات تھی۔ جگہ جگہ معبد بنے کھڑے تھے۔ چڑھاوے بھی چڑھتے تھے۔ پوجا پاٹ بھی ہوتی تھی۔ مگر پورے عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگ سب جانتے تھے کہ وادی مکہ میں بیت اللہ کی سیدھی سادھی چار دیواروں اور دو دروازوں کے گھر میں کچھ ایسی جاذبیت اور طلسم ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے معبد میں اپنے اپنے بت پہ چڑھاوے چڑھا کے خود مکہ میں حاضری دیتا۔

☆☆☆☆☆

جوگ، مجاوری اور عاطف جاوید کی شاعری

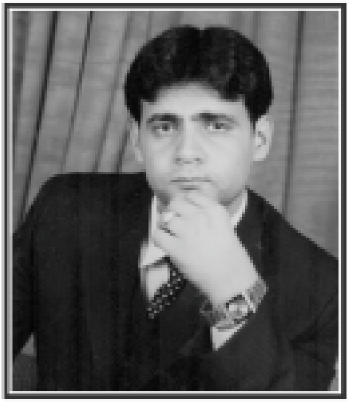

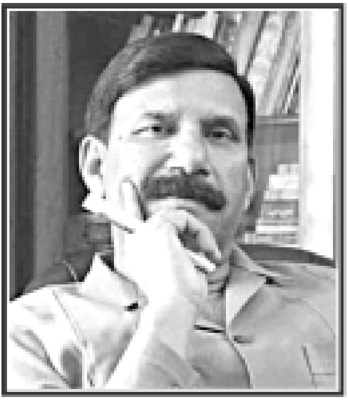

''جوگ'' اور ''مجاوری'' بظاہر دونوں عشق کے ایک ہی قبیلے سے متعلق نظر آتے ہیں لیکن انھیں اپنانے والوں کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جوگی، نفس کشی سے زیادہ اکھڑپن، شعبدہ بازی اور ذات کی نمایش کرتا گلیوں، بازاروں میں فطری تقاضوں کے نام پر اپنی ہوس مٹاتا ہے جب کہ مجاوری رضا کا کمبل اوڑھنے، حکم میں حکمت کو تلاش نہ کرنے اور یادوں کی رم جھم میں بھیگنے کی کیفیت کا نام ہے۔

''جوگی'' کا عشق چرخے کی گوک سن کر آسمان جیسے بلند پہاڑوں سے خاک پر آ گرتا ہے جب کہ ''مجاور'' کی خاک کی اٹھان زمین سے آسمان کی وسعتوں تک جا پہنچتی ہے۔ عاطف جاوید کی شاعری میں اسی طرز کی جہاندیدگی، رچاؤ اور ایک کھرے مجاور کی مشاہداتی وارداتوں کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے۔

بے کار گیا جادو ، بے کار ریاضت کی
بے کار گیا منتر ہر آہ محبت کا
پھر جسم کے معبد میں قندیل جلا کوئی
درویش رہا کر دے اب راہِ محبت کا

عاطف جاوید کا پہلا شعری ''ڈر لگتا ہے'' 2010 میں چھپا۔ اس مجموعہ میں دو باتیں بہت اہم ہیں۔ پہلی اڑان کا سلیقہ اور اپنی ذات پر اعتماد اور دوسری اپنے پروں کی توانائی کے اعتبار سے اپنے لیے آسمان کی وسعت کا تعین۔ ایک پختہ مزاج مجاور کی ابتدائی مسافت کا کھرا اس مجموعہ میں آسانی سے کھوجا جا سکتا ہے:

یونس خیال

پھر شگفتہ ہو گئی گریباں میں
پھر اسے چاک کر لیا جائے

....

ایک پلڑے میں ہے شہنشاہی
اُس کے در کا غلام ایک طرف

....

دیکھیے اب کون سی صورت میں ڈھالا جاؤں گا
کوزہ گر کے چاک پر میں پھر اچھالا جاؤں گا

....

پہلے مجموعہ کی ابتدا ہی میں وہ اپنے آج اور آئندہ کے لیے شعری وسعت کے تعین میں پر اعتماد دکھائی دیتا ہے - اس طرز کی ابتدائی گفتگو کم تخلیق کاروں کے ہاں موجود ہوتی ہے- ایک پیراگراف دیکھیے :

”پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب شاعر اپنی ذات اور معاشرے کے درمیان ہونے والے تصادم کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، دوسرے مرحلے میں وہ اپنی ذات کا حصار سے نکل کر اردگرد کے ماحول اور معاشرتی تبدیلیوں کا عکاس ہو جاتا ہے- تیسرا مرحلہ جو سب سے مشکل اور دشوار گزار ہے وہ حقیقی و روحانی معرفت ہے- میں سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت دوسرے مرحلے سے گزر رہا ہوں“
(ڈر لگتا ہے، ص ۸)

اس مجموعہ کے مزاج میں تازگی اور لفظیات میں وسعت اور جدت کا احساس ہوتا ہے-

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شاعر کو اس بات کا ادراک خود بھی ہے- جب کوئی تخلیق کار ابتدا ہی سے اپنی تخلیق کا خود نقاد ہونے کی صلاحیت حاصل کر لے تو پھر اس کے بھٹکنے کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں- اس ضمن مین اس کی کھلی رائے دیکھیے :

”یہ ساری بات لکھنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ میں نے خود کو اکیسویں صدی کا شاعر قرار دے دیا ہے- یہ حق رائے دہی آپ ہی کے پاس محفوظ ہے میں تو صرف یہ باور کرانا چاہ رہا ہوں کہ میں نے اپنی شاعری میں ثقیل بیانی سے کافی حد تک گریز کیا ہے اور کئی جگہ ایسی ترکیبات استعمال کی ہیں کہ جنھیں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی شاعری کو ماننے والے یکسر رد کرتے ہیں، یہاں تک کہ اسے سرے ہی سے شاعری سے خارج کر دیتے ہیں- اردو شاعری آج بھی ”نہ گنواؤ ناوک نیم کش“ سے شروع ہو کر ”اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں“ پر ختم ہو جاتی ہے- اور پڑھنے والے یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہم جس صدی میں جی رہے ہیں وہ صدی کہاں گئی؟“ (ڈر لگتا ہے، ص۹، ۱۰)

پہلے مجموعہ کے ٹھیک گیارہ سال بعد ”ہمیں تو حکم مجاوری ہے“ 2012 میں چھپ کر سامنے آیا- اس گیارہ سال کی ریاضت نے عاطف جاوید پر مجاوری کے کافی بھید کھول

دیے ہیں۔ اب اس نے مجاوری کی "پنجالی" کو بوجھ سمجھنے کے بجائے اس کو گلے کی زینت اور کاندھوں کی سہولت بنا لیا ہے۔ یہ اس کی شاعری کا ٹرننگ پوائنٹ بھی ہے اور پہلے شعری مجموعہ میں اپنی شاعری سے متعلق اپنی مضبوط رائے کا ثبوت بھی:

سجادہ نشینِ تاج کچھ نذر مجاور بھی
تعویز عنایت ہو، درگاہ محبت کا

....

میری خاک کو نہیں چاہ اب، رہی دوسرے کسی چاک کی
میرے کوزہ گر ترے ہاتھ نے جو بنا دیا سو بنا دیا

....

مجاور کی چپ اپنی تہوں اور سلوٹوں میں مجاز اور حقیقت کی بے شمار داستانیں سمیٹے ہوتی ہے۔ وہ منتوں، مرادوں اور نیتوں کے راستوں کا بھیدی ہوتا ہے۔ وہ مزار یا صاحبِ مزار کا درجہ نہیں رکھتا لیکن مزار آباد کرنے کے فن سے خوب آشنا ہوتا ہے۔

اگر مجھ سے کوئی پوچھے تو میں کہوں گا کہ اُس کی حیثیت ایسے ساقی سی ہے جو میکدہ تو نہیں ہوتا لیکن اس کے بغیر میکدے کا تصور بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔

مجاور خود کیا ہوتا ہے، یہ شاید اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ جان بھی لے تو کسی کو کیوں بتائے گا؟۔ زندگی کا سارا مزہ تو اس کی پُراسراریت ہی میں تو ہے اور جو اس لذت سے آشنا وہ چپ شاہ ہو گیا۔۔۔ ہمیشہ کے لیے چپ شاہ۔

مجاور بہرا، یا اندھا نہیں ہوتا بس اُسے اِذنِ گویائی محدود دی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے یہ محدودیت اس کے مرشد کے اشاروں اور اپنے محسوسات کے تابع ہوتی ہے۔

مُرشد کی نگاہ اور اس کے دل کے درمیانی راستے میں کھڑا اعتقاد کا روشن مینار اس کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔

سن اے مرشدی ترے بعد دل کسی اور کا نہیں ہو سکا
کہ پجاریوں میں یہ ریت ہے جو چڑھا دیا سو چڑھا دیا

....

مجاور چوگ ڈالنے اور چگنے والوں کے باہمی تعلق میں پوشیدہ آسوں اور امیدوں کے ایک جہان کا شاہد اور امین ہوتا ہے۔ وہ منت گزاروں کے پہناووں کے رنگوں، آنکھوں کی یاسیت، دعاوں کو اُٹھتے ہاتھوں کی جنبش اور دیے جلاتی نازک انگلیوں کی کپکپاہٹ کو اپنے اندر جذب کرنے کا حوصلہ رکھنے والا واحد ہمدرد ہوتا ہے جو وہاں بے خبری میں خبریت کے دُکھ کے بوجھ سے اپنی گردن جھکائے بیٹھا نظر آتا ہے۔ ایسے میں اس کی اپنی آس کے بجھتے دیوں کی طرف دھیان چلا جاتا ہے اور اس کے ہاں ہلکے سے شکوے کا احساس جنم لیتا ہے:

ہے یار خفا کچھ ورد سکھا، جو موم کرے ہرجائی کو
اس ماتھے پر جو پڑتا ہے اک بل مرشد، کوئی حل مرشد؟

کوزہ گری، چاک چڑھایا جانا، بننا، ٹوٹنا اور
پھر بننا فطرت کے ساتھ ساتھ چلنے اور تسلیم
کرنے کا عمل ہے- یہاں بھی شاعر کورویہ ایک
مجاور سا ہے جس کی زندگی کے معمولات اپنے
مرشد یا صاحبِ مزار کے حکم کے تابع ہیں-

آ رہی ہے زمین گردش میں
کوزہ گر کچھ بنا رہا ہو گا

....

پھر سے اترا ہے سرے چاک مرا چور بدن
خاک ہاتھوں کی عزادار ہوئی جاتی ہے

....

دیکھیے اب کون سی صورت میں ڈھالا جاؤں گا
کوزہ گر کے چاک پر میں پھر اچھالا جاؤں گا

....

عاطف جاوید کے ہاں نظم بہت توانا اور اپنا
مخصوص انداز لیے ہوئے ہے- جدید
سائنسی موضوعات ہوں یا انسانی جذبوں کی
لطافت کا اظہار، ان میں تنوع اور وسعت
کا احساس نمایاں نظر آتا ہے- کچھ تیکنیکی
موضوعات پر دسترس کے حوالے سے تو وہ
بالکل الگ اور منفرد دکھائی دیتا ہے- برف
زادی، ہمیں تو حکم مجاوری ہے، طوائف،
سے کا سورج، آخری یوگی اور کیمو اس کی
شاندار نظمیں ہیں- عاطف جاوید کے ہاں
موضوعات کا جتنا تنوع ہے، اسے ایک نہ
ایک دن مکمل طور پر نظم کو اپنانا ہوگا- یہاں
اس کی نظم "عروض" دیکھیے:

"عروض"
میری محبت کی نظم پڑھ کے
خلا میں نظریں جمائے تم نے
کمال حیرت سے مجھ سے یوں ہی سوال پوچھا
عروض کیا ہیں؟
یہ فاعلاتن مفاعلاتن کی بحر کیا ہے، یہ وزن کیا
ہے؟ مجھے بتاؤ!
کسی بھی میٹر میں شعر کہنا ہے مجھے سکھاؤ!
میری طبیعت ہے شاعرانہ
مجھے بھی کہنے ہیں شعر اچھے
مجھے سکھا دو کچھ ایسا فعلن--- مفاعلاتن
جو اک تسلسل میں، لہر میں ہو
جو بس محبت کی بحر میں ہو
تو یاد ہے ناں --- کہ سامنے کی مثال دے کر ہی
میں نے تم کو سکھا دیا تھا!
تمھارے عارض عروض سے ہیں--- یہ میں
نے کھل کر بتا دیا تھا
یہ میں نے تم کو مثال دی تھی، تمہارے لب
کا جو حاشیہ ہے
اسے سمجھ لو کہ قافیہ ہے
ردیف جیسے، یہ زیریں لب ہیں
ردیف جوڑو گی قافیے سے
تو ایک مصرع بنے گا جاناں

اس ایک لمحے میں مسکرا کر جو تم نے دیکھا تھا میری جانب
وہ مسکراہٹ تھی بحر جاناں
تو یاد ہوگا

اس ایک ہلکی سی مسکراہٹ پہ میں نے ہنس کر گرہ لگائی
تو شعر بننے میں پل لگا تھا
کہ جس کو کھلنے میں دن لگیں گے

عاطف جاوید کی نظم ''کیمو'' کمال کی نظم ہے۔ جس پر بہت لمبی گفتگو کی جا سکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث اس پر کبھی دوبارہ بات ہوگی۔ اس وقت اس نظم کے چند ٹکڑے دیکھیے:

''کیمو''

عجب ہے تشکیلِ کیمیاگر
عجب مشیتِ ایزدی کی یہ ہر بنت ہے
تمام خلیوں کے مرکزے میں بس ایک دھاگہ پرو دیا ہے
کہ چند عناصر کی ایک ترکیب باہمی سے
جڑے ہوئے ہیں

مگر خدایا یہ کیا غضب ہے
کہ چند خلیے جو تیری صنعتِ باہمی سے
جڑے ہوئے تھے
عجب بغاوت کے ایک چاتر میں لگ گئے ہیں
ترے بنائے ہوئے تناسب کی سرکشی میں
خود اپنی ہنر میں لگ گئے ہیں

خدائے واحد اے کیمیاگر
تو ہر تناسب بحال کرنے پہ مقتدر ہے
یہ تیرے سرکش یہ باغی خلیے
سزائے کیمو تو پا چکے ہیں
شفائے کیمو کے منتظر ہیں
کہ حکمِ تحلیل کب ملے گا

اور آخر میں آپ کے لیے عاطف جاوید کی وہ نظم جس کے عنوان پر اس نے اپنی کتاب کا عنوان رکھا:

''ہمیں تو حکمِ مجاوری ہے''

مزارِ دل ہے یہ کس کا مدفن؟
یہ کس عروسہ کا مقبرہ ہے؟
نہ کوئی کتبہ نہ کوئی تختی
نہ سنگِ مرمر کی سِل پہ لکھا
ہوا محبت کا شعر کوئی
فقط سرہانے سے پائینتی تک
امر کی بیل اک لپٹ گئی ہے
جو اک زمانے سے کہہ رہی ہے
یہاں ٹھکانہ تھا عاشقی کا
یہ ہیر خانہ تھا عاشقی کا
کسے خبر کہ
یہاں ہے مدفن فقیر کوئی
اسیر کوئی
یا پھر ہے وارث کی ہیر کوئی
مگر ہماری مجال ہی کیا
یہاں جو بولیں
زبان کھولیں
ہمارے لب تو سلے ہوئے ہیں
نہ جانے کب سے
سلے ہوئے ہیں
ہمیں تو حکمِ مجاوری ہے

☆☆☆☆☆

آسمانِ سخن کا آفتابِ غزل

کسی شاعر کے ہاں جب تخلیقی وفور بھی ہو، ذخیرۂ الفاظ بھی ثروت مند ہو اور خیالات نو کا بھی مسلسل نزول ہو تو اس کی شاعری کے سوتے کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعری میدانِ عمل بھی غزل جیسی طرح دار صنفِ ہزار شیوہ ہو تو شعری افق پر تازہ رنگوں کے نت نئے زاویے ابھرنے لگتے ہیں۔ آفتاب خان کی غزل پڑھتے ہوئے قاری ایسے ہی جذبات و احساسات سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کی غزل اس قدر تخلیقی وفور کے ساتھ وارد ہوتی ہے کہ پڑھنے والا پر اولین تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے، خیالات جیسے صف بہ صف اس کے سامنے برتے جانے کے منتظر ہوں اور وہ اپنے پاس موجود لفظوں کے بہا ذخیرے سے مناسب و متناسب الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے اپنے خیالات کو ایسے دیدہ زیب لباس میں ملبوس کرتا چلا جاتا ہو جس کی تراش خراش کے نت نئے زاویے معنویت کے تازہ دریچے وا کرتے چلے جاتے ہیں۔

غزل میں معنویت کی تازگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ شاعر روایت سے وابستہ رہ کر اپنی قلبی واردات کو تجربے کی آنچ پر دم پخت کرے اور پھر اظہار کے تازہ ذائقوں سے شناسائی پیدا کرتے ہوئے روایت اور تجربے کی امتزاجی کیفیت کو قاری تک منتقل کرے۔ آفتاب خان نے اپنی غزل میں اس معیار کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ بعض مقامات پر اس نے اپنی اس فنی ریاضت کا بجا طور پر تذکرہ بھی کیا ہے:

وہ میری غزل کے جو مصارع پہ کرے غور
سمجھے گا یہ ابھرے ہیں مرے خونِ جگر سے

کچھ خاص مقاماتِ سخن تب ہی ملے ہیں
چلتا ہوں ذرا ہٹ کے میں ہر عام ڈگر سے

....

آفتاب خان غزل کے مزاج شناس شاعر ہیں۔

نذر عابد

ان کے ہاں تغزل کی چاشنی اپنے تمام تر تیکھے تیوروں کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر محبت کے شاعر ہیں لیکن محبت کے کسی افلاطونی نظریے کے قائل نہیں۔ ان کے ہاں محبت اپنے ارضی رویوں کی صورت میں اظہار پاتی ہے۔ وہ خیالِ طرہ لیلیٰ میں بھٹکنے کے بجائے لیلیٰ کو زمینی حقیقت کے روپ میں دیکھنے کی کیفیت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ سرشاری کی یہ کیفیت ان کے ہاں کسی حد تک آسمانی سطح کی قلبی و روحانی بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ارضی و جسمانی حیثیت رکھتی ہے:

ترے بدن کو بنایا تلازمہ جوں ہی
اترتے آئیں نئے شعر آسمانوں سے

آفتاب خان کی غزل میں جسمانی حسن کے تمام تر تیکھے زاویے حسیاتی سطح پر عجیب و غریب بھید بھاؤ کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں۔ حسن سے محسوساتی سطح پر لطف کشید کرتے ہوئے ان کے ہاں بصری، سمعیاتی، لمسیاتی، ذائقاتی اور شاماتی تناظر میں بے پناہ شعری تمثالوں کا ایک مستقل اور مسلسل تخلیقی عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ یہاں ایسی شعری تمثالوں کے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں:

اس نیم وا دریچے سے تکتا ہے آفتاب
آئے وہ اپنے بال سکھانے کے واسطے

ہوا کے زور سے بکھرے ہیں تیرے گیسو تب
پھسل گئی ہے جونہی شال تیرے شانوں سے

مقطع میں نیم وا دریچے سے تکتے ہوئے آفتاب کی بصری تمثال میں لفظ آفتاب کی ذومعنویت سے عجب رنگ بھر دیے ہیں۔ شال سے پھسلنا بصری اور لمسیاتی ہر دو سطح کی ایسی شعری تمثال ہے جس میں قاری کے لیے ایک تدریجی عمل کے دیکھنے اور محسوس کرنے کا لطف پایا جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں سمعیاتی سطح کی لفظی تمثال گری غور طلب ہے:

پانی میں پاؤں پڑتے ہی کیا ساز بج اٹھے
اس نے ندی کی لہر کو پائل بنا دیا

جھونکا کسی خیال کا آنکھیں بھگو گیا
دھیرے سے یادِ یار کی اتری ہے پھر پون

پانی میں پاؤں کے پڑتے ہی جلترنگ جیسی سریلی آوازوں کا ابھرنا اور پانی کی لہر پائل کی صورت میں دکھانا ایسی سمعیاتی تمثالیں ہیں جو قاری کی سماعتوں پر عجیب تحرک و تاثر کا باعث بنتی ہیں۔ اگلے شعر میں پون کے جھونکے کی سرسراہٹ سماعتوں کو متحرک کرتی ہے۔ پون سے مراد ساون کی ہوا ہے۔ اس رعایت سے آنکھوں کا بھیگ جانا بھی معنی خیز ہے۔ اس کے علاوہ یاد اور یار کے الفاظ میں تجنیسی کیفیت بھی متاثر کن ہے۔ آفتاب خان کی غزل میں لمسیاتی سطح کے محسوساتی پیکر بھی ملتے ہیں:

اے مہ وشوں کی جان، ترا حسن بے مثال
تیرا وفورِ لمس ہے میرے لیے مفید

دھیرے سے میرا ہاتھ دبانے کے واسطے
آئے مرے قریب نہ جانے کے واسطے

گزرے اگر چمن سے تو بے چین پھول ہوں
اس کے بدن کی باس چرانے کے واسطے

....

وفورِلمس کا شعری امیج لمسیاتی تجربے کی شدت کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ دوسری طرف دھیرے سے ہاتھ دبانا ایسی شعری تمثال ہے جو لمسیاتی تجربے کے اس دھیمے پن کو ظاہر کرتی ہے جو ایمائیت اور اشاریت سے لبریز ہے۔

آفتاب خان کی غزل میں حسن کے مختلف زاویوں کو ابھارتی ایسی شعری تمثالیں بھی جا بجا جلوہ گر ہیں جن سے حسِ ذائقہ متاثر و متحرک ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ایسے ذائقاتی پیکروں کا زیادہ تر تعلق مٹھاس اور حلاوت سے ہے:

چکھنے دے ذائقہ مجھے ہونٹوں کا ایک بار
کچھ دیر کے لیے ہی تدارک ہو پیاس کا

ویسے تو بے شمار ہیں دنیا میں ذائقے
اٹکا ہے میرا ذہن لبوں کی مٹھاس پر

....

حسیاتی تجربات کے تناظر میں آفتاب خان کے ہاں ایسی شعری تمثالیں بھی موجود ہیں جو شاماتی سطح پر قاری کی حسِ شامہ پر اثر انداز ہوتے ہوئے حسن کو ایک نئے معنیاتی پہلو منکشف کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ ذیل میں دیے گئے شعر میں ایسا ہی ایک شاماتی امیج متحرک انداز میں ابھرتا ہوا محسوس کیا جا سکتا ہے:

گزشتہ سطور میں زیرِ بحث لائے گئے آفتاب خان کے غزلیہ اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ وہ بصری، سمعیاتی، لمسیاتی، ذائقاتی اور شاماتی غرض تمام تر حسیات کو بروئے کار لاتے ہوئے حسن کو محسوساتی سطح پر اس انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی غزل میں حسن اپنے متعدد متاثر کن زاویوں سے نمودار ہونے لگتا ہے۔ حسن کی اس کامیاب پیشکش کا راز یہ ہے کہ شاعر روحانی و قلبی سطح پر حسن کے بھید بھاؤ اور اسرار سے اس حد تک آگہی رکھتا ہے کہ وہ تمام بھید بھاؤ اور اسرار گویا اس کی رگوں میں دوڑتے لہو میں سرایت کر چکے ہیں:

میں تیرے جسم کے اسرار جانتا ہوں سبھی
میں اس کتابِ محبت کی سب سطور میں ہوں

....

یہ بات طے شدہ ہے کہ محبت کے جس قدر بھی رنگ روپ ہوں، آخرکار انسانیت سے محبت اور انسان دوستی کے عظیم جذبے میں ڈھلتی ہے۔ آفتاب خان کے ہاں بھی محبوب مرکز محبت اپنے سماج میں بستے انسانوں کی محبت پر منتج ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس بلند سطح کی محبت کے تقاضے یوں نبھاتے ہیں کہ اپنے آس پاس کے لوگوں کی زندگی میں گھلتی تلخیوں اور انفرادی و اجتماعی ہر دو سطح پر ان کو درپیش دکھوں کی ترجمانی اپنی غزل میں مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ محروم طبقات کے حقوق پر بات کرتے ہوئے وہ نہ صرف

مراعات یافتہ طبقے کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے نظر آتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر مظلوم طبقات کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ بعض اوقات خود مظلوم بھی ظالم کے ہاتھ مضبوط کرنے کا باعث بنتا ہے:

زردار سے مفلس کی اگر جنگ ہوئی ہے
تب کرب کے ماروں پہ زمیں تنگ ہوئی ہے

اک حشر بپا ہو گا یہاں وقت سے پہلے
مخلوق خدا جبر کے جب سنگ ہوئی ہے

....

آفتاب خان کے دل میں چونکہ انسانیت کا درد موجود ہے، اس لیے جب ان کا سامنا سماج کے ایسے کرداروں سے ہوتا ہے جو بے حسی کو اپنا وطیرہ بنائے ہوئے ہیں تو وہ شدتِ احساس کے ساتھ ان کی مذمت کرتے ہیں:

نہ محسوس ہو کسی کو انسانیت کا درد
یہ سب پھول کاغذی ہیں سو باس ہی نہیں

انسانیت کا درد جسے مضطرب کرے
ایسا کوئی ملا ہی نہیں آس پاس میں

زندگی کے زیادہ تر دکھ معاشی تنگ دستی سے جڑے ہوئے ہیں۔ روزی روٹی کے مسائل انسانی زندگی میں سماجی نوعیت کے دکھ بھی ساتھ لے کر آتے ہیں۔ ایسے مجبور و مقہور طبقات کے دکھوں کی ترجمانی بھی آفتاب خان کی غزل میں ملتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں کمزور معیشت سے جنم لینے والے یہ دکھ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر یوں اظہار پاتے ہیں:

باپ مفلس ہو تو پھر ہاتھ بٹانے کے لیے
بیٹیاں گھر سے نکلتی ہیں کمانے کے لیے

تیری مجبوری سے اوروں کو سروکار نہیں
قرض کچھ اور اٹھا قرض چکانے کے لیے

....

معاشی تنگی سے جڑے ان تمام تر سماجی دکھوں کا مداوا یہی ہے کہ معاشرے کے افراد نہ صرف اپنے اندر میسر وسائل کو آپس میں تقسیم کرنے کا حوصلہ پیدا کریں بلکہ محرومیوں کو بھی آپس میں مل بانٹ کر ایک دوسرے کی خوشیوں اور مسرتوں کا سامان کریں۔ یوں ایک ایسا خوب صورت متوازن سماج تشکیل پانے کا خواب تعبیر آشنا ہو گا جس میں نہ صرف حاصلات پر سب کا حق ہو گا بلکہ محرومیوں میں بھی سب کا حصہ ہو گا۔ آفتاب خان کے ہاں اس جذبے کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے:

جس قدر خوشیاں ملیں گی ان پہ میرا حق نہیں
دوسروں میں بانٹنے کا خود سے وعدہ کر لیا

آفتاب خان کی شاعری آسمانِ سخن کا وہ آفتاب غزل ہے جو زندگی کی سرد مہری پر سکھ کی نرم دھوپ بانٹنے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ شاعری کو ایسے عمل سے تعبیر کرتے ہیں جو کبھی انسانیت کو روحانی سکون اور قلبی اطمینان سے ہم کنار کرتے ہوئے گویا سماجی سطح کے کارِ خیر میں منقلب ہو جاتا ہے:

میں بانٹتا ہوں یہ کثرت سکون بخش سخن
مجھی سے درد کے مارے کلام کرتے ہیں

☆☆☆☆☆

زندہ ہیں لوگ آج بھی مرنے کے باوجود..... طلعت حسین

ریڈیو، ٹیلی وژن، تھیٹر اور فلم کے بین الاقوامی شہرت کے حامل ممتاز اداکار اور صداکار اور افسانہ نگار جناب طلعت حسین صاحب جہان فانی سے رخصت ہو گئے - طلعت حسین صاحب کی شاندار اور باکمال اداکاری آنسو، ارجمند، طارق بن زیاد، بندش، دیس پردیس، عید کا جوڑا، فنون لطیفہ، ہوائیں، اک نئے موڑ پہ، پرچھائیاں، دی کاسل - ایک امید، ٹائپسٹ، انسان اور آدمی، رابطہ نائٹ کانسٹیبل، درد کا شجر جیسے شاہکار ڈراموں سے ہمیں دیکھنے کو ملی تو ان ڈراموں سے پاکستان ٹیلی وژن کا ہی نہیں بلکہ پاکستان کا بھی بین الاقوامی سطح پر وقار بلند ہوا- جناب طلعت حسین صاحب متعدد یادگار ملاقاتیں آج بھی حافظے میں محفوظ ہیں- ان میں سے تین ملاقاتیں جناب طلعت حسین صاحب کے خوبصورت افسانوں سے متعلق ہیں- مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے جناب طلعت حسین صاحب کے بہت قریب بیٹھ کر ان سے افسانے سنے ہیں- ایک تو نجی محفل میں کہ جس میں سید نورالھدا اسید صاحب، میڈم شہناز نور، پروفیسر جاذب قریشی صاحب، جناب محسن اعظم محسن ملیح آبادی، ڈاکٹر شکیل فاروقی اور میڈم عطیہ خلیل عرب جیسی نامور ادبی شخصیات شامل تھیں- دوسری تقریب میں صدیقہ بیگم، جناب جمیل الدین عالی، جناب شبنم رومانی صاحب شامل تھے جبکہ تیسری محفل حلقہ ارباب ذوق کے روح رواں، گلشن لور اور ممتاز افسانہ نگار جناب زیب اذکار حسین صاحب کی کرم نوازی تھی، حلقہ ارباب ذوق کا آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی منعقدہ اجلاس تھا کہ جس میں جناب طلعت حسین صاحب نے پارٹیشن، تقسیم اور ہجرت کے تناظر میں انتہائی عمدہ اور کرب سے لبریز افسانہ پڑھا- اس شاہکار افسانے کو دراصل جناب طلعت حسین صاحب کی خودنوشت کا ایک باب بھی کہا جا سکتا-

کئی برس پہلے کی بات ہے کہ آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی میں ادبی کانفرنس میں ہی مختلف

ظفر معین بلے جعفری

سیشنز میں سے ایک حضرت جوش ملیح آبادی اور یادوں کی بارات کے روائزڈ ایڈیشن کے حوالے سے ایک سیشن تھا۔ حضرت جوش کی پوتی محترمہ تبسم اخلاق صاحبہ بطور خاص اس میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد سے تشریف لائی تھیں۔ جناب طلعت حسین صاحب نے حضرت جوش کا کلام تحت اللفظ میں پیش کرنا تھا لیکن اس روز ان کی طبیعت ناساز تھی۔ دمے کے اثرات شدید تھے لہٰذا طلعت حسین صاحب چند اشعار ہی پڑھ کر معذرت کرکے سٹیج سے اتر آئے۔ ان کا سانس بری طرح سے اکھڑ رہا تھا تو میں ان کو پکڑ کر کھلی فضا میں لے آیا اور کہا کہ میں آپ کو چائے پلواتا ہوں اس سے آپ کا سانس بحال ہوگا اور جیسے ہی چائے آئی تو میں نے ان سے بغیر اجازت لیے اپنی جیب سے جوہر جوشاندے کے ساشے نکالے اور ایک ان کے کپ میں مکس کیا اور ایک اپنے کپ میں اور جب انھوں نے دو گھونٹ چائے کے حلق سے اتار لیے تو میں نے عرض کیا کہ آپ نے سگریٹ کب سے نہیں پی تو انھوں نے کہا کہ کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ ان کی یہ بات سن کر میں نے نہایت انکساری سے انھیں سگریٹ پیش کی، لائیٹر جلایا اور ان کی سگریٹ سلگا کر کہا کہ اب آپ کا سانس مکمل طور پر بحال ہو جائے گا۔ ہم دونوں بمشکل ایک آدھ گھنٹہ ہی ان نوون بات چیت کر پائے ہوں گے کہ سب سے پہلے تو ڈاکٹر شکیل فاروقی اور پھر ایک ایک کرکے ان کے احباب اور مداح انھیں گھیرتے ہی چلے گئے۔ لیکن انھوں نے مجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ اٹھ کر کہیں نہ جایئے گا، میری طبیعت بہتر ضرور ہے لیکن مکمل طور پر سانس بحال نہیں ہو رہا۔

جناب طلعت حسین صاحب کے ساتھ ون ٹو ون ملاقاتوں کے حوالے سے بہت سی حسین یادیں حافظے میں محفوظ ہیں۔ ایک تو یہ کہ دو ہزار سولہ میں سینٹ پیٹرکس اے۔ لیول کالج میں بہت شاندار انداز میں سالانہ تقریبات منائی جارہی تھیں۔ میں ان دنوں ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ کے خدمات انجام دے رہا تھا۔ شعبہ اردو کے ہونہار طلبہ و طالبات نے ایک اسٹیج ڈرامہ تعلیم بالغاں تیار کیا تھا۔ پیش کرنے کے لیے ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصے تک اس کی ریہرسل کی۔ شعبہ اردو، کالج انتظامیہ اور ڈین اس بات پر متفق تھے کہ مہمان خصوصی جناب طلعت حسین صاحب کو ہونا چاہیے لیکن طلعت حسین صاحب عموماً تقاریب میں کم، کم ہی نظر آتے تھے لہٰذا ان کی آمد کو یقینی بنانے کے لیے میری اور جناب طلعت حسین صاحب کے فرزند (اولڈ بوائے آف سینٹ پیٹرکس اے لیول کالج) کی خدمات حاصل کیں۔ باوجود اس کے کہ جب میں نے ان سے فون پر یہ گزارش کی تو کہنے لگے کہ میرے بیٹے نے بھی آپ کی اور سینٹ پیٹرکس کی انتظامیہ کی اس خواہش کا ذکر کیا تھا اور میں نے مثبت جواب ہی دیا تھا لیکن میں آپ سے یہ عرض کروں کہ کمٹمنٹ کرکے نہ آسکا تو آپ برا مان جائیں گے اور آج کل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے نہایت عاجزانہ انداز میں عرض کیا کہ آپ کی طبیعت کی خرابی کا اندازہ تو آپ کی آواز سن کر ہو رہا ہے۔ بیشک آپ کو مدعو کرنے میں ہماری خواہش اور خوشی بھی شامل ہے لیکن ہمیں آپ بہت عزیز ہیں۔ آپ کی

صحت مند زندگی سے بڑھ کر کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ جناب طلعت حسین صاحب نے سٹیج ڈرامہ تعلیم بالغاں دیکھنے کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے ڈرامہ بہت پسند کیا اور انھوں نے تمام ٹیم کی بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان کے ساتھ مسلسل کئی گھنٹے بیٹھ کر بات چیت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اسی دوران انھوں نے بتایا کہ کسی تقریب میں جمیل الدین عالی صاحب نے مجھے کسی سے سید فخر الدین بلے شاہ صاحب کے پسماندگان میں شامل اولاد کی بابت دریافت کرتے سنا تو فوراً ہی خود سے جمیل الدین عالی صاحب نے مجھے بتایا کہ بلے صاحب کی تین بیٹیاں تو یہیں قریب ہی سی ویو میں سکونت پذیر ہیں، احمد ندیم قاسمی صاحب جب بھی کراچی تشریف لاتے ہیں تو دختران سید فخر الدین بلے کے ہاں ضرور قیام فرماتے ہیں جبکہ ان کا ایک بیٹا ظفر معین بلے میرے گھر کے بالمقابل دی اوایسز، او اینڈ اے لیول کالج میں ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ ہے اور میرا اپنا نواسہ اسی سکول/کالج میں پڑھتا ہے۔ جناب طلعت حسین صاحب کے بقول یہ معلومات حاصل کرکے میں مطمئن ہوگیا اور تب ہی تو میں آپ کے کلفٹن بلاک میں واقع کالج میں آکر آپ کے والد گرامی جناب سید فخر الدین بلے صاحب کی تعزیت کر پایا تھا اور میں نے آپ سے تذکرہ بھی کیا تھا ان یادگار ملاقاتوں کا جو میری سید فخر الدین بلے صاحب، جاوید احمد قریشی صاحب، ڈاکٹر خالد سعید بٹ صاحب، ڈاکٹر انور سجاد اور مسعود اشعر صاحب کے ساتھ ہوتی رہی تھیں۔

الفاظ و صوت و رنگ و تصور کے روپ میں
زندہ ہیں لوگ آج بھی مرنے کے باوجود
(سید فخر الدین بلےؔ)

جناب وسعت اللہ خان صاحب کا شمار عہد حاضر کے باکمال صاحبان علم، ادب دوست، ہر دلعزیز کالم نگار اور اینکرز میں ہوتا ہے۔ لیجنڈ طلعت حسین صاحب کی وفات پر جناب وسعت اللہ خان صاحب کا جو کالم منظر عام پر آیا اس میں جہاں مختلف زاویوں سے طلعت حسین صاحب کے حوالے سے بہت خوبصورت باتیں کی گئی ہیں اور جس تشویش کا اظہار نمایاں ہے وہ طلعت حسین صاحب کا تخلیقی کام (ناول) اور اس کے تحفظ کا معاملہ ہے۔ جناب وسعت اللہ خان صاحب نے لکھا کہ طلعت صاحب پچھلے کئی برس سے بتاتے رہتے تھے کہ میں نے ایک ناول تقریباً لکھ لیا ہے۔ بس آج کل میں مکمل ہونے والا ہے۔ جانے اس ناول کا اب کیا ہوگا۔ آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کے سربراہ جناب احمد شاہ کو طلعت حسین صاحب کی چالیس برس سے زائد عرصے پر محیط رفاقت کے ساتھ ساتھ یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ محترمہ ہما میر صاحبہ کی تصنیف یہ ہیں طلعت حسین، آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی نے ہی شائع کی تھی۔ ہمیں امید نہیں بلکہ یقین ہے احمد شاہ صاحب کے ہوتے ہوئے طلعت حسین صاحب کا کوئی افسانہ، ناول، خودنوشت یا کوئی بھی تحریر غیر محفوظ نہیں رہے گی۔

☆☆☆☆☆

خواجہ زکریا

کرامت علی بھٹی

زندگی درس و تدریس میں گزرے تو بندے کی گفتگو عموماً بے برکت لیکچر بن جاتی ہے یا طویل مقالہ، ایسے میں مقرر جہاں اپنے سامع سے مبتدی کا سلوک کرتا ہے، وہاں اس سے توقع بھی طالب علمانہ رویے کی رکھی جاتی ہے، یعنی سر ہلاتے جاؤ اور جی جی کہتے جاؤ۔ اچھی بھلی محفلیں انھی لوگوں کے سبب اجڑتی اور علم وہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ ایک بے کیف اور جامد ماحول میں علم کا اصل پیام بروہی ہے جو گفتگو کو مکالمہ بنائے، اسے مقالہ نہ رہنے دے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا نام ایسے ہی مکالمہ دوست لوگوں میں ہوتا ہے۔ اپنے علمی مقام اور انکساری کے باعث ہر دل اور محفل میں ان کی جگہ فراغ ہے۔

خواجہ محمد زکریا قرارداد پاکستان کی منظوری کے دن امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا سری نگر سے ہجرت کر کے امرتسر آئے۔ یہ خاندان پشمینے اور شالوں کا کاروبار کرتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عظیم اقتصادی بحران نے کاروبار ختم کیے تو ان کے دادا غلام محی الدین ایک وکیل کے منشی بن گئے جبکہ کم تعلیم یافتہ باپ خواجہ غلام نبی معمولی کاروبار کرنے لگے۔ پاکستان بنا تو یہ خاندان ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔ یہاں چند گزارنے کے بعد یہ لوگ جھنگ چلے گئے ہاں خواجہ زکریا کے بعض ننھیالی عزیز تقسیم ملک سے قبل آ کر آباد ہو چکے تھے۔

خواجہ زکریا کی والدہ سکول ٹیچر تھیں۔ اس کے باوجود ننھے زکریا نے پرائمری تک پڑھائی میں بالکل دلچسپی نہ لی بلکہ انھوں نے کئی سکول بدلے ارو خواب آوارہ گردی ہے۔ شاعری سے البتہ اس وقت بھی انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ تقسیم سے قبل وہ اپنے تایا زاد مختار احمد ناز سمیت کئی شاعروں کو پڑھ چکے تھے۔ اسلامیہ ہائی سکول جھنگ (صدر) میں مختلف ہم جماعتوں اور عمدہ تعلیمی ماحول کے باعث ان کا دل پڑھائی میں لگ گیا۔ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ خصوصاً بیت بازی کے باعث سکول میں انھیں ہر کوئی جانتا تھا۔ وہ سکول کی فٹ بال ٹیم میں رہے، بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ ساتویں جماعت تک انھیں علامہ اقبال کی طویل نظمیں شکوہ، جواب شکوہ پوری طرح یاد تھیں۔ میٹرک

فرسٹ ڈویژن کے بعد گھر والوں نے انھیں گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخل کروایا۔ اپنی مرضی کے مضامین اختیار نہ کرنے کی اجازت پر ان کی توجہ دوبارہ پڑھائی سے ہٹ گئی۔ چنانچہ ان دو سالوں میں انھوں نے کھیلوں میں حصہ لیا شاعری کی، امتحان سر پر آئے تو ''بیمار'' پڑ گئے۔ گھر والوں نے چار و ناچار آرٹس میں داخلے کی اجازت دی۔ خواجہ نے ایف اے کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کر کے سب کو حیران کر دیا۔ انھوں نے 1960 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج سے ایم اے اردو کے امتحان میں اول آنے کے ساتھ نیا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ بی اے میں انھیں بہترین غزل گو شاعر کا ایوارڈ ملا۔ بی اے میں قیوم نظر اور ایم اے میں ڈاکٹر سید عبداللہ ان کے استاد رہے۔ خواجہ زکریا اپنی عمدہ ٹیچنگ کو بھی انھی کا کریڈٹ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے ریسرچ کا فن ڈاکٹر وحید قریشی سے سیکھا۔ 1973 میں انھوں نے ''اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان پر پی ایچ ڈی کی۔ وہ کچھ عرصہ ملتان یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو اور ڈین آف فیکلٹی بھی رہے۔ 1980 سے 1991 تک انھوں نے اورینٹل کالج میں صدر شعبہ اردو کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ 1992 کے شروع میں وہ تدریس اردو کے لیے پیکنگ یونیورسٹی چین چلے گئے، ایک سال بعد یہ ملازمت چھوڑ دی۔ اورینٹل کالج میں صدر شعبہ اردو، ڈین آف فیکلٹی اور پرنسپل کے عہدوں پر فائز رہے۔ 1999 کے آغاز میں واپس اورینٹل کالج آ گئے اور 22 مارچ 2000 کو بطور پرنسپل وہاں سے ریٹائر ہو گئے۔ اس کے بعد تقریباً تین سال تک ایچی سن کالج میں کوآرڈینیٹر کی حیثیت سے کام کیا اور ایک سال گورنمنٹ کالج میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ دونوں اداروں کو اپنی مرضی سے چھوڑ کر 2004 سے لے کر اب تک تحقیقی و تنقیدی کاموں میں مصروف ہیں۔ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں اردو ادب کی پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ لکھنے پر مامور ہیں، جن میں سے چار جلدیں چھپ چکی ہیں۔

اپنا زیادہ وقت ادیبوں اور شاعروں میں گزارنے والے خواجہ زکریا، میر تقی میر، علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری کی شاعری پسند کرتے ہیں جبکہ بطور انسان مرزا منور اور سب سے بڑھ کر مجید امجد نے انھیں متاثر کیا۔ انھوں

نے مجید امجد سے زیادہ کم گو، دیانت دار اور شریف آدمی کوئی اور نہیں دیکھا - حفیظ جالندھری جز رس مشہور تھے لیکن جب خواجہ زکریا کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تو حفیظ نے اس خوشی میں ایک معروف ہوٹل میں سو آدمیوں کی دعوت کی - اپنے رفقائے کار شریف کنجاہی (مرحوم) مرزا منور سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا- پی ایچ ڈی کے سلسلہ میں جب وہ تحقیق کر رہے تھے تو احسان دانش نے خواجہ زکریا کو بعض نادر کتابیں فراہم کیں- احسان دانش کا بڑا بیٹا فیضا دانش ان کا کلاس فیلو رہا- سیاستدانوں میں قائداعظم کے علاوہ انھیں سردار عبدالرب نشتر، چودھری محمد علی، شاہ فیصل، عبدالستار ایدھی، عمران خان اچھے لگتے ہیں- ان کے خیال میں ڈاکٹر طاہر القادری اور عمران خان فروغ تعلیم کے لیے کچھ کرتے تو زیادہ بہتر بات ہوتی- مغرور اور نمائش پسند لوگ خواجہ زکریا کو پسند نہیں- انھیں بھٹو کا انداز سیاست پسند آیا نہ سوئیکارنو، کرنل قذافی اور مصطفیٰ کمال ہی اچھے لگے-

کائنات، ستاروں اور کہکشاؤں کے علاوہ خواجہ زکریا لٹریچر، فلاسفی، سائیکالوجی اور سماجی علوم پر کتابیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں- پنجابی شعرا میں انھیں شاہ حسین اور بلھے شاہ کا کلام پسند ہے اور ''ہیر'' کی لوک داستان ایک سماجی کہانی کے طور پر اچھی لگتی ہے- ان کے خیال میں اردو غزل میں میر اور غالب کا کوئی ثانی نہیں- فلاسفی میں ان کی پسندیدہ کتاب ''دی ہسٹری آف فلاسفی'' ہے، جسے ول ڈیورانٹ نے تحریر کیا- ''دی سٹوری آف سولائزیشن' اور ٹوئن بی کی ''دی سٹڈی آف ہسٹری'' بھی پسندیدہ کتابیں ہیں- دیوان حافظ، گلستان و بوستان سعدی، مثنوی مولانا روم انھیں پسند ہے- قرۃ العین حیدر کے ناول انھوں نے کئی بار پڑھے- مشتاق احمد یوسفی کی تو بات ہی کچھ اور ہے-

بیس کتابوں کے مصنف ڈاکٹر خواجہ زکریا کم از کم دس اور کتابیں لکھنا چاہتے ہیں- ان کے بقول، ''دیباچے لکھنے، تبصروں اور تقریبات میں بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے- دوست ریلیف دیں تو علامہ اقبال کی مزید چار کتابوں کی شرح اپنی بائیوگرافی اور مجید امجد پر کتاب لانے کی خواہش ہے-

منیر نیازی نے ساہی وال میں مجید امجد سے بہت سیکھا- ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' میں چند مصرعے تک مجید امجد کے ہیں، تراکیب، الفاظ اور لہجہ بھی انھی کا-

امریکہ، برطانیہ، بھارت سمیت کئی ممالک کی سیر کرنے والے ڈاکٹر زکریا کو جاپانی سوسائٹی بہت پسند ہے- ان کے مطابق،

”چینی بعض خصوصیات میں ہماری طرح ہیں۔ بھارت میں بدترین غربت ہے۔ وہاں لاکھوں لوگ فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں۔“

پاپ میوزک کو ناقابل برداشت قرار دینے والے خواجہ زکریا مہدی حسن، لتا، نور جہاں، اختری بائی، فیض آبادی، طفیل نیازی، حامد علی بیلا، ریشماں اور بڑے غلام علی خاں کے مداح ہیں۔ وہ تمام مصروفیات سے وقت نکال کر موسیقی سنتے ہیں۔ ان کے ہر کمرے میں ٹیپ ریکارڈ موجود ہے۔ کوئی نمایاں شار یا سر میں گانے والا گلوکار ایسا نہیں، جس کی کتاب یار ریکارڈنگز ان کے پاس نہ ہوں۔ کسی زمانے میں انداز، بیجو باورا، بسنت بہار، لارنس آف عریبیہ، دی فال آف رومن ایمپائر، دی برج آن دی ریور کوائے دلچسپ فلمیں لگیں۔ پاکستانی فلم ”باجی“ اچھی لگی۔ اشفاق احمد کی ”دھوپ اور سائے“ بھی عمدہ کاوش تھی۔ فیض کی ”جاگو ہوا سویرا“ باکمال فلم تھی جو صرف ایک ہفتہ چلی۔ اداکاروں میں دلیپ کمار، ندیم بہتر لگے۔ شبانہ، حبیبہ اور زیبا بھی اچھی رہیں۔

فواد، جواد اور صباحت کے والدین خواجہ زکریا کی شریک حیات شگفتہ زکریا اردو میں پی ایچ ڈی اور لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی میں صدر اردو اور ڈین آف فیکلٹی رہی ہیں۔

تین بھائیوں میں منجھلے خواجہ زکریا کل سات بہن بھائی ہیں۔ بڑے خواجہ کبریا سابق چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ رہے۔ چھوٹے امریکہ میں انتہائی اعلیٰ واسکولر (Vascular) سرجن ہیں۔ ممبر قومی اسمبلی خواجہ سعد رفیق، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے بھانجے ہیں۔ پنجاب میں کم ایسے کالج ہوں گے جہاں خواجہ زکریا کا کوئی شاگرد نہ ہو۔ خواجہ زکریا کا کسی ادبی دھڑے سے تعلق نہیں۔ ان کے نزدیک، ”خوبی جہاں ہو، اسکی ہی تعریف کرنی چاہیے“ کہ خود انھوں نے ادب میں پسند ناپسند کے ظاہر میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ خواجہ زکریا معروف معنوں میں مذہبی آدمی نہیں۔ شہرت کا انھیں شوق نہیں۔ ان کے خیال میں بالآخر انجام موت ہے۔ شہرت جتنی خود ملے، اچھی ہے۔ مرنے کے بعد تو شہرت کسی کام کی نہیں ہوتی۔ خواجہ زکریا کے خیال میں، ”نودولتی طبقہ نے ہماری معاشرتی اقدار کو تباہ کر دیا ہے۔ استاد شاگرد کو سرزنش کر دے تو والدین بھاگے آتے ہیں۔ استاد بھی اب قناعت پسند نہیں رہا۔ کم سے کم ضروریات، زندگی کو آسان بنا دیتی ہیں مگر ہمارے ہاں کوئی قناعت پر آمادہ نہیں۔“

☆☆☆☆☆

فرحت عباس شاہ اور ادراکی تنقید کا حیرت کدہ

محمد کامران

1990 کے اواخر میں پاک ٹی ہاؤس میں پہلی بار اپنے ایم اے اردو کے ہم جماعت سلمان صدیق کے ساتھ گیا- وہ پاک ٹی ہاؤس کا اہم دور تھا- اس دور میں، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ خوش گفتاری کے لیے اچھا سامع ہونا ضروری ہے اس لیے میں پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ اربابِ ذوق کی مجالس میں اپنے وجود اور روح کی تمام کھڑکیاں کھول کر اس یقین کے ساتھ سنتا تھا کہ میرا بولنے کا زمانہ جلد آئے گا- اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے زمانے میں میرے ہم جماعت اور دوست سلمان صدیق کا پہلا شعری مجموعہ "کسی سے پیار کا مطلب" شائع ہوا- اس مجموعے کا دیباچہ میں نے لکھا تھا- اس مجموعے کی اشاعت کے کچھ دن بعد میں اورینٹل کالج کی کینٹین پر بیٹھا تھا کہ کسی دوست نے بتایا کہ فرحت عباس شاہ اورینٹل کالج آئے ہیں اور تمہارا پوچھ رہے ہیں- فرحت عباس شاہ اس زمانے میں بھی خاصے مقبول شاعر تھے اور ادبی حلقوں میں ایک روشن ستارے کی طرح جگمگا رہے تھے فرحت عباس انتہائی گرمجوشی سے ملے اور بتایا کہ سلمان صدیق کے شعری مجموعے کا دیباچہ اتنا اچھا تھا کہ وہ "محمد کامران سے بطور خاص ملاقات کرنے کے لیے اورینٹل کالج آئے ہیں"- یہ لاہور کے کسی شاعر یا ادیب کی طرف سے میری پہلی پذیرائی تھی جسے میں نے ایک تحیر آمیز مسرت کے ساتھ اپنے قلب ونظر میں محفوظ کر لیا- فرحت عباس شاہ نے اس موقع پر رام ریاض کا شعری مجموعہ "پیڑ اور پتے" مجھے بطور تحفہ عطا کیا-

میں نے 1990 سے 2024 تک فرحت عباس شاہ کو دیکھا، پڑھا اور محسوس کیا- اس کی مقبولیت اور شہرت کی ضوفشانی کا مشاہدہ کیا- معاصرانہ چشمکوں اور محاذ آرائیوں کو دیکھا- اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی سیماب صفتی اور طلسماتی کیفیت ہے- آنکھوں میں کچھ کر گزرنے کی چمک ہے- وہ ایک ایسا سپاہی ہے جو زمانہ امن میں بھی ہمہ وقت حالتِ جنگ میں رہتا ہے- فرحت عباس شاہ کی شخصیت ہشت پہلو ہے، بیک وقت بہت سے محاذوں پر سرگرم عمل تخلیقی شخصیات بالعموم پیچیدہ ہوتی ہیں- کسی معمے کی طرح، کسی مانوس اجنبی کی طرح، ظاہر بھی اور مستور بھی تخلیقی شخصیات دن کے اجالے جیسی نہیں ہوتیں- وہ کبھی صبح کاذب میں چھپی ہوتی ہیں اور کبھی شام کے اداس رنگوں میں- فرحت عباس شاہ اور اس کی شاعری کو شام کے اداس دھندلکوں میں تلاش کرنا چاہیے-

اس کی شخصیت میں ایک سحر انگیز نرگسیت پنہاں ہے- اسے اپنے ہر شعر اور لکھے گئے ایک ایک لفظ سے غیر معمولی محبت ہے- وہ اپنی تخلیق سے بچوں کی طرح بلکہ شاید بچوں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے- معاصر شعرا کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتا، اپنے محبوب اشعار کا میر و غالب سے تقابل کرتا ہے- اپنے اشعار کے آئینہ خانے میں اپنے اندرون کا

عکس تلاش کر کے خود ہی مسحور ہوتا ہے۔ اپنی ہر تخلیق کو شاعری کے معبد میں سجا کر اس کی پوجا کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنا عاشق بھی خود ہے، معشوق بھی خود ہے اور رقیب بھی خود۔ معاصر شعری منظر نامے میں اگر کسی شخصیت میں اتنی توانائی ہے کہ اس پر ناول لکھا جا سکے تو فرحت عباس ہی ایسی شخصیت ہے۔ منصور آفاق یا علی نواز شاہ اس موضوع پر ناول تحریر کر سکتے ہیں۔ فرحت عباس شاہ کوئی سے نئی سوجھتی ہے ۔ شاعری اور الیکٹرانک میڈیا کی فتوحات کے بعد اس نے تنقید کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ تنقید کی دنیا میں داخل ہوتے ہی اس نے انکار" کیا ہے۔ اس نے انکار کی روایت برقرار رکھتے ہوئے تنقید کے معبد میں رکھے ہوئے بتوں کو زمین بوس کیا ہے۔

اس نے مغربی تنقید کے زیر اثر اندھا دھند تقلید کے رستوں پر چلنے والے نقادوں کو بتایا ہے کہ بے جڑ کے آرائشی پودے، گل دانوں کی رونق تو بڑھا سکتے ہیں مگر بار آور نہیں ہو سکتے۔ اس نے تنقید کے ساختیاتی سانچوں کو توڑ کر اس امر پر زور دیا ہے کہ تنقید کو نشوونما پانے کے لیے اپنی مٹی اور اپنی آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادراکی تنقید کا تصور نہ صرف دل چسپ اور بامعنی ہے بلکہ مشرقی تہذیب و روایات اور تخلیقی طرز احساس سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ علم طب اور نفسیات سمیت سائنس کی تمام شاخوں میں ادراک (Cognition) سے مراد عقل کا وہ استعمال ہے جس کے ذریعے انسانی دماغ کسی خیال یا حواس سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، پھر اس ادراک سے آگہی کا عمل شروع ہوتا ہے اور یہاں سے بصیرت کا عمل شروع ہوتا ہے جو تخلیقی عمل کو گہرائی اور گیرائی عطا کرتا ہے اگر تنقیدی سفر میں بھی اس ادراک کو چراغ راہ بنا لیا جائے تو تنقید کو بھی ایک معتبر اور مضبوط حوالہ میسر آ سکتا ہے۔ اردو تنقید کا تقریباً ایک صدی کا سفر ہم نے مغربی تنقید کی تقلید بلکہ نقالی میں بسر کر دیا۔ اس سفر میں ہم نے بہت کچھ سیکھا بھی مگر یہ تنقیدی تصورات ہماری دھرتی اور تہذیب سے متصادم رہے اس لیے ہمارے ہو کر بھی ہمارے نہ ہو سکے۔

اردو تنقید کی روایت میں تاثراتی تنقید کا اہم مقام ہے۔ تاثراتی تنقید کا دائرہ خاصا متنوع وسیع اور کسی حد تک بے سمت تھا۔ فرحت عباس شاہ نے معاصر تنقید کو ادراک سے جوڑ کر اسے ایک واضح اور مثبت نصب العین عطا کیا ہے۔ فرحت عباس شاہ نے ادراکی تنقید کے نظری اور عملی مباحث سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں تخلیق کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تنقید کا جوہر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

انھوں نے تخلیق اور تنقید کے ان ٹوٹ رشتے کو ادراکی طاقت سے جوڑ کر معاصر ادبی نظر نامے کو متاثر کیا ہے۔ اس لیے میں تنقید کے ادراکی دبستان کا مستقبل روشن اور تاب ناک دیکھ رہا ہوں ۔

معروف داستان الف لیلہ میں شہزادے سے کہا جاتا ہے کہ اس محل میں سات کمرے ہیں چھ کمروں کے دروازے آمدورفت کے لیے ہمہ وقت کھلے ہیں مگر ساتواں در کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ شہزادہ ساتواں در کھول کر جہانِ حیرت کا در وا کر دیتا ہے۔ معاصر ادبی منظر نامے میں چھ دروازے عافیت اور سکون کے دروازے تھے۔ فرحت عباس شاہ نے ساتواں در کھول دیا ہے۔ اب نہ جانے کتنے طلسم کدے ہم پر جہانِ حیرت وا کریں گے۔

☆☆☆☆☆

صوفیانہ لب و لہجے کا شاعر _ خالد احمد

عشق کے سفر میں فنا بقا کا، ہار جیت کا اور عاجزی سربلندی کا نام ہے۔ اس دعوے کا ایک روشن ثبوت عرضِ ہنر کی شاعری ہے۔ اردو شاعری میں جب قافلۂ عشق کے اشہب سواروں کا ذکر کیا جائے گا، تو اس میں خالد احمد نام بھی شامل ہوگا۔ خالد احمد وہ خوش نصیب شاعر ہیں، جنھیں قسّامِ ازل نے بارگاہ عرش پایہ گاہ کے والہان ادب سے نوازا۔ ان کی شاعران کا ادب نامہ اور معافی نامہ ہے۔ انھوں نے قصیدہ اور غزل کی ہیئت میں نعت کا وہ اسلوب تراشا ہے، جو ان کی اپنی ایجاد ہے۔ اس میں ہجر کی کسک بھی ہے اور وصال کی سرشاری بھی۔ جذب و کیف بھی ہے اور عشق کی سرمستی بھی۔ احتیاط بھی ہے اور اظہار بھی۔ کم علمی کا اعتراف بھی ہے اور قدرت کلام کا اثبات بھی۔ اس میں بُوصیریؒ کی اقتدا بھی ہے اور محسن کاکورویؒ کی پیروی بھی۔ انھیں اس دربار کی گدائی پر فخر ہے، جس کے مانگنے والوں کو ہمیشہ اپنی کوتاہ دامنی کی شکایت رہتی ہے۔

خالد، نجیب، گوہر، تائب، قتیل، جعفر
سب کم کنار آئے، سب بے کنار نکلے

انھوں نے اپنے ہم عصر دوستوں نجیب احمد، گوہر ہوشیارپوری، حفیظ تائب، قتیل شفائی اور جعفر طاہر کو بھی اپنے ساتھ اس قافلہ شوق کا مسافر ٹھہرایا ہے۔

قصدِ مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شانِ خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

....

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثنا گر وضو کریں

....

عجز تک ہم کو تری شان کے شایاں نہ ملا
اتنے کم مایہ فقط تیرے ثنا خواں کیوں ہیں

....

کیا میں نے کیا ہے کہ سزاوار روا ہوں
مجھ کو تو بہت ہے تری کملی کی جھلک بھی

....

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

محمد نوید ازہر

زرگُل ہوئی مری گرد بھی کہ ریاضِ عشقِ رسول ہوں
بڑی پاک خاک ہے یہ گلی، میں اسی کی دھول کا پھول ہوں

....

خالد احمد کے کلیات، عرضِ ہنر کا آغاز نعتیہ قصائد کے مجموعے تشبیب سے ہوا ہے، جس میں تین قصائد شامل ہیں۔ ان کے عنوانات اُٹھان، رود نجرات اور بادِ نوال ہیں۔ یہ عنوانات ایسے ہیں کہ پہلی نظر ہی میں توجہ کو جذب کر لیتے ہیں۔ اس مجموعہ قصائد پر مقدمہ، عربی زبان و ادب کے استاد ادیب محمد کاظم (مرحوم) کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے دوسرے قصیدے کی بہ طورِ خاص تحسین کرتے ہوئے اسے ”نعت کا الیاذہ (ILIEAD) قرار دیا ہے۔ ہر آن بہتے ہوئے دریا کی طرح وسیع، متحرک اور ہر آن اپنا منظرِ ارضی بدلتا ہوا۔“

عرضِ ہنر میں اول سے آخر تک روحانیت کی ایک برقی رَو دوڑ رہی ہے، جو رفتہ رفتہ تیز تر ہوتی چلی گئی ہے۔ اس کلیات کا اول بھی نعت ہے اور آخر بھی نعت۔ اول نعتیہ قصائد ہیں اور آخری مثنوی کی ہیئت میں سیرت طیبہ کا بیان ہے، جس میں قصیدے کا سا شکوہ اور طنطنہ پایا جاتا ہے۔ اس بیان میں سات زبانوں کے نادر الفاظ کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ جس دیوان کا اول و آخر ثنا ہو، اس کے درمیان کیا ہوگا۔ جس کی اصل ثنا ہو، اس کی فرع بھی ثنا ہوگی۔ سو درمیان میں بھی حمد، نعت، استغاثہ، مناجات اور صوفیانہ موضوعات ہیں۔ یہاں غزل کے عمومی و عصری موضوعات بھی پائے جاتے ہیں، لیکن وہ بھی اسی وحدت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ یہ ایسی حیرت انگیز وحدت ہے، جو کلاسیکی شعرا کے ہاں بھی مفقود ہے۔ بلبلِ باغِ رسالت علامہ محمد اقبال، کے علاوہ شاید ہی کسی اردو شاعر کے ہاں ایسی نُدرت آمیز وحدت کا سراغ پایا جا سکے۔

غزل تو غزل ان کے یہاں نظم کے موضوعات میں بھی صوفیانہ رچاؤ موجود ہے۔ نَم گرفتہ میں ایک نظم ”تین مقام، تین حجاب“ کے عنوان سے ہے۔ خالد احمد اس میں کہتے ہیں کہ انسان زندگی بھر تین طرح کے حجابات میں گھرا رہتا ہے، جو اس پر رازِ حقیقت کا انکشاف نہیں ہونے دیتے۔ پہلا حجاب، ”شباب“ ہے، جو انسان کو اپنے آپ سے بے گانہ رکھتا ہے اور اسے جوانی کے عالم میں اپنے مَن میں جھانکنے کا موقع نہیں دیتا۔ دوسرا حجاب اس کی ”انا“ ہے، جو اسے دوسروں میں موجود خیر و برکت تلاش کرنے سے محروم رکھتی ہے۔ جب انا قائم رہتی ہے، جو حجاب اندر حجاب ہے۔ اس ذاتِ مُطلق جو غیب الغیب ہے، تک پہنچنا، یا اس کے دیدار سے بہرہ یاب ہونا سب سے مشکل کام ہے، جو آدمی اس حجاب میں مبتلا ہے، اُس کے لیے سُنی، اَن سُنی اور دیکھی، اَن دیکھی ہے دنیا میں موجود تمام تر بے راہ روی اور گم راہی کا سبب بھی ہے یہ حجاب شباب سے زیادہ سخت ہے، کیوں کہ شباب کا حجاب، پیری میں اُٹھ جاتا ہے۔ یہ حجاب انا سے زیادہ سخت ہے، کیوں کہ کسی سانحے، یا حادثے سے دوچار ہونے کے بعد انا کا بت بھی پاش پاش ہو جاتا ہے اور انسان کو اس وسیع و عریض کائنات میں اپنی حیثیت کا اندازہ

ہو جاتا ہے۔ شباب کے حجاب کو پیروی دور کرتی ہے۔ انا کے حجاب کو ایام کی گردش اور زمانے کی ٹھوکریں اٹھا دیتی ہیں۔ دونوں حجابات کے دور ہونے کا طریقہ خود کار ہے، لیکن جو دل یا روح، خدا سے حجاب میں ہے، اس کا حجاب خود بہ خود دور ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ اس حجاب کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے آدمی فقط رضائے الٰہی کی خاطر، اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اپنے شباب کو اپنی انا کی دیوار پردے مارے۔ اگر عالم شباب میں وہ اپنی انا کو قربان کردے گا، یا بالفاظ دیگر خود کو مٹا کر خدا کے راستے میں پامال ہو جائے گا، تو اسے معرفتِ خداوندی نصیب ہو جائے گی۔

کون لگائے کا ضربِ شباب، سرِ دیوارِ انا
پہ سبیلِ خدا

عرضِ ہنر میں شامل آخری طویل مثنوی، جو سیرت طیبہ کے بیان پر مشتمل ہے، اس کا عنوان پہلی پو، پہلی پروائی ہے۔ اس کے گم شدہ اجزا کی بازیافت، قرأت، تفہیم، ترتیب اور فرہنگ سازی کے بعد اسے کلیات میں شامل کیا گیا ہے۔ اس نظم میں ایک حصہ وہ ہے، جس میں سید الشہدا، سیدنا امیر حمزہؓ کے اس انتقام کا ذکر ہے، جو انھوں نے ابوجہل سے لیا تھا جب اس نے سرکارِ ابد قرار کو جو جسمانی اذیت پہنچائی تھی۔ اس حصے کو "مرمُو رِ مرمُوز" (صدیوں کو محیط نظم کا ایک لمحہ) کا عنوان دیا ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں یہ ایک معرکۃ الآرا نظم اور غزل کا مجموعہ ہے، جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ اس میں ہفت زبانی لغات کے استعمال سے نغمگی اور صوتی حسن پیدا کیا گیا ہے۔ اس نظم کی لغات اردو، فارسی، عربی، عبرانی، ہندی، سنسکرت اور پرتگال کے الفاظ سے تشکیل پاتی ہے۔ کہیں کہیں پنجابی کے الفاظ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظم کا آغاز تاجروں کے قافلے سے ہوتا ہے، جس نے شاہراہِ ریشم کے ذریعے راستے ہمزہ میں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ اس قصے میں قبل از اسلام کے تمام مذاہب کا بھی تعارف کرا دیا گیا ہے۔ اور پھر مکہ مکرمہ کے ایک تاجر کی وساطت سے اسلام کی آمد کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔ "پہلی پو، پہلی پروائی" بنیادی طور پر ایک نعتیہ نظم ہے، جو خالد احمد کی قدرتِ تخیل کا ثبوت ہے۔ اس میں بالترتیب ولادت باسعادت، اعلانِ نبوت، تبلیغ اسلام، نزول قرآن، کفار مکہ کا جبر و ستم، ہجرت، مدینہ منورہ میں آمد، غزوات، میثاق مدینہ، معراج، فتح مکہ، زہریلا کھانا، حضور پُرنور کی وصیت اور وصال کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ، لیکن کہیں کہیں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد والے حصے میں غزل شامل ہے اور آخری حصے سے پہلے تخلیقِ کائنات، آفرینش، آدم و حوا، ہبوطِ آدم و حوا کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ یہ نظم فکری اور فنی ہر دو اعتبار سے نادرُ الوقوع ہے۔ نظم کے آخری حصے میں خ تجنیسِ حرفی (Alliteration) کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ صنعت، اصوات کے طور پر، الف بائی ترتیب سے مصرعوں کا التزام کیا گیا ہے۔ ایک مصرعے میں آنے والے تمام الفاظ ایک ہی حرف سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً: شُعلانِ

ثمراتِ ثنا تھا) نظم کی ترتیب کے بارے میں ضروری وضاحت ابتدائیے میں درج کر دی گئی ہے، جس کی بنا پر- عام قاری کے لیے اس پیچیدہ نظم کی تہہ میں اترنا مشکل رہا۔ عرضِ ہنر کی شاعری، خالد احمد کی وسعتِ مطالعہ کی خبر دیتی ہے- جلیل عالی کے بہ قول:

کئی مقامات پر زبان و بیان میں الہامی و ماورائی سائے لرزتے محسوس ہوتے ہیں- عشقِ رسول کی ایسی کیفیتیں جملہ مراتبِ وُجود میں، حقیقتِ محمدی کے پرتو دیکھ پانے والے گہرے اور گھمبیر روحانی تجربے ہی سے ممکن ہے-

تشکیک و تذبذب میں ڈوبے ہوئے شاعروں کے اِنجُز میں رہتے ہوئے، خالد احمد یقینِ کامل کی اس دولت سے کیسے مالا ہوئے؟ یہ احمد ندیم قاسمی کی صحبت کا فیض تھا، خاندانی تربیت کے اثرات تھے، اُن کے ممدوحِ گرامی حضرت شاہ حسینؒ کی زندہ کرامت تھی، شہرِ نگار سے آنے والی نسیمِ محبت کا ایک جھونکا تھا، جو ایک درماندہ اور زردرو سے لپٹ گیا اور اسے اپنی خوش بُو سے مہک بار کر دیا، یا...... کھجوروں والی سرزمین سے اُمڈ کر آنے والا ایک رحمت کا بادل تھا، جو زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں میں گرے پڑے ہوئے غریب الدیار کے سر پر برسا اور اس کی روح کے چہرے کو نکھار کر کسی اور تشنہ کام کی تلاش میں روانہ ہو گیا- اس کے بارے میں میرا کچھ کہنا محض رائے زنی ہو سکتا ہے- حاضری کو حضوری میں بدلنے کے لیے سچی تڑپ، واحد متاع ہے- اگر چہ یہ راس المال موجود ہے، تو پھر میں کیا اور آپ کیا-

مولانا جامیؒ کو یہ راز معلوم تھا، جنھوں نے کہا تھا:

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

....

اسی کا ترجمہ فیض نے یوں کر دیا:

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

....

اگر عشق کسی کی ذات یا نام ہوتا، تو پھر یہ کلیات، ایک سوٹڈ بوٹڈ، کلین شیو، طبعیات دان (ایم ایس فزکس) کی تخلیق نہ ہوتا، بل کہ جبہ و دستار کے حامل اور مصنوعی ہیئتِ گدائی کے مالک، عصا بدستوں اور لٹھ برداروں کی وراثت ہوتا، جو اسے چھپوا کر مذہبی نمائش گاہوں میں بیچتے- وہ آٹھ سو روپے کے بجائے، بارہ سو بتیس صفحات کی اس کتاب کی قیمت، کم از کم پانچ ہزار روپے مقرر کرتے، وہ بھی خاص مواقع کے لیے، جب کہ عام مواقع پر اس کی قیمت خریدار کی جیب کا جائزہ لے کر مقرر کی جاتی- عشق، انسان کو سُود و زیاں سے بے نیاز کرتا اور تازندگی ایک ہی دروازے کا نیاز مند بناتا ہے- احسان اُس دروازے کا ہے، جو اپنے سائل اور صداکار کو قبول کر لیتا ہے- ان محاسن کے ہوتے ہوئے اگر ہم خالد احمد کو اردو غزل اور نظم کا صوفی شاعر مان لیں، تو ناقدینِ ادب کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے- صوفی شاعر کے لیے اصطلاحاتِ تصوف کا سہارا لینا ضروری نہیں ہوتا، بل کہ صوفیانہ اندازِ فکر کا حامل ہونا ضروری ہوتا ہے- یہ مزاج کُلبۂ احزاں میں رہنے والوں کا امتیاز ہے،

فارغ البال لوگوں کے مشغلے اور ہوتے ہیں۔ عرضِ ہنر ظاہری اور معنوی کمالات سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ آراستہ اس معنی میں کہ اس کی طباعت آفسٹ پیپر پر، نستعلیق کے بہترین سوادِ خط میں، دیدہ زیب نقش و نگار کے ساتھ کی گئی ہے اور پیراستہ اس معنی میں کہ ہر چیز جہاں چاہیے تھی، وہاں رکھی گئی ہے، عرضِ ہنر میں پروف ریڈنگ کی اغلاط نہ ہونے کے برابر ہیں، کیا یہ قابلِ داد نہیں ہے۔

اب چند پسندیدہ اشعار:

پلکوں کی ہتھیلیوں پہ خالد
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

....

نہ ظلمتِ شب میں کچھ کمی ہے، نہ کوئی آثار ہیں سحر کے
مگر مسافر رواں دواں ہیں، ہتھیلیوں پر چراغ دھر کے

....

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے، نیکیاں رہ گئیں

....

اب تک تری یادیں میری آنکھوں کی چمک ہیں
یہ نم بھی کوئی چھین نہ لے دیدۂ تر سے

....

غبارِ غازۂ رُخ اُڑ نہ جائے
ہوا، گُل رنگ چہروں کی عدو ہے
بہاؤ کے کٹاؤ پہ نظر رکھ
تری کُٹیا کنارِ آبِ جُو ہے

....

بکھر گئیں سبھی سطریں گلِ گماں کی طرح
کتابِ ہجر کھلی، مطلعِ خزاں کی طرح

لباسِ خاک میں سو گُل چھپائے پھرتے تھے
ہم اپنے گرد تھے، دیوارِ گلستاں کی طرح

....

خون سے جلتے چہرے، تن میں سلگتی ہڈیاں
سانول ویہڑے آیا، ویکھوں چُک چُک اڈیاں

....

سرخ ہوئے پھر نور نمو سے، پھولوں کے رخسار
عکسِ جمالِ یار سے ٹھہرا، ہر چہرہ گلنار

سلام کے چند اشعار:

ہر سمت زوال موج زن تھا
سورج بھی غروب ہو رہا تھا
ہر سمت ملال موج زن تھا
عیسیٰ مصلوب ہو رہا تھا
یوسف معتوب ہو رہا تھا
کس رنگ کے رنج سہہ رہا تھا
پانی یعقوب ہو رہا تھا

....

ہر مسلکِ دیں سُلک بہ جاں ہے اسی در سے
یہ گلشنِ زہرا ہے، امامت کا وطن ہے
ہنس دیجے کھل کر بھی تو آنسو نکل آئیں
کیا کہیے کچھ ایسی روشِ چرخِ کہن ہے
آنسو ابھی سر پھوڑ رہے ہیں رگ و پے میں

....

اک حشر سا برپا پسِ دیوارِ بدن ہے
اترا نہیں دُلدُل سے مہِ شامِ غریباں
وہ، رو میں ابھی تک سرِ رہوارِ سخن ہے
اک تیر ہے پیوستِ گلو آج بھی خالد
اک درد ہے سینے میں کہ اعصاب شکن ہے

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد مشرف حسین انجم کی نعتیہ شاعری......اجمالی جائزہ

ڈاکٹر مشرف حسین انجم سرگودھا کا روشن ستارہ ہے جنھوں نے اس فضا کو اپنی حمد و نعت کی تخلیقات سے روشن کر رکھا ہے۔ ان کی شخصیت میں عاجزی وانکساری، ادب سے شغف اور رسولؐ کی محبت سے لبریز دل ان کا پہلا حوالہ ہے۔ طبیعت میں انکسار کے ساتھ ان کی زندگی کے کئی روپ ہیں یہ اچھے نعتیہ شاعر بھی ہیں اور ادب شناس بھی ہیں۔ جو صفت ان کی شخصیت کا سنگھار ہے وہ تہذیب ہے۔ یہ ادب دوست ہی نہیں ادب شناس بھی ہیں۔

مشرف حسین انجم نے اپنا سخن میں میدان حمد و نعت کو چنا اور تا عمر اسی میں طبع آزمائی کی اور چالیس سے زائد کتب تخلیق کر ڈالیں جو ان کے لیے سعادت کی بات ہے کہ انھیں آقا دو جہاں سے والہانہ عقیدت نے ان سے اتنا کام کروایا۔ ان کے نعتیہ کلام پر ڈاکٹر فضیلت بانو رقمطراز ہیں۔

"ڈاکٹر مشرف حسین انجم دی نعت گوئی اوہناں دے عشق رسولؐ دا اک زندہ ثبوت اے۔ اوہناں دے انگ انگ وچوں نعت دی خوشبو پھٹ دی اے۔ لگدا اے کہ رب سوہنے نے اوہناں نوں مدحت رسولؐ واسطے ای پیدا کیتا اے۔"

نعت کہنا یا نعت کا پڑھنا مسلمان کی حیثیت سے باعث برکت اور باعث ثواب تصور کیا جاتا ہے۔ نعت کہنے والوں کے نعتیہ کلام میں رسولؐ سے والہانہ محبت وعقیدت کا اظہار نمایاں پایا جاتا ہے۔ نعت کی خوبی یہ ہے کہ یہ جب رسولؐ کی محبت میں ڈوب کر کہی جائے جو کچھ کہا جائے وہ اس کے دل کی آواز ہو۔

نعت کہنا ایک مستجاب عمل ہے اور یہ دل کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ اگر دل میں عشق رسولؐ کی شمع روشن ہو تو اللہ اپنے حبیب کی محبت کو اجاگر کیے جاتا ہے۔

نعتیہ اشعار بعض اوقات پڑھنے والے پر اس قدر شدید اثر ڈالتے ہیں کہ وہ اندر سے تڑپ کر رہ جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ از خود اپنے آقا و مولا کی شان بیان کر رہا ہے۔ ڈاکٹر مشرف نے خوب نعتیہ کلام لکھا ہے۔ زیر نظر کتاب "سلاماں دی خوشبو" جس میں حمد نعت اور قطعات شامل ہیں۔ بہت عقیدت سے آقا دو جہاں پر سلام پیش کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان انتہائی سادہ اور محبت سے لبریز ہے۔

سلام اُس مہرباں تے جس دا نورانی قبیلہ اے
سلام اُس مہرباں تے جیہڑا بخشش دا وسیلہ اے
سلام اُس مہرباں تے جس دا احمد نام سوہنا اے
سلام اُس مہرباں تے جس دا ہر اک کام سوہنا اے
سلام اُس مہرباں تے جیہڑا سارے جگ نوں چمکاوے
سلام اُس مہرباں تے جیہڑا سارے جگ نوں مہکاوے

کومل شہزادی

سلام اُس مہرباں تے جیہڑا دل ہے کارواناں دا
سلام اُس مہرباں تے جیہڑا دل ہے کل جہاناں دا

....

انہوں نے نعتیہ شاعری کے ساتھ حمدیہ شاعری بھی قلمبند کی۔ بندے کی حقیقی بندگی بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم اور بیان کرے۔ خدا سارے جہانوں کا معبود ہے۔ اللہ کی ذات وصفات اور احکام کو ہر ذی روح مانتا ہے اور تمام بندے اللہ کو پکارتے ہیں کیونکہ وہی حقیقی معبود ہے وہی ادب کا ہنر بھی عطا کرتا ہے۔ موصوف نے حمد باری تعالیٰ کے ساتھ نعتیہ گلدستہ عقیدت بحضور سرورِ کائنات محمد رسولؐ میں پیش کیا۔ ہمارے پیارے نبی محسن انسانیت ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی سب عظیم نعمت اور بہت بڑا احسان وحی الٰہی اور روشنی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے جیسے اللہ تعالیٰ نے انسان کو آنکھیں اور بصارت عطا فرمائی ہے۔ موصوف نے بڑے خوبصورت پیرائے میں عقیدت ومحبت کے ساتھ عشقِ مصطفیٰ اور محبت مصطفیٰ کا مظاہرہ کیا ہے۔

مدینے کی معطر فضا، اور ٹھنڈی ہوا ہر کسی کو اپنائیت کا ایسا احساس دلاتی ہے کہ کسی کا وہاں سے واپس جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی کی محبت نے اپنے دامن میں یوں بسا لیا ہو کہ بس ساری زندگی وہیں گذار دینے کی تمنا دل میں سما جاتی ہے۔ لیکن دستورِ زمانہ اور دستورِ تقدیر بھی تو ماننے پڑتے ہیں۔ موصوف کے دل کی بھی یہی کیفیت ہے ساری زندگی اسی کوچہ ساقیٔ کوثر میں بیت جائے چودہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی اگر کسی عاشق رسول کے سامنے مدینے کا نام لیا جائے تو تڑپ اٹھتا ہے۔ اشکوں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ آج بھی محراب ومنبر سے یہ آوازیں کانوں میں رس گھولتی سنائی دیتی ہیں۔ محمدؐ کا روضہ قریب آ رہا ہے بلندی پہ اپنا نصیب آ رہا ہے۔ جب مسجد نبوی کے مینار نظر آئے اللہ کی رحمت کے آثار نظر آئے محبت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ جس سے محبت کی جائے، اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے بھی محبت کی جائے اور بالخصوص جس سے محبوب کو محبت ہو، اس سے تو انتہائی محبت وعقیدت رکھی جائے۔ ڈاکٹر مشرف حسین انجم کو مدینے کی سرزمین سے کس قدر محبت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب ''خوشبوئے مدینہ'' میں ان کی مدینہ سے محبت شدت سے نظر آتی ہے۔ مدینہ سے محبت ان کے کلام سے کچھ اس انداز سے جھلکتی ہے۔

دنیا کی ہواؤں میں ہے خوشبوئے مدینہ
رحمت کی گھٹاؤں میں ہے خوشبوئے مدینہ
انجم کی صداؤں میں ہے مدحت کی محبت
انجم کی دعاؤں میں ہے خوشبوئے مدینہ
عظمت انسان دیکھی آپ کے دربار پر
نور کی مکان دیکھی آپ کے دربار پر
چشم عالم نے عقیدت کی نظر سے آج تک
خوشبوئے قرآن دیکھی آپ کے دربار پر

....

مری اکھیاں دے وچ رہندا اے جلوہ ساوے روضے دا
میں دنیا دی صبا وچ وی سنہری جالیاں ویکھاں
میں جدوں نعت لکھدا آں نظر سرسبز ہو جاندی
میں آقا دی ثنا وچ وی سنہری جالیاں ویکھاں

کتاب ''اکھراں وچ خوشبوواں'' جس میں حمد کے ساتھ نعتیں اور قطعات شامل ہیں۔ خدا کی بے شمار نعمتوں اور رحمتوں کا اظہار بھی یہ بہت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ یہ جذبہ محض لکھنے کی حد تک نہیں بلکہ پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل کو خدا کی تخلیق اور محبت کے لیے ہی چنا گیا ہے جس کا گہرائی سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

سدا دل تے تری رحمت دی خوشبو آندی رہندی اے
مری جھولی ترے نغمے ازل توں گاندی رہندی اے

....

ان کا اپنے رب پر اس قدر یقین کامل ہے کہ اپنی ہر تکلیف سے چھٹکارا اسی کے کرم سے ہوتا ہے۔ موصوف اپنی تمام الجھنوں کو محض سلجھاتا ہے تو وہ خدا کی رحمت سے ہے۔ خدا کی رحمت کو اپنی زیست میں ان کا کامل یقین ہی ان کی اصل کامیابی کا ضامن ہے۔

مری تکلیف تے دُکھاں دی ساری دُھند چھٹ جاندی
تری رحمت مری الجھن دا مکھ سلجھاندی رہندی اے

....

اگر درود شریف کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر کھل کے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اپنے معنوں اور حقیقت دونوں کے اعتبار سے ایک دعا ہے۔ ایک ایسی دعا جس میں ہم رب کائنات سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ رسولِ اکرمؐ پر مزید رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ درود شریف کی برکت و فضیلت کے تاریخ میں بہت سے واقعات رقم ہیں فقیروں سے لے کر بادشاہوں تک ہزاروں لوگ درود شریف کی برکات سے فیض یاب ہوئے بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام خوش بختی کی علامت ہے۔ درود پاک پر اظہار خیال اس انداز میں کرتے ہیں۔

درودواں دی فضا وچ جیہڑا ہر ویلے مہک والے
بشر او دل دے وچ پاوے نبی دے درد دی رشنائی

....

ان کی نعتیہ شاعری سادگی انتہائی دردمندی اور ملاست سے مملو ہے۔ ان کے کلام میں جذب وکیف کی منزلیں بھی کوثر و سنبیل کی روانی بھی واقعاتی جدت بھی ہیاور جذبوں کی جدت بھی ہے۔ جب انسان اپنا مافی الضمیر منتقل کرنے کا اہل ہو جائے تو ضمیر کو بیدار کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتا ہے اور جب ضمیر بیدار ہو جائے تو خلافت اللہ کا حقدار یہ انسان واقعی خالق کی نیابت کا حق ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کی رسولؐ پاک سے عقیدت سے لبریز خیالات زندہ و تابندہ رہیں ایک قلم کار ایک نظریہ ہوتا ہے اور نظریہ ہی انسانیت کی معراج ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں اسی توانائی اور جذبے سے ہمیشہ معمور رکھے۔

ڈاکٹر احسان اللہ طاہر ان کی نعت نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر مشرف حسین انجم ہوراں دی نعت دی سادگی ہی اوہناں دا تازہ پن اے اتے ایہو تازگی اوہناں دی نعت نوں پنجابی ادب وچ اک اچیرا تے وکھرا مقام عطا کر دی اے۔''

☆☆☆☆☆

سماجی شعور میں ڈوبا ہوا نظم نگار

ڈاکٹر شاہد اشرف سے میری ملاقات ایک مشاعرے میں ہوئی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے ہماری محض جان پہچان دوستی میں ایسے بدلی کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ میری کوشش ہے کہ نظم کے تاریخی پسِ منظر کا راگ الاپنے کے بجائے ڈاکٹر شاہد اشرف کی نظم گوئی پر گفتگو کا آغاز کروں۔ جتنا میں ڈاکٹر شاہد اشرف کو جانتا ہوں وہ عجز واخلاص کا مجسم اظہار ہیں۔ شاہد اشرف کا اندازِ فکر انقلابی رجحانات میں رچا بسا ہے۔ وہ انتہائی نرم خوئی سے گہرے سماجی شعور میں ڈوب کر نیا جہانِ معنی خلق کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں انقلابی گونج استعماری رویوں پر طنز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ سماجی ومعاشرتی ناہمواریوں پر فکری استدلال کے ذریعے صدائے احتجاج بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ انفرادی سطح پر انسانی نفسیات کو اپنی نظموں کے وسیع کینوس پر بڑی چابکدستی سے اتارتے ہیں۔ ان کی نظمیں روزمرہ انسانی زندگی میں جنم لینے والے المیوں کا فکری اظہار ہیں۔ ان کا پیرایۂ اظہار بہت منفرد ہے۔ جس میں جدتِ ادا اور ندرتِ تخیل موجود ہے۔ جو پڑھنے والے کے قلب واذہان میں فکری بالیدگی پیدا کرتا ہے مثلاً ان کی نظم عزیٰ، درگا اور سیریں، میں وہ فرضی دیویوں کی اندھی مذہبی تقلید کو انسانی المیہ قرار دیتے ہیں اور مذہبی انسانی استحصال پر گہرا طنز کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی نظم ''پہاڑی راستے پر ایک قیام گاہ''، میں Nostalgia اپنے بامِ عروج پر ہے اور تحیرات کا در کھلتا دکھائی دیتا ہے۔

''اک جگہ سرگوشیاں مٹی پڑی ہیں
تیز بارش سے سُلگ کر جلنے والے
اک بدن کی راکھ
جیسے جم گئی ہے
ہونٹ ملنے سے تنفس رک گیا ہے''

....

اپنی نظم ''تم کہاں ہو''، میں وہ اپنے شاگرد کی ناگہانی موت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جسے

انصر منیر

پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ اپنے ساتھ وابستہ لوگوں کو اپنی ذات کا حصہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اسی طرح انہوں نے اپنی کتاب کا انتساب اپنے مرحوم چھوٹے بھائی کے نام کیا ہے۔ یہ قدم ان کے انسانی رشتوں کے بارے میں خیالات کو اجاگر کرتا ہے۔

دعا کو ہاتھ اٹھتے ہیں تو چاروں اور پھیل خوشبو جاتی ہے۔
تمہاری مسکراہٹ یاد آتی ہے،،

اپنی نظم ''کمرۂ امتحان'' میں وہ رقمطراز ہیں کہ کس طرح انسان تقدیر کے ہاتھ میں کھلونا بن کر اس امتحان گاہ حیات میں ان دیکھی منزلوں پر رواں رہتا ہے۔

اسی طرح اپنی نظم ''میرے بیٹے نے پہلی بات کی ''میں وہ بیٹے جیسی نعمت پر شکر گزاری کے جذبوں سے سرشار دکھائی دیتے ہیں

شجر پر نام لکھ کر میں نے شاہد
وہاں جھولے کی رسی باندھ دی ہے۔

نظم ''کفن پوش جلوس'' میں وہ مغرب نواز حکمرانوں کو للکارتے دکھائی دیتے ہیں۔

''کوٹھ سکون آباد'' میں سندھ کے وڈیرہ ازم کو نظم کرتے ہیں اور ایک سندھی لڑکی کے ٹوٹتے بکھرتے خوابوں کی المیاتی ترجمانی کرتے ہیں۔

نظم ''ڈائری'' میں ایک شاعر کی کم مائیگی کو صفحۂ قرطاس کی زینت بناتے ہیں۔

نظم ''ایک منظر'' میں وہ ایک غریب گھرانے کے گھر کے آنگن میں ہونے والے واقعات کو ایک بے رحم حقیقت نگار بن کر بیان کی تازگی عطا کرتے ہیں۔

اسی طرح نظم ''وادیٔ کشمیر'' میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو انتہائی سہل نگاری سے نظم کی شکل دیتے ہیں۔

''ایک لیڈر کی موت پر'' نظم میں وہ بے نظیر بھٹو کے ناحق قتل کو پاکستانی سیاست کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے ہیں۔

ان کی نظم ''دریائے اردن'' کے کنارے سے، غزہ کی صورت حال کا نوحہ ہے۔

''اگر ہم مل کے پتھر پھینکتے جائیں
تو پورا تلِ ابیب ان پتھروں میں دفن ہو جائے''

''رنگ خوابیدہ پڑے ہیں''، نظم کتاب کا عنوان بھی ہے جس میں انہوں نے مشہور مصور گل جی کے قتل کو رنگوں کی خوابیدگی سے تعبیر کیا ہے

''رنگ خوابیدہ پڑے ہیں
اس لیے تصویر کو اونگھ آ گئی ہے''

وہ نظم ''پاپولیشن ڈے'' میں آبادی کے مسائل کو اہم مسئلہ قرار دیتے ہوئے ایک قومی عیاض کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

نظم ''سمٹتے پھیلتے نقطے'' میں کلوننگ کا تذکرہ ان کی جدت شناسی کا غماز ہے۔

''درختوں پر بہت سے نام لکھے ہیں'' جیسی نظم میں ان کا انداز رومانوی ہے۔

''بھکاری'' نظم میں کشکول میں سکہ گرنے کی آواز ایک قاتل کے لیے بھی حرف دعا ثابت ہوتی ہے۔ کا بیان ہے۔

نظم ''نئے گھر میں پہلا دن'' ایک انسان کے نئے گھر میں منتقل ہونے کی خوشیوں کی روداد ہے

یہ کوئی فلمی سین نہیں نظم ''ایک اداکار کی شادی''

سے متعلق ہے جسے پڑھنے کے بعد ان کا رومانوی طرزِ احساس نمایاں ہوتا ہے۔

"تجھ کو میر سے نسبت ہے۔

فیض رقیب سے تیری بابت پوچھے"

مونا لیزا کی مسکان۔ تو آنکھوں کا مرکز۔ تیرا ایک جہان۔

نظم "سکے" اور "ہجرت" میں وہ مسلمانوں کے ہندوستان میں شاندار ماضی کو یاد کر کے رنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔

نظم "بہت سے لوگ غائب ہو گئے" میں عالمی اور لوکل ایجنسیوں کے بے ایمانہ کردار کو بے نقاب کرتے ہیں۔

"ایک چھتنار کے نیچے کھڑا ہوں" نظم ان کی نباتاتی سوچ کی عکاس ہے۔

ان کی نظموں کے عنوانات جیسے کہ "ابھی رنگ رنگیلے ہیں" "گلِ لالہ" "تجاوزات" "مسنگ پرسنز" زندگی سے جڑے ہوئے مضامین ہیں۔

نظم "عید اور کرسمس" انھیں ایک مذہبی روادار کے طور پر ہمارے سامنے لاتی ہے۔

نظم "پرائیویٹ سیکورٹی گارڈ" میں ایک چوکیدار کی نفسیاتی صورت حال کا بے لاگ تبصرہ موجود ہے

ڈاکٹر شاہد اشرف کی نظموں کے موضوعات میں تنوع بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی کثیر الجہت فکر میں نفسیاتی و تجزیاتی جولانیاں ایک سنجیدہ قاری کی نفسیات کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ وہ اپنی خیال آفریں نظموں کے ذریعے صرف انفرادی انسانی کیفیات سے روشناس نہیں کرواتے بلکہ عالمی انسانی المیوں کی طرف بھی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔

ان کی نظموں کے موضوعات روزمرہ زندگی کے مسائل اور انفرادی انسانی ذہنی کشمکش کا بے ساختہ اظہار ہیں۔ وہ جہاں فیصل آباد کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے اپنے شاگرد کی موت کو اپنے سخن سے جاوداں کر دیتے ہیں۔ وہیں دریائے اردن کے کنارے گولیاں کھاتے بچوں کی فریاد جیسی حقیقتیں ان کی نظموں میں پورے رنگ اور آہنگ سے جلوہ افروز ہیں۔

ڈاکٹر شاہد اشرف ایک سنجیدہ فکر اور پُرتحمل لہجے میں گندھے ہوئے دل پذیر اسلوب کے حامل نظم گو ہیں۔ وہ زندگی کا مطالعہ زندگی میں ڈوب کر کرتے ہیں۔ اور ذاتی کرب اور معاشرتی آشوب کو انتہائی سہل انداز میں اوراق کی زینت بنا دیتے ہیں۔

فنی و فکری اعتبار سے ڈاکٹر شاہد اشرف نے نئے امکانات کے در وا کر دیئے ہیں ان کی نظموں میں سادگی و پرکاری اور سہلِ ممتنع کا رنگ پوری آب و تاب سے موجود ہے۔ وہ ایک مستند نظم گو ہیں جو زندگی کے تلخ سماجی و معاشرتی حقائق سے روبرو ہوتے ہوئے چپ اوڑھنے کی بجائے بے باکی سے انھیں اظہار کا پیرہن عطا کرتے ہیں۔

میں انھیں عصرِ حاضر کے ادبی منظر پر والہانہ انداز فکر کا حامل نظم نگار گردانتا ہوں۔ خدائے بزرگ و برتر ان کے جذبۂ اظہار کو استقامت عطا کرے اور وہ سماجی شعور میں ڈوبی ہوئی اور اعلیٰ و ارفع مضامین میں گندھی نظمیں لکھتے رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

کلیم خارجی کے افسانہ سوکھا پیڑ کا تنقیدی جائزہ

دور حاضر میں اگر افسانہ نگاروں کا ذکر کیا جائے اور بالخصوص خیبر پختونخوا میں افسانہ نگاروں کا ذکر کیا جائے تو کلیم خارجی کے بنا افسانہ نگاروں کی فہرست ادھوری رہ جائے گی۔ دور حاضر میں کلیم خارجی ان چند بڑے نامور ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں، جو جذبات، احساسات اور ترجمانی کے مصداق پر پورا پورا اُترتے ہیں۔ کلیم خارجی مادہ پرستی اور بے حسی کے دور میں ایسا لکھاری ہے جو معاشرے اور دنیا کو طوائف نہیں بننے دیتا۔

کلیم خارجی کا افسانہ ”سوکھا پیڑ“ ایک ایسا افسانہ ہے جس کی کہانی میں ساز انا الحق کی نغمگی بولتی ہے۔ اس افسانے کا موضوع ”اخلاقیات کی پستی“ اور ”طبقاتی کشمکش“ ہے۔ اس میں چھاونیوں کا منظرنامہ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ وہ سب آنکھوں دیکھا معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ ”سوکھا پیڑ“ شروع ہی سے مضبوط قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ جوں جوں افسانہ آگے بڑھتا ہے۔ پڑھنے والے کے دل ودماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم ہوجاتا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار ”ماجو“ ہے جو انگریز فوجی چھاؤنی میں ایک ادنیٰ ملازم کا بیٹا ہے افسانہ ”سوکھا پیڑ“ کی کہانی دراصل اخلاقی پستی کی کہانی ہے جہاں انگریز چھاؤنی کے اندر سویلین کو بیچ، گھٹیا اور ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ افسانے کا آغاز منظر نگاری اور جزئیات نگاری سے شروع ہوتا ہے۔ کلیم خارجی یوں رقم طراز ہے۔ ”چھاؤنی میں رہنے والے لوگ تقریباً سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ عزت نفس سے عاری خوف کے عادی، بزدل، خوشاد، چغل خور، اور حاسد، نیکی، خلوص، اور آزادی سے غافل یہ لوگ بالکل ان ہی لوگوں جیسے ہوتے ہیں۔ جو برصغیر میں انگریزوں کی فتح اور حکومت کے بعد غلام بن کر زندہ رہے ان لوگوں کے آثار کسی بھی چھاؤنی میں سول بستی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انگریز چھاونیاں بنا کر اس میں اپنا نظام اور کارندے زندہ حالت میں چھوڑ گیا ہے فرق اب یہ ہے کہ وہ کچے کچے ڈربہ نما مکان جن میں انگریز اپنے گھوڑے رکھا

نوید عائل

کرتے تھے ان میں اب ادنیٰ ملازم اپنے بڑے لشکر نما خاندان سمیت رہتے ہیں۔ ”ہمارے ہاں ادبی روایت اتنی مضبوط نہیں رہی اس لیے ہم کسی مختلف سوچ قبول کرنے سے گھبراتے ہیں مگر کلیم خارجی اس کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک ادیب اور اصل دانشور کا کردار ادا کرتا ہے چھاؤنیوں میں طبقاتی کشمکش اور افسر شاہی اتنی عروج پر ہوتی ہے کہ جہاں ادنیٰ ملازم یا سویلین کی بے توقیری ہوتی ہے جب کہ ملک کے ان محافظوں کے درمیانی انسانیت ذلیل ہوتی ہے اس لیے کلیم خارجی ”سوکھا پیڑ“ میں آگے لکھتے ہیں کہ

”دو شہر آپس میں بہت سا تضاد اور فرق رکھتے ہیں لیکن ان کی چھاؤنیاں اپنی تمام جزئیات اور کلیات میں ایک سی ہوں گی۔ وہاں ہر آدمی کی پہچان سول اور فوجی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ سول ایک حقیر، ناقابل عزت و ناقابل اعتبار مخلوق ہے جسے تکبر، نفرت، رعب اور طاقت کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ فوجی جیسے مجاہد کے برعکس معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

دراصل کلیم خارجی ”مجموعہ گھٹیا آدمی“ میں افسانہ ”سوکھا پیڑ“ میں ایک ایسے کالونی یا طبقے کی نشاندہی کی ہے جو اپنے عہدے اور رتبے کے زعم میں نچلے طبقے کو نیچ اور گھٹیا سمجھتے ہیں یہ کالونی انگریز فوجیوں کی ہے۔

جہاں غیر فوجی کو ہمیشہ گھٹیا، کمتر، بے کار اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے تو دو دنیائیں آباد ہوتی ہیں۔ ایک فوجی کی اور دوسری عام آدمی کی۔ یہ لوگ احساس برتری میں شکار اس قدر گر جاتے ہیں کہ گھٹیا پن پر اُتر آتے ہیں۔ ”پتلون والا ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے سر کہہ کر پکارا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنی ذہانت، لیاقت اور طاقت میں زمین پر دوسرے تمام انسانوں سے افضل ہے۔“

برتری کی خواہش رکھنا نفسیاتی اور عمرانیاتی مسئلہ ہے۔ بعض لوگوں کی نفسیات میں یہ شامل ہونا ہے کہ وہ دوسروں پر قابض ہونا چاہتا ہے وہ دوسروں پر حکم چلانا چاہتا ہے وہ اس معاشرے میں اپنی بہتر سے بہتر تصویر پیش کرنا چاہتا ہے چاہے وہ تصور اسے کسی کی عزت یا خون کے رنگ سے کیوں نہ بنانی پڑے۔

شہرت کی بھوک ہم کو کہاں لے کر آ گئی
ہم محترم ہوئے بھی تو کردار بیچ کر

یہ لوگ ہر حوالے سے اپنے آپ کو نچلے طبقے سے افضل اور اعلیٰ رکھنے کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔ اپنے رہن سہن، لباس، خوراک الغرض زندگی کی ہر فعل وہ اپنی برتری ظاہر کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن

ہے کہ اپنے گھروں میں فرق نہ کریں۔

رہائش کے اعتبار سے چھاؤنی میں طبقوں کا نہایت خیال رکھا جاتا ہے۔ اعلیٰ اور گھٹیا افراد کی اپنی اپنی رہائش گاہیں جن کے درمیان اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی فرق کی بلند و بالا دیواریں کھڑی ہیں۔ بنگلے اپنے سائز کے اعتبار سے رہنے والے کے مرتبے اور اختیار کی نشاندہی کرتے ہیں۔''

ان لوگوں کی زندگیوں میں غربا کا کردار محض ایک مداری کا ہوتا ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ انھیں خوش کرنے بہلانے میں مشغول رہتے ہیں۔ بس کسی چیز کی اہمیت ہے تو صرف عہدوں کی اور اسی حساب سے ان کی بنگلے اور رہائش گاہیں ہوتی ہیں جب کہ جو بندہ جتنا بڑا عہدہ رکھتا ہے اتنا ہی گھٹیا اور نیچ ہوتا ہے۔

''ان میں عام سے سپاہی ہوتے ہیں جب کہ ملازمت کو چار پانچ سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہوتا ہے۔ ان کا کام سارا دن افسروں کو ''سر۔ سر'' کہنا ہوتا ہے ان کا وجود افسروں کی افسری کی تقویت اور تسکین کے لیے ہوتا ہے یا سلیوٹ مار کہ یہ سمجھتے ہیں کہ بہت بڑی قومی خدمت سرانجام دی محض سویلین فوجی آفیسر کی نظر میں حقیر نہیں ہوتا بلکہ نو وارد سپاہی جو ابھی نیا بھرتی ہوا ہے پانچ چھ سال تک اس کی زندگی کا مقصد یہ سکھایا جاتا ہے کہ پتلون والے بڑے افسر کو ''سر'' پکارا کریں ان کو ڈسپلن کے نام پر گویا غلام بنایا جاتا ہے اور سپاہی حضرات بھی کھولوں کے بیل کی طرح بے بسی کے ساتھ دائرہ میں گھومتے ہیں اور اپنے آقا کو ''سر'' کہہ کر یا سلیوٹ مار کر سمجھتے ہیں جیسے ہم نے قوم کی بڑی خدمت کی۔

''تھوڑی دیر بعد گاڑی آئی ایک سپاہی نے نیچے اتر کر سیڑھی لگائی اور چڑھنے والوں میں ایک نیا اور اجنبی لڑکا تھا چنانچہ سپاہی نے مجھے روک لیا اور پوچھا تمھارا نام کیا ہے؟ باپ سول یا فوجی؟ میرا جواب سننے کے بعد اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے کہا پیدل آؤ یہ تم لوگوں کے لیے نہیں۔''

''ماجو'' ایک سول آدمی کا بیٹا ہے انھیں اتنا حق اور معاشرتی وقار بھی حاصل نہیں کہ تیز بارش سے بچنے کے لیے دوستوں کے کہنے پر بس میں سکول تک جا سکتے کیوں کہ اس میں جانے کے لیے ضروری ہے کہ تمھارا باپ ایک پتلون والا انگریز ہو وگرنہ شدید اور مسلسل بارش میں تم مر کیوں نہ جاؤ تمھیں اس طرح تیز بارش میں ہی جانا پڑے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بے حس جگہ پر انسانی اقدار کی کیا صورت حال ہوتی ہے۔'' اس کا نام ماجو ہے یہ کچی بستی میں رہتا ہے یہ سنتا تھا کہ آدمی مشتعل ہو کر درخت کے بالکل نیچے آ گیا اور چیخنے

ہوئے بولا"او بے غیرت کتے کے بچے اترو"
میں نے بڑی ہی بے بسی کے ساتھ حیدر کی
طرف دیکھا۔

جس طرح یہ نچلے طبقے کو تیہ سمجھتے ہیں اسی طرح ان کے لیے زبان بھی الگ ہی استعمال کی جاتی ہے جب حیدر عباس اور ماجو دونوں درخت پر چڑھتے ہیں۔ تو ایک آدمی حیدر (فوجی آفیسر کا بیٹا) کو آرام سے اتار لیتا ہے، مگر جیسے ہی اسے علم ہوتا ہے کہ دوسرا لڑکا مزدور کا بیٹا ہے تو اس کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ بے غیرت...... کتے کے......

"اس نے حیدر کو طعنہ دیتے ہوئے ملامت کیا،تم اس گھٹیا نسل کے دو ٹکے کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ مل کر میل جول نہ رکھو تم ایک فوجی آفیسر کے بیٹے ہو"

یہ لوگ خود پسندی میں اس قدر گر جاتے ہیں کہ اپنے بچوں کو یہ غرور تکبر سکھاتے ہیں کہ غریب لوگوں سے میل جول نہ رکھو ورنہ اس سے ایک فوجی کے ریپوٹیشن پر آنچ آتی ہے اس لیے ایک گھٹیا سپاہی ایک فوجی آفیسر کے بیٹے کو ایک غریب سویلین کے سامنے اس کی توہین کرتا ہے کلیم خارجی کا وصف جو آپ کو منفرد و ممتاز بنا دیتا ہے وہ ان کے افسانوں کا کہانی پن ہے جو "سوکھا پیڑ" میں بھی نمایاں ہے ان کے افسانے میں کہانی واقعاتی نہیں کرداری ہے جس میں مرکزی کردار کے ساتھ ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ افسانہ سوکھا پیڑ میں واحد متکلم کا صحیح استعمال ہوا ہے۔ کلیم خارجی نے افسانے میں عام کرداروں کے ذریعے استعماری قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کروایا ہے آپ عام انسانوں کا مقتدر غاصبوں کے خلاف آواز حق بلند کرنے پر اُکساتے ہیں۔ "سوکھا پیڑ" میں وحدت تاثر نمایاں طور پر موجود ہے جس کی وجہ سے قاری کہانی کو پڑھتے ہوئے تھکتا نہیں۔ افسانے کا پلاٹ سادہ، کردار بہترین، کہانی گہری اور اسلوب سادہ و سلیس ہے۔

"سوکھا پیڑ" میں افسر شاہی کے رویوں سے بحث کی گئی ہے ساتھ ہی مقتدرہ اور ایلیٹ کلاس کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ مقتدر کس طرح نچلے طبقے کا استعمال کر رہا ہے۔ کلیم خارجی لوگوں کو بغاوت پر اکساتے ہیں۔ وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ کس طرح کوئی تمھارے بنیادی حقوق پر قابض ہے کلیم خارجی ان قبضہ مافیا کے خلاف لوگوں کو آواز حق بلند کرنے پر اُکساتے ہیں۔

"سوکھا پیڑ" گوناگوں خصوصیات کی بنیاد پر کلیم خارجی کے افسانوی مجموعہ "گھٹیا آدمی" کا بہترین افسانہ ہے۔ اور اس سے اردو ادب کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلک سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب "شاہ داستان" تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

اوچ شریف: بہاولپور کا قدیم ترین قصبہ اوچ شریف ہے جس کے اردگرد روایات اور قصے کہانیوں کا ایک جال بن دیا گیا ہے۔ راجہ ہوڈ نے ےے میں قلعہ تعمیر کرایا اور اس کا نام اپنے نام کی مناسبت سے ہوڈ رکھا جو رفتہ رفتہ ہوچ اور بعد میں اُوچ بن گیا۔ ابن ہوقل نے اس کا نام بسمد لکھا ہے۔ عرب تاریخ دان ادریسی کے خیال میں یہ شہر سندر کے نام سے مشہور تھا۔ چچ نامہ کے خالق نے اسے بابیہ کیا ہے۔ راہوار خیال یہاں پر بھی نہیں رُکتا۔ تجسس و تحقیق اسے الکندہ رو اور ارور تک لے گئے ہیں۔

یہ شہر چار ہزار سال پرانا ہے۔ کئی دفعہ اُجڑا، آباد ہوا اور پھر زوال پذیر ہوا۔ ایک روایت

کے مطابق اس کی خاک تلے ایک لاکھ بزرگان دین، صوفیا، اولیا اور قطب آرام فرما رہے ہیں۔ مبالغہ آرائی اپنی جگہ لیکن روایات میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے۔

بہاولپور شہر تو میرے لئے نیا نہ تھا لیکن ممبران اسمبلی کی صورت میں کچھ نئے چہرے ضرور نظر آئے۔ شہر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ قدیم اور جدید۔ پرانے شہر کے نو دروازے تھے جن میں کافی گر چکے ہیں۔ مرکزی دروازہ فرید گیٹ ہے۔ نواب امیر محمد نے شہر کے گرد دیوار تعمیر کرائی۔ لاہور کی طرح اندرون شہر بازار ہیں۔ گلیاں تنگ اور مکان بھی کچھ اتنے بڑے نہیں ہیں۔ پرانے شہر کے باہر بھی ایک شہر آباد ہو گیا ہے۔ فرید گیٹ سے نکل کر بائیں جانب جائیں تو سٹیڈیم اور چڑیا گھر ہیں۔ سٹیڈیم حسن محمود نے بنوایا۔ وہ کسی زمانے میں ریاست بہاولپور کا وزیراعظم رہا۔ تخلیقی ذہن رکھتا تھا اور بالغ نظر بھی تھا۔ اس نے کئی تعمیراتی کام کرائے۔ گیٹ سے سیدھی سڑک ضلع کچہری جاتی ہے۔ سڑک کے دائیں بائیں کمشنر ہاؤس اور ڈی آئی جی کی رہائش گاہیں ہیں۔ کچہری چوک سے جو سڑک بائیں ہاتھ مڑتی ہے اس پر ڈسٹرکٹ جیل اور یونیورسٹی بنائی گئی ہے۔ کچہری چوک سے آگے جائیں تو حاصل پور روڈ پر گلزار محل اور دربار محل ہیں۔ یہی سڑک ہوائی اڈے کو بھی جاتی ہے۔ گیٹ کے بائیں طرف بھی اہم سڑک ہے جو سرکلر روڈ کہلاتی ہے۔ گیٹ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر بہاولپور وکٹوریہ ہسپتال میوزیم اور لائبریری کی عمارات ہیں۔ فوارے کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس سے بائیں ہاتھ والی سڑک نور محل تک جاتی ہے۔ دائیں ہاتھ کو مڑیں تو گلزار صادق ہے اور ذرا سا آگے چل کر ریلوے سٹیشن کی تاریخی عمارت نظر آتی ہے۔ فوجی چھاؤنی بن جانے سے شہر کی رونق بڑھ گئی ہے اور کچھ مسائل بھی کھڑے ہو گئے ہیں۔

وزیر بے حال و شیر یزمان: مجھے چارج لئے ہوئے دوسرا دن تھا کہ وزیر مال شوکت داؤد دورے پر آیا۔ اس کا تعلق رحیم یار خان کی تحصیل صادق آباد سے تھا۔ اس کا والد چودھری داؤد میونسپل کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ نہایت شریف انسان تھا اور میرے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک قدر یہ بھی مشترک تھی کہ ہم دونوں کا بیک وقت رام ویل ہسپتال میں بائی پاس ہوا تھا۔ وزیر صاحب نے کسی کھالے کا افتتاح کرنا تھا۔ جب ہم وہاں سے فارغ ہوئے تو سرکٹ ہاؤس آئے۔ چودھری ریاض صاحب کمشنر بہاولپور نے اشارہ کیا کہ اب چلنا چاہئے۔ چودھری صاحب نہایت دھیمے مزاج کے تجربہ کار افسر تھے۔ میں نے شوکت داؤد سے اجازت چاہی تو کہنے لگا "آپ کچھ دیر رُک جائیں۔ پارٹی ورکرز کی میٹنگ ہے۔ میں کھانا آپ کے گھر کھاؤں گا۔" اخلاقاً میں رُک گیا اور کمشنر صاحب چلے گئے۔ پارٹی میٹنگ شروع ہوئی تو میں اپنے عملے کے ساتھ وزیر موصوف کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شور و غوغا ہوا۔ ہم دوڑ کر جب میٹنگ روم میں پہنچے تو عجب منظر دیکھا۔ ایک شخص ہانپتا کانپتا کمرے سے پوری رفتار کے ساتھ دوڑتا ہوا اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ پوچھنے پر اے سی نے بتایا کہ یہ شیر یزمان ہے۔ چودھری اقبال ایم پی اے! سمیع اللہ گروپ جب

اس کو مارنے کے لئے دوڑا تو اس نے پوری رفتار سے وڑکی لگا دی۔ ورکرز نے اس کی تواضع کے لئے چند پتھر بھی پھینکے جس سے گاڑی کے شیشے ٹوٹ گئے۔ شیر زمان تو نکل گیا لیکن شوکت داؤد ان کے نرغے میں آ گیا۔ ورکرز اس کو گریبان سے پکڑ کر دھکے مارتے مارتے بیرونی کمرے تک لے آئے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اس کو ان کے حصار سے نکالا اور کوٹھی پر لے آئے۔ پانی پلایا تو سانسیں ہموار ہوئیں تو اس نے بتایا کہ سب شرارت سمیع اللہ چودھری کی ہے جو بدقسمتی سے ایم پی اے بن گیا ہے۔ یہ پارٹی ورکر تھا دیواروں پر پارٹی کے اشتہار چسپاں کرتا تھا اور میاں نواز شریف کے نعرے گلا پھاڑ پھاڑ کر لگاتا تھا۔ کسی ایسے ہی لمحے میں میاں صاحب خوش ہو گئے اور اسے ٹکٹ دے دیا۔ سارا جھگڑا بہاولپور کی چودھراہٹ کا تھا۔ پارٹی اختلافات دور کرانے کے لئے میاں شہباز شریف نے وزیر مال کو بھیجا تھا۔ اس نے صلح کیا کرانی تھی خود ہی مرتے مرتے بچا۔

اگلے دن اخبار پڑھا تو جو کے ساتھ گھن بھی پس گیا تھا۔ خبریں اخبار کے نامہ نگار چودھری نصیر نے خبر لگا دی کہ ورکرز نے وزیر کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کو بھی دھکے مارے ہیں۔ وجہ یہ بتائی کہ کسی کو علم نہ تھا کہ شاہ صاحب بہاولپور کے نئے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ میں نے نامہ نگار کو بلا کر پوچھا کہ اس نے جھوٹی خبر کس کے کہنے پر لگائی ہے جبکہ وہ خود موقعہ پر موجود ہی نہ تھا۔ کہنے لگا "غلطی ہو گئی ہے۔ سمیع اللہ چودھری کے کہنے پر لگائی تھی، کل صفحہ اوّل پر تردید چھاپ دوں گا۔ مزید کریدنے

پر پتہ چلا کہ سمیع اللہ چودھری کو خدشہ تھا کہ میری آمد سے تسنیم نواز گردیزی مضبوط ہو گا جو سیّد ہونے کے ناطے میرے قریب تھا۔ ایسا مفروضہ قائم کرنے میں وہ اکیلا نہ تھا۔ ممبر قومی اسمبلی سیٹھ عقیل الرحمٰن اور ممبر اسمبلی ریاض حسین پیرزادہ بھی اس کے ہم خیال تھے۔ عقیل تو میدان سیاست میں نووارد تھا۔ میاں صاحبان نے اس کو بالخصوص گردیزی کے خلاف تیار کیا تھا۔ وہ اسمبلی میں گردیزی کا وجود برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پیرزادہ تسنیم نواز کا روایتی حریف تھا۔ دونوں کا حلقہ خیر پور ٹامیوالی تھا۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما ہوتے۔ کبھی تسنیم نواز کا پلڑا بھاری ہوتا تو کبھی پیرزادہ جیت جاتا۔ پیرزادہ کو ایک ایڈوانٹیج یہ تھا کہ وہ حلقے میں ہی رہتا۔ تسنیم نواز آرام طلب شخص تھا اس کے لئے سارا سال گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھرنا مشکل تھا۔ حلقے میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ سیاسی مخالفت ذاتی عناد میں بدل گئی۔ ریاض حسین پیرزادہ کا والد شاہ نواز پیرزادہ اپنے علاقے کا بااثر آدمی تھا۔ اُس کا تعلق شیعہ مسلک سے تھا۔ ایک مرتبہ اس نے انجمن سپاہ صحابہ کے اہم ورکر یحییٰ کو گرفتار کرا دیا۔ یحییٰ پولیس کی حراست میں مر گیا۔ انجمن کے لیڈروں کا خیال تھا کہ وہ طبعی موت نہیں مرا بلکہ شاہ نواز کے ایما پر پولیس نے قتل کر دیا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ چالیس یوم کے اندر وہ اس کا بدلہ لیں گے۔ شاہ نواز محتاط ہو گیا۔ اس کے ساتھ بھی ہر وقت دس پندرہ بندوق بردار باڈی گارڈ رہتے تھے۔ شیخ واہیں

میں اس کا قلعہ نما مکان تھا۔

ایک دن وہ صبح کے وقت اپنے گھر بیٹھا تھا کہ اچانک دروازوں سے ٹکراتی ایک جیپ اندر داخل ہوئی۔ حملہ آوروں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ حفاظتی دستے میں سے کچھ لوگ تو مارے گئے اور باقیوں نے دوڑ کر جان بچائی۔ شاہ نواز موقعہ پر ہی دم توڑ گیا۔ حملہ آوروں نے جیپ سے نکل کر بڑے آرام سے اس کی لاش کی وڈیو بنائی اور چلے گئے۔

باپ تو قتل ہو ہی گیا تھا ریاض حسین پیرزادہ نے سوچا کہ لگے ہاتھوں تسنیم نواز کو بھی گاڑی پر چڑھا دیا جائے۔ ایف آئی آر میں گردیزی کو نامزد کیا گیا کہ سب کچھ اس کے ایما پر ہوا ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ تسنیم نواز گرفتار ہو گیا اور ایک سال بعد ضمانت ہوئی۔ چونکہ وہ احمد محمود کا ہم زلف تھا اس لئے اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ عقیل الرحمن نے مجھے باقاعدہ اس کا کزن بنا دیا۔ لاہور جا کر شکایت کی کہ کیا آپ کو اور کوئی افسر نہ ملا تھا جو میرے مخالف کے قریبی رشتہ دار کو بھیج دیا ہے۔

اگر چھوٹے آدمی کو بڑی چیز مل جائے تو وہ سنبھل نہیں پاتا۔ جب بھی شہباز شریف آتا تو سمیع اللہ شکایت لگا کر چند اہم افسروں کو فارغ کرا دیتا۔ اس سے ساری بیوروکریسی میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ نتیجتاً ممبران اسمبلی بھی اس کی خوشامد کرنے لگے۔

چودھری اقبال کا نام شیر یزمان پتہ نہیں کس بذلہ سنج نے رکھا تھا کیونکہ اس میں جنگل کے بادشاہ کی منجملہ صفات میں سے کوئی ایک بھی نہ تھی۔ البتہ روباہی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ چالاک اور موقع پرست تھا۔ یزمان تحصیل میں کوئی افسر اس کی مرضی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر کسی سے منتھلی وصول کرتا۔ اس سلسلے میں بڑا اصول پرست تھا۔ کسی سے بھی رورعایت نہ کرتا حتیٰ کہ پولیس والوں کو بھی اس کی مٹھی گرم کرنا پڑتی۔ شاہ خرچ تھا، لاہور سرکٹ ہاؤس میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ شام کو وہاں ٹھہرے ہوئے سب وزیروں کو کھانا اس کے لنگر سے جاتا۔ آدمی دلچسپ تھا۔ ایک دن کہنے لگا ”شاہ صاحب! یہ ملک و قوم کا درد ہے جو مجھے کشاں کشاں لے آیا ہے۔ یہاں پہنچ کر میں نے بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ امریکہ میں میرے میکڈونلس (میکڈونلڈ) کے پانچ ریسٹورنٹ تھے سب چھوڑ چھاڑ کر چند ہزار روپوں کے لئے یہاں آ گیا ہوں۔“

سمیع اللہ چودھری کو میکڈونلڈز کی حد تک تو ان سے اختلاف نہ تھا صرف اس بات پر زور دیتا کہ شیر یزمان میکڈونلڈ کے مالک نہیں تھے بلکہ وہاں بیرا گیری کرتے تھے۔

فاروق انور عباسی: فاروق انور عباسی البتہ پرانے ممبر تھے۔ یہ بھی نواب صاحب کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ اگر یہ زندگی کے کسی مرحلے پر نواب ہوتے تو ریاست کب کی بک چکی ہوتی۔ بڑے شاہ خرچ تھے۔ جتنا پیسہ جیب میں ہوتا اسے شب کی سیاہی نگل لیتی۔ محمد شاہ رنگیلے کے قصے بڑے مشہور ہیں اگر ان کے واقعات سن لیتا تو اس کے رنگ میں بھنگ پڑ جاتی۔ دن کو شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے، شب کو ٹوپی اُتار کر کسی نہ کسی ترک شیرازی سے ہم

کلام ہو جاتے۔ جب بھی ہاتھ تنگ ہوتا تو نواب صاحب کی شکارگاہ میں سے چند مربعے زمین بیچ ڈالتے۔ ابھی تک سفران ڈویژن یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ شکارگاہ کی زمین نواب صاحب کے ورثا کو ملنی ہے یا بحق سرکار ضبط ہونی ہے لیکن ان کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ معاہدہ بیعہ مختص کر کے جوڈیشل اشٹام پر لکھ دیتے کہ جب یہ زمین مجھے ملے گی تو میں خرید کنندہ کو رجسٹری کرا دوں گا۔ ساتھ ہی دھونس اور دھاندلی سے اسے قبضہ بھی دلا دیتے۔ زمین اس قدر سستی بیچتے کہ خریدنے والا سوچتا زمین نہ بھی ملی تو اس وقت تک برداشتہ فصل سے ہی رقم پوری ہو چکی ہوگی۔ تسنیم نواز کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ کیونکہ دونوں کی پرواز ایک ہی فضا میں تھی۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ گردیزی محتاط تھا۔ ہاتھ پاؤں دیکھ کر چادر پھیلاتا۔ فاروق انور نے نہ صرف کشتی خدا پر چھوڑ رکھی تھی بلکہ ترنگ میں آ کر لنگر بھی توڑ دیے تھے۔ سمیع اللہ سے یہ بھی خم کھاتا۔ اگر اس کے متعلق کوئی ہرزہ سرائی کرنا ہوتی تو چاروں اور دیکھ کر تسلی کر لیتا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ مزید احتیاط برتتے ہوئے کان میں سرگوشی کرتا۔ ایک دن میں نے کہا ''آپ اس سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں یہ لوگ تو آپ کی رعایا ہیں۔''

کہنے لگے ''میں اس سے تو نہیں ڈرتا البتہ جس کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اس سے خوف آتا ہے۔ یہ اُن کا خاص آدمی تو پہلے بھی تھا لیکن جس دن سے ان کے حق میں اس نے سپریم کورٹ پر حملے کے حوالے سے، ہائی کورٹ تک احتجاجی مارچ کیا ہے ان کی ناک کا بال بن گیا ہے۔ ان کی آمد پر اگر چائے پانی کا بندوبست کرنا ہو تو پہلے اس سے این او سی لینا پڑتا ہے۔ سمیع اللہ بھی ان کے متعلق اسی قسم کے نیک جذبات رکھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا ''یہ لوگ جا کر بھی نہیں گئے۔ ایک طویل عرصہ تک غریب آدمیوں کا خون چوستے رہے۔ اب بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ فاروق انور کی ذاتی آمدنی ایک ٹکہ بھی نہیں ہے مگر ٹھاٹھ باٹھ اور اللے تللے نوابوں والے ہیں۔

خانقاہ شریف سے نجیب اویسی ایم پی اے تھا۔ وہ شریف آدمی تھا اور اپنے کام سے کام رکھتا۔ اُچ شریف کے نمائندہ مخدوم افتخار گیلانی تھے۔ بچپن میں پولیو کی وجہ سے ایک ٹانگ متاثر ہو گئی تھی اس لئے بیساکھیوں کے سہارے چلتے۔ ان کے والد مخدوم بھی صوبائی اسمبلی کے ممبر رہے۔ ہوم سیکرٹری یزدانی نے انہیں ہی اسمبلی میں تھپڑ مارا تھا۔ وہ سادہ لوح تھے افتخار گیلانی جسمانی معذوری کے باوصف بڑا کائیاں اور چرب زبان ہے۔ والد کی وفات کے بعد باقی بھائیوں کو تو نہ جانے کیا ملا لیکن نوادرات پر اس نے قبضہ کر لیا ہے۔ قرآن پاک کے سینکڑوں سالہ پرانے نسخے رسالت مآب سے منسوب خرقہ اور حضرت علی کی تلوار خاص طور پر اہم مہمان کو دکھائی جاتی ہیں۔ حضرت علی کی تلواریں اور بھی کئی جگہوں پر نمائش کے لئے رکھی گئی ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ وہ

کتنی تلواریں استعمال کرتے تھے۔ تاریخی طور پر تو صرف ذوالفقار مشہور ہے ویسے بھی ان کی ساخت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ مرحب ان سے مرا ہوگا۔ ایک تلوار استنبول کے مشہور میوزیم توپاکاپی پیلس میں پڑی ہے۔ غالباً وہی اصل ہے باقی قصے کہانیاں ہیں۔

غیر سرکاری نواب صلاح الدین عباسی ہے۔ اس قدر Unsocial شخص میں نے نہیں دیکھا۔ میری اس سے دو بار ملاقات ہوئی۔ اپنی جائیداد کے سلسلے میں آیا تھا۔ ویسے پڑھا لکھا ہے خوش شکل اور ہوشیار شخص ہے۔ بات کرنے کا انداز بھی منفرد ہے۔ نپے تلے لفظوں میں گفتگو کرتا ہے۔ مجھے پہلی بار ملا تو بولا ''شہباز شریف آپ کے بارے میں کچھ استفسار کر رہے تھے۔ خیریت تو ہے؟''

میں فوراً سمجھ گیا کہ مدعا بیان کرنے سے پہلے نفسیاتی حربہ استعمال کر رہا ہے۔

''بالکل خیریت ہے'' میں نے جواب دیا ''آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ یہ شخص جائیداد کا بٹوارا کیوں نہیں ہونے دیتا۔'' زیرک شخص تھا سمجھ گیا کہ پہلا وار خالی گیا ہے۔ ''فرمایئے کیسے تکلیف کی؟'' میں نے انہیں چائے پیش کرتے ہوئے پوچھا۔

بولے ''آپ Safron کے ممبر ہیں، جائیداد کی تقسیم میں جلدی نہ کریں، اس میں کئی قباحتیں ہیں۔''

''انہی قباحتوں کو دور کرنے کے لئے تو بٹوارا ضروری ہے۔ آپ کے دیگر رشتہ دار اب باقاعدہ الزام تراشی پر اُتر آئے ہیں۔''

''کس قسم کی الزام تراشی؟'' اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ ہمارا کام فرائض منصبی کو نبھانا ہے۔ خاندانی رنجشوں اور چپقلشوں کو ہوا دینا نہیں۔'' تھوڑی دیر تک بیٹھ کر چلا گیا۔

جائیداد کے بٹوارے میں تاخیر صلاح الدین کی وجہ سے تھی۔ اس نے اپنے حصے سے بڑھ کر زرعی اور سکنی جائیداد پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ چونکہ احمد پور ایسٹ سے ممبر قومی اسمبلی منتخب ہو جاتا اس لیے ہر حکومت کو رام کر لیتا۔ صادق گڑھ پیلس سیل ہو گیا تھا۔ محل میں جو سرنگیں بنی ہوئی تھیں ان کے راستے چور اندر گھس آئے اور سب قیمتی سامان اُٹھا کر لے گئے۔ پینٹنگز، انٹیکس، قالین، کراکری، سونے کی کٹلری وغیرہ۔ رشتہ داروں کو شک صلاح الدین پر تھا۔ پرچہ بھی درج ہوا لیکن چور نہ پکڑے گئے۔

بہاولپور میں دن بہت مصروف گزرتا، کام بہت زیادہ تھا، مقدمات کی بھرمار تھی۔ ہفتے میں تین دن عدالت لگانا پڑتی۔ صبح سے شام ہو جاتی لیکن Cause list ختم نہ ہوتی۔ ملاقاتیوں کا بھی تانتا بندھا رہتا۔ یہاں بھی میں نے چٹ سسٹم ختم کر دیا تھا۔ درخواست گزاروں کے لئے ایک رجسٹر بنوایا جس میں درخواست دہندہ کا نام، تاریخ اور کام کی نوعیت درج ہوتی۔ جس محکمے سے سائل کا کام ہوتا اسے باقاعدہ ہدایت دی جاتی کہ مقررہ

مدت میں درخواست نمٹا کر تعمیل کی رپورٹ کرے۔ جواب کا خلاصہ بھی رجسٹر میں درج ہوتا۔ اگر کام فوری نوعیت کا ہوتا تو فون پر بات کر لیتا۔ اس قسم کے اہتمام سے ایک تو سائلوں کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی اور پھر ایک نفسیاتی تسلی کہ انہیں ٹالا نہیں گیا بلکہ مسئلے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔
دو گھنٹے ہسپتال، جیل اور تعمیراتی منصوبوں کے معائنے کے لیے مختص تھے۔ اس کا کریڈٹ بھی میاں شہباز شریف کو جاتا تھا۔ دورے پر آتا تو ان اداروں کی ضرور پڑتال کرتا۔ اگر ہسپتال کی دیوار پر پان کی پیک بھی نظر آ جاتی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو تو کچھ نہ کہتا ڈی سی کی شامت آ جاتی۔ بھری محفل میں کہتا "او ڈی سی! یہ دیوار پر دھبے کیسے لگ گئے ہیں؟" وہ ڈی سی کو امرت دھارا سمجھتا تھا۔ ہر محکمے کی کوتاہی پر جواب طلبی اسی کی کرتا لیکن ایک بات کا لائسنس ڈپٹی کمشنر کو بھی دے رکھا تھا۔ اس کی ایک رپورٹ پر نااہل افسر فوراً تبدیل ہو جاتا۔ چونکہ ساری نوکری میں کام کے بارے میں کسی نے سرزنش نہ کی تھی اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی قسم کے تساہل کا مظاہرہ کیا جائے۔ دن تو اس طور کٹ جاتا، رات کو دو بجے تک میں اور ایس ایس پی چوہدری مجید گشت کرتے۔ جیل میں ہم نے دوہرا بندوبست کر رکھا تھا
Inner Cardon and Outer Cardon ڈی جی خان جیل سے کچھ قیدی فرار ہو گئے تھے۔ وہاں کی انتظامیہ کا جو حشر ہوا تھا وہ سب کو معلوم تھا۔ ویسے بھی رات کو گشت کرنے

سے شہر کو بہتر طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ غلاظت کے ڈھیر کہاں لگے ہیں؟ کون سی سڑک ٹوٹی ہوئی ہے، فوارہ کس جگہ کام نہیں کر رہا۔ ناکے درست طور پر لگائے گئے ہیں یا نہیں اسٹاف ڈیوٹی پر ہے یا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہے، عبادت گاہوں پر باقاعدہ پہرہ دیا جا رہا ہے یا انہیں لامکان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جب عملے کو پتہ ہو کہ افسران بالا آرام نہیں فرما رہے تو وہ بھی چاک و چوبند ہو جاتا ہے۔
ہرنوں کا قتل عام: چولستان کا سارا صحرا شکار کی غرض سے عرب شہزادوں اور حکمرانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ حکومت نے ایک دانش مندی کی ہے کہ بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر بانٹا ہے۔ شیخ زید کو رحیم یار خان کا علاقہ ملا ہے۔ دبئی کے حکمران شیخ راشد المکتوم کے خاندان کے حصے میں بہاولپور آیا ہے اور ایک سعودی شہزادے پرنس نائف کو بہاولنگر کی جاگیر پیش کی گئی ہے۔ ان شکارگاہوں میں محکمہ وائلڈ لائف کے علاوہ شہزادگان کا اپنا عملہ بھی چوکس رہتا ہے۔ وہ حتی الامکان کسی کو شکار نہیں کرنے دیتے۔ شیخ زید نے رحیم یار خان میں بہت بڑے محل بھی کھڑے کیے ہیں اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے اتنے ہی بڑے منصوبے بھی شروع کیے ہیں۔ دوبئی والوں نے بہاولپور میں محل نما مکان بنایا ہے جو چند ایکڑوں پر محیط ہے۔ نام کی حد تک اسے بھی دبئی پیلس کہا جاتا ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے قریب اس عمارت میں دبئی کے حکمران شاذ و نادر ہی ٹھہرتے ہیں۔ جہاز سے اتر کر سیدھے صحرا میں چلے جاتے ہیں اور شکار کے بعد گاڑی ایئرپورٹ پر جا کر رکتی

ہے۔ انہیں لوگوں کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے اگر بہت دیا کرنے کو جی چاہا تو چند چولستانیوں کو نواز دیتے ہیں۔ پرنس نائف کا آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ آیا کب تھا اور رخصت کیسے ہوا۔ اس کے علاوہ قطر، کویت اور دیگر شہزادوں کو ڈیرہ غازی خان اور راجن پور میں بھیج کر گلو خلاصی کرائی جاتی ہے۔

رحیم یار خان میں غیر قانونی شکار کافی حد تک بند ہو گیا تھا لیکن ایک شخص نہ صرف غیر قانونی شکار کرتا بلکہ اکثر عملے کو جل دینے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ ملک پکھراج کا بیٹا میجر تنویر تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اکھڑ فوجی ہے ہر وقت ہاتھ میں بندوق اور جیب میں پستول رکھتا ہے جو طیش یا خوف کے عالم میں چل بھی سکتا ہے۔ اس کی خانپور میں چند مربعے زمین تھی، اس کی آڑ میں وہاں پہنچ جاتا۔ ہم نے اسے پکڑنے کی کئی دفعہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ سرکاری اہلکار اس سے ڈرتے تھے۔ بندوق کا تو شاید مقابلہ کر جاتے لیکن توپ کے منہ کے سامنے کون کھڑا ہو سکتا ہے۔ اصل خوف انہیں طاہرہ سید سے تھا جو ملک کی مشہور مغنیہ تھیں۔ اپنی والدہ کے ساتھ حفیظ جالندھری کی مشہور نظم ”ابھی تو میں جوان ہوں“ گا کر انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ بڑے آرٹسٹوں کے قدردان بھی بڑے لوگ ہوتے ہیں، ڈر خوف کی یہی واحد وجہ تھی۔ وجہ تو ہر کوئی جانتا تھا لیکن بیان کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ ایک دفعہ انتظامیہ نے طاہرہ سید کے خاوند نعیم بخاری سے رابطہ کیا تو ہنس کر بولا ”بابا! اس سے تو میں بھی ڈرتا ہوں۔ بیگم کا بھائی جو ہوا۔“ جن لوگوں نے نعیم بخاری کو ٹی وی پر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک دلاویز مسکراہٹ ہر وقت اس کے چہرے پر بکھری رہتی ہے۔ شاہ صاحب کو کیسی ہی کڑوی گولی کیوں نہ نگلنی پڑے مسکراہٹ نہیں جاتی، چہرے کے چوکھٹے پر قائم رہتی ہے۔

بہاولپور میں شکاری کوئی سابق فوجی نہیں تھا بلکہ حاضر ممبر اسمبلی تھا۔ بہاولنگر سے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار کھیلنے آیا۔ صحرا میں کلاشنکوف سے ہرنوں کا قتل عام کیا۔ تیس ہرن مارے۔ انہیں جیپوں میں لاد کر واپس جا رہا تھا کہ ایک جیپ صحرا کی مٹی میں پھنس گئی۔ ہرن دوسری گاڑی میں ڈالے نہ جا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی فل تھی۔ جیپ اور ہرن وہیں چھوڑ کر وہ بھاگ گیا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں نے ایس ایس پی کو پرچہ درج کرنے کا کہا۔ ہر طرف سے تاریں ہلنا شروع ہو گئیں۔ پولیس نے چالاکی یہ کی کہ پرچہ تو کاٹ دیا لیکن ملزم کو نامزد نہ کیا۔ شیر یزمان چوہدری اقبال میرے پاس پہنچ گیا اور اس کی وکالت کرنے لگا۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور حکومت کو رپورٹ بھجوا دی۔ وہ کئی مرتبہ میرے پاس آیا۔ ایک دن زچ ہو کر بولا ”حکومتی ممبر اسمبلی ہے۔ اس کا تو کچھ بگڑے گا نہیں الٹا آپ پر حرف آئے گا۔ میں نے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کرالی ہے آخر اس نے ہرن ہی مارے ہیں کوئی بندہ تو نہیں مارا۔“

اس نے درست ہی کہا تھا۔ حکومتی سطح پر مک مکا ہو گیا۔ پولیس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ تفتیش کے باوجود ملزم کا اتا پتا نہیں چل سکا۔

[جاری ہے۔]

غزل

کس نے مہر کرم چمکایا
جگ مگ دھوپ کا ہُن برسایا

کتنے درد چمک اُٹھے ہیں
دل نے سورج کو شرمایا

آنکھیں پانی کا گھر ٹھہریں
دریا چڑھ کر دل تک آیا

سادہ کاغذ بانٹ رہے ہیں
حرف پہ اترا نجات کا سایا

تم نے سوال میں پھندے رکھے
ہم نے جواب میں جال بچھایا

شب بھر کھیلی آنکھ مچولی
کوئی کسی کے ہاتھ نہ آیا

شہر کی گلیاں جاگ اُٹھی تھیں
رات وہ چپ نے شور مچایا

چاند کے ساتھ چلے ہم، شب بھر
صرف ہوا نے ساتھ نبھایا

رات نے ایسی خاک اڑائی
دن بھی بھبھوت سا مل کر آیا

شام شراب کنارے اتری
شہر سے جس دن دل اکتایا

کتنے دن کے بعد ملے تھے
یاد کیا تو یاد نہ آیا

کس نے آنکھیں بھر دیں خالد
کس نے دھول میں پھول کھلایا

خالد احمد

غزل

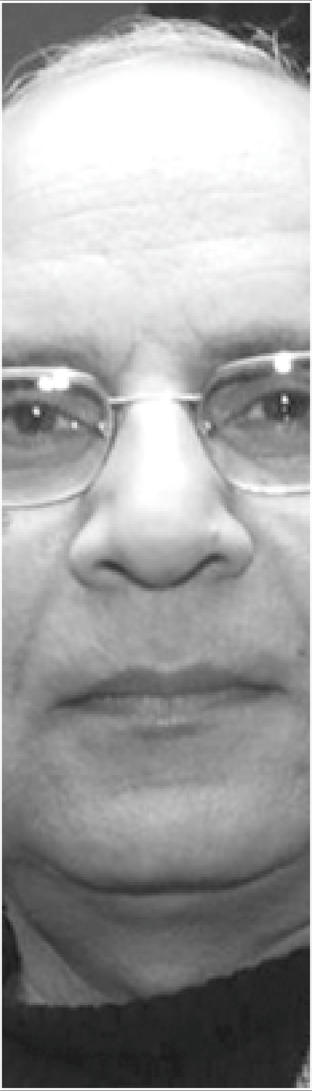

جلیل عالی

مت پوچھ کہ کس عرصۂ وحشت سے گزر ہے
سوچا ہے ذرا دل تو مرے ہاتھ پہ سر ہے

اک لَو مرے ملبے کی طوافی ہوئی جب سے
دشمن کی نگاہوں میں عجب سا کوئی ڈر ہے

ہر گام رفاقت میں مسافت کٹی، لیکن
اک اُس کا جدا ایک الگ اپنا سفر ہے

دنیا میں اگر ہم ہیں تو دنیا بھی ہے ہم میں
کہتے ہیں جہاں کی کوئی پروانہیں، پر ہے

ہم وقت کو بسریں ہیں کہ بسرے ہے ہمیں وقت
قرنوں کی پہیلی کا کوئی پیر نہ سر ہے

رہتی ہے مسلسل کہاں اک صورتِ معنی
یہ صحنِ مکاں بھی تو بس امکاں ہی کا گھر ہے

کرتے ہیں تری یاد سے ہونے کی سزا سہل
اِس حبسِ ہستی میں کوئی روزنِ در ہے

کھوج آئے ہیں اُس دشتِ زمانی کو بھی عالی
جس میں کوئی جنبش ہے نہ شب ہے نہ سحر ہے

غزل

جتنا مجھے چاہا گیا اتنا تو نہ تھا میں
میں کچھ بھی نہیں اور ہوں کچھ بھی تو ہوں کیا میں

صد شکر کہ بے نم نہیں مٹی مری تا حال
جس رہ میں گرا ہوں وہیں اب تک ہوں پڑا میں

آنکھوں کی زباں بھی رہی تھی لال بہر حال
تھی دل سے بہ دل راہ کجا یار کجا میں

جب سامنے آیا تو نہ دیکھا اُسے قصداً
کس منہ سے اُسے دیکھنے کی مانگوں دعا میں

ہے کون جو ہے ہار پہ خوش جیت پہ ناخوش
چپ لگ گئی تھی سب کو تو اِک میں نے کہا میں

کرتا ہی رہا کسب ہے جتنا مرا مقدور
بوئے خوشِ گل روئے من از بادِ صبا میں

کیوں خود سے نہ پوچھوں یہ کہ دونوں میں سے تھا کون
خوش فہم و طلب گار و زیاں کار وہ یا میں

چاہا کہ نہ چاہوں اُسے وہ مجھ کو نہ چاہے
خواہش ہوئی پوری تو برا خود کو لگا میں

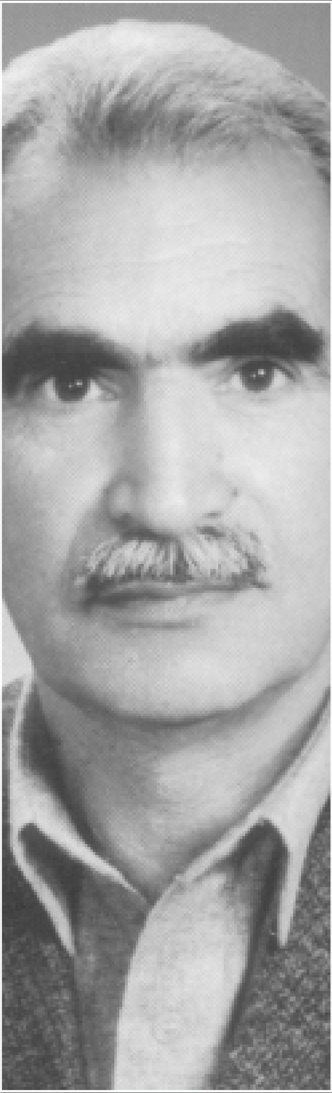

محمد ارشاد

غزل

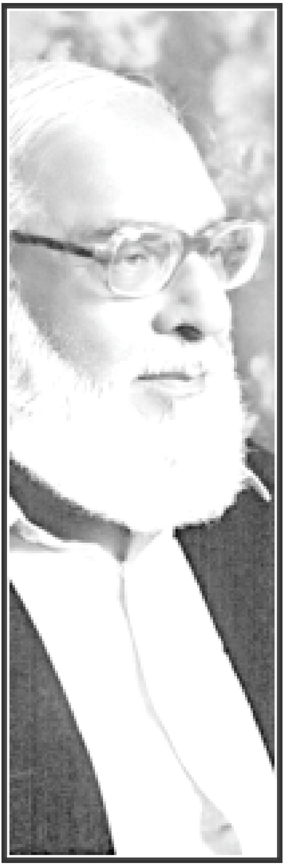

شام ڈھلے یا سورج نکلے، دل کا تو ہے ایک شعار
روپ سروپ سے گہرا رشتہ، رنگ و نکہت سے ہے پیار

اشک پیازی ہو کر ہی تو روشن تر ہو جاتا ہے
گھور اندھیرے چھٹ جاتے ہیں، کھل اٹھتا ہے لالہ زار

مجھ کو اپنے روزن دل سے ہر موسم ہی خوب لگا
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا نکھرا نکھرا ہر شاہکار

نیم دلی سے اٹھنے والے قدموں کی توہین ہوئی
ہانپتے کانپتے ہاتھوں سے ہر لحظہ گرتی ہے تلوار

دار و رسن کو چوم کے بھی جو بات کھری کہہ جاتا ہے
من مندر ہے سندر اس کا، اس پر قرباں کل سنسار

دل سے ریاضؔ کرے جواب بھی، دل پر نقش اسی کا نام
عشق امر ہے اس کا اب بھی، یکتا ہے اس کا معیار

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

غزلیں

لوٹ آنے کا بھی امکان سفر میں رکھا
آنکھ رستے پہ رکھی دل وہیں گھر میں رکھا

اُس کے اندازِ توجہ کا کرشمہ کہیے
گم کیا اُس کو جسے اپنی خبر میں رکھا

پیشِ خیمہ ہی نہ ہو جائے کسی طوفاں کا
وہ جو اِک اشک ہے اِس دیدۂ تر میں رکھا

کل کلاں جس کے حوالے سے جنوں ہو جاتا
ہم نے شہرت کا وہ سودا ہی نہ سر میں رکھا

روز اِک اور ادا سے ہمیں بہکاتا ہے
کیا تماشا ہے گریبانِ سحر میں رکھا

خاور اعجاز

آشنا چشمِ تمنا سے ہُوا حور کا خواب
آج نزدیک سے دیکھا ہے بہت دُور کا خواب

صبح ہوتے ہی اُٹھانا پڑا باقی سامان
اور فٹ پاتھ پہ ہی رہ گیا مزدور کا خواب

ہر کسی کے لیے ہے ظرف مطابق منظر
چشمِ موسیٰ کے لیے جیسے روا طور کا خواب

عالمِ رُویا فزوں عالمِ رنگ و بو سے
جیسے بے خواب کی رنجوری سے رنجور کا خواب

کسی تعبیر کی ہمراہی میں آنے کے لیے
ایک بیساکھی کا محتاج ہے معذور کا خواب

غزل (نذرِ خالد احمد)

گلزار بخاری

محبتوں کی تپش کو ہوائیں دیتا ہے
ترے خیال کو جیون دعائیں دیتا ہے

سبب کا علم نہیں ہے مگر خلوص کے ساتھ
تجھے وجود ہمارا صدائیں دیتا ہے

اُسی سے خاتمہ بالخیر کی گزارش کر
کہانیوں کو وہی انتہائیں دیتا ہے

نزاکتیں سبھی مشروط ہیں جمال کے ساتھ
جو حُسن دے وہی دلکش ادائیں دیتا ہے

دیے ہیں دکھ تری افتادِ طبع نے مجھ کو
خدا کریم ہے کب ابتلائیں دیتا ہے

رفوگری کا ہُنر سیکھنا ہے فرض ترا
اگر نصیب دریدہ قبائیں دیتا ہے

کہیں نشاط کے نغمے کہیں ملال کے گیت
بقدرِ ذوق مقدر نوائیں دیتا ہے

ذخیرہ آب کا گلزار جس نواح میں ہو
وہیں پہ ابر کا موسم گھٹائیں دیتا ہے

غزل

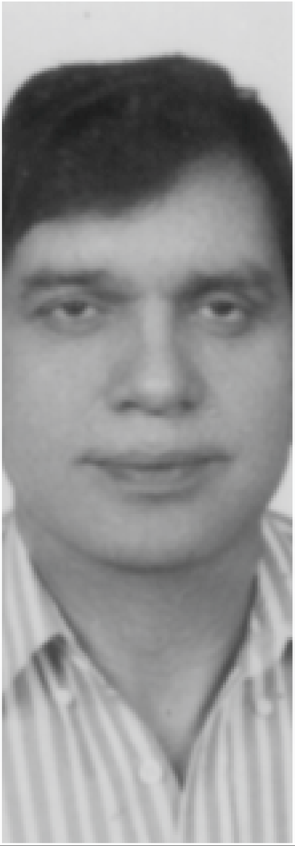

نکل رہا ہوں مرے یار اپنے ہات سے میں
کہ آب و خاک سے خوش ہوں، نہ پُل صراط سے میں

میں تیرے وقت کی اس گیلری میں عکس نما
جُدا ہوا ہوں بچھڑ کر بھی کائنات سے میں

تُو مجھ میں ڈھلتی ہوئی شام، تھوڑی دیر ٹھہر
یہ رات مجھ سے گریزاں ہے اور رات سے میں

فنا کا رنگ پروں پر اٹھا کے لے جائے
کہ تنگ آیا ہوا ہوں قبائے ذات سے میں

میں نامراد کو تانکا میانِ ہجر و وصال
اکیلے پن سے میں راضی ؛ نہ تیرے سات سے میں

قیوم طاہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

غزل

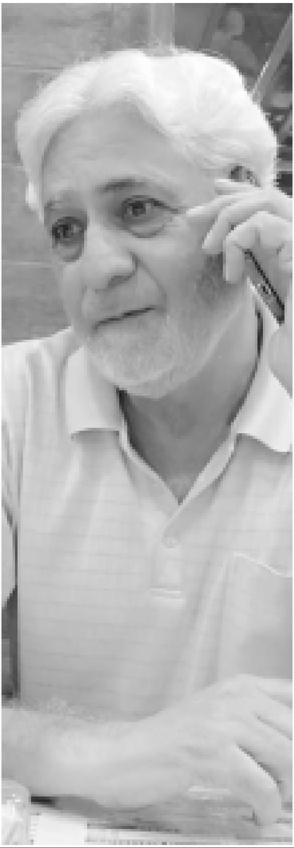

کہاں گئے وہ حسین موسم، کہاں گئے وہ شباب لمحے
کہ میرے دل میں مہک رہے ہیں، ابھی تلک وہ گلاب لمحے

میں کتنا پاگل ہوں آپ اپنے کیے پہ نادم نہیں ہوا ہوں
گناہ کر کے سمجھ رہا ہوں، کہ مجھ کو دیں گے ثواب لمحے

مزہ تو تب ہے کہ عہدِ پیری میں، جگمگائیں اسی طرح سے
چمک رہے ہیں جو اب جوانی میں صورتِ ماہتاب لمحے

یہ میرے ماضی کے رازداں ہیں، پلٹ جو آئیں تو کیا بنے گا
مجھے تو ڈر ہے کہ زندگی کا، اُلٹ نہ ڈالیں نقاب لمحے

جو آج وجہِ طمانیت ہیں، سکونِ دل ہیں، قرارِ جاں ہیں
ذرا جو اقبال وقت بدلا، یہی بنیں گے عذاب لمحے

اقبال سردبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جام و صراحی و سبو ، نشّۂ مستِ آرزو
زُہد نے توڑ تاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

غزل

سجا ہے جب سے یہ میدان پانی پت کی طرح
چھلکتی رہتی ہیں آنکھیں پرانی چھت کی طرح

اسی لیے تو میں ہر روز ہار جاتا ہوں
تمہارا عشق لگا ہے جوے کی لت کی طرح

اس آسمان کے بارے میں کیا کہوں آخر
جو گر پڑا ہے مری قدر و منزلت کی طرح

یہی بہت ہے کبھی شکریہ کا موقع دیں
قبول کر کے مجھے میری معذرت کی طرح

کڑکتی دھوپ میں وہ سایہ دار پیڑ مجھے
کھڑا ملا ہے کسی عالی مرتبت کی طرح

تمہاری نرگسی آنکھوں میں ڈوبنے کے لیے
جوانی آئی تھی ہم پے سنیل دت کی طرح

تمہارے کھیتوں کی رنگت بحال کر رہا ہے
بدن سے خون پسینہ نکل کے ست کی طرح

اس آدمی کے مقابل تو عصر حاضر میں
ہمیں لگے ہیں درندے بھی جین مت کی طرح

ذرا سا وقت بدلنے کا انتظار کرو
بنے گی آپ کی درگت ہماری گت کی طرح

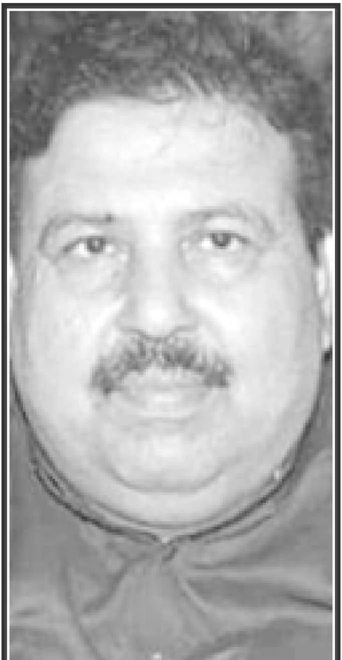

مسعود احمد

غزل

درِ احساس سے گزارے ہوئے
ہم تری قربتوں کے مارے ہوئے

دن کے جنگل میں خواب بکھرے تھے
رات چمکی تو جمع سارے ہوئے

ہم کہ بکھرے ہوئے، بکھرتے ہوئے
وہ کہ سنورے ہوئے، سنوارے ہوئے

ایک دریا میں مل گیا دریا
اور خود سے جُدا کنارے ہوئے

بادباں اپنی دُھن پہ رقصاں ہے؟
یا ہواؤں سے کچھ اشارے ہوئے؟

تجھ کو پا کر بچھڑ گئے آنسو
ہم کو اِس نفع میں خسارے ہوئے

اوجِ نسیاں کی آرزو ٹھہرے
ہم، تری یاد سے اُتارے ہوئے

ہم سفر ہیں اداس راتوں کے
غم نہ جیسے ہوئے ستارے ہوئے

جیتنے والے مطلبی نکلے
میز کے گرد سب ہیں ہارے ہوئے

تیری جھولی میں ڈال دوں کیسے!
غم نہیں پیڑ سے اتارے ہوئے

حامد یزدانی

غزل

سرِ ساحل سفینہ آ گیا ہے
محبت کا قرینہ آ گیا ہے

ذرا شاخوں کو اس نے چھو لیا تو
گلابوں کو پسینہ آ گیا ہے

حقیقت میں انھی کی زندگی ہے
جنھیں مرنا یا جینا آ گیا ہے

وچھوڑا راس آیا ہے تمھیں بھی
ہمیں بھی زہر پینا آ گیا ہے

تری آواز کی خاطر ترستی
سماعت کو پسینہ آ گیا ہے

افتخار شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزل

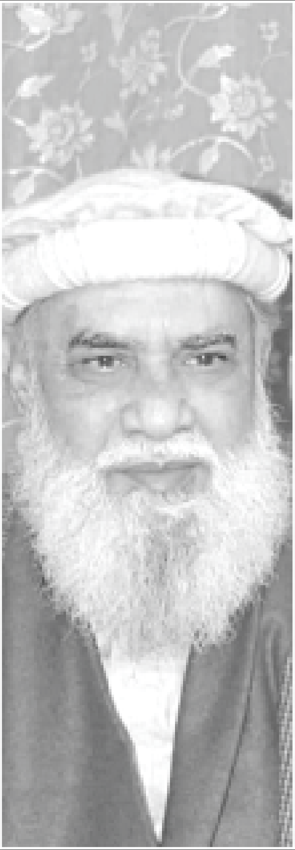

آنگن میں سایہ دار شجر تھا نہیں رہا
گاؤں میں ایک اپنا بھی گھر تھا نہیں رہا

اتنا تو فائدہ ہوا تیرے بچھڑنے سے
دل میں ترے بچھڑنے کا ڈر تھا نہیں رہا

اس نے بزور آج بغاوت کچل ہی دی
خود سر سا میرے کندھوں پہ سر تھا نہیں رہا

آتے تھے آسماں سے پیمبر زمین پر
مٹی میں کوئی خاص اثر تھا ، نہیں رہا

کب تک رہیں گے گود میں دنیا کی ہم کہ جب
دنیا میں وہ جو نوری بشر تھا نہیں رہا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہی بھائی ، وہی بھاؤ ، وہی قدریں خالد
کیا توقّع کوئی لے کر سرِ بازار آئے

غزل

اداسیوں کا کوئی اہتمام ہونے تک
تم انتظار کرو میرا شام ہونے تک

ترا سراغ ملے گا تو لوٹ آؤں گا
زمین پر میں رہوں گا یہ کام ہونے تک

یہ خواہشیں تری پابند ہیں تو ہیں دل میں
یہاں رکھوں گا انہیں بے لگام ہونے تک

پھر اس کے بعد یہ آنچل مچلتا جائے گا
سکوں میں ہے ترے محوِ خرام ہونے تک

بدلتے وقت نے یہ کہہ کے خوش کیا مجھ کو
تو بادشاہ رہے گا غلام ہونے تک

مجھے یہ ڈر ہے کہیں مندمل نہ ہو جائے
یہ زخم ہجر کی مدت تمام ہونے تک

نمی کو آنکھ میں آنے سے روکنا ہو گا
لہو اور آنسوؤں کا انضمام ہونے تک

رکو رکو ابھی گھر کے کواڑ مت کھولو
بس ایک پل دلِ وحشی کے رام ہونے تک

پتا نہیں مری سانسیں رہیں، رہیں نہ رہیں
نگارِ گل تری خوشبو کے عام ہونے تک

دیارِ عشق سے جانا تو ہے مجھے لیکن
رہوں گا لائقِ صد احترام ہونے تک

کہیں پہ ملبہ چھپانے کا بندوبست کروں
مکانِ خواب ترا انہدام ہونے تک

کہیں یہ بے ہنروں میں نہ بانٹ دی جائے
متاعِ درد مرے دل کے نام ہونے تک

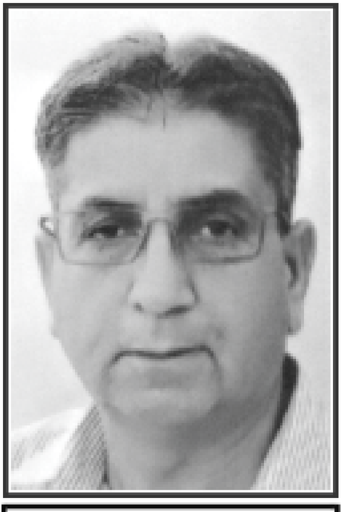

طالب انصاری

غزل

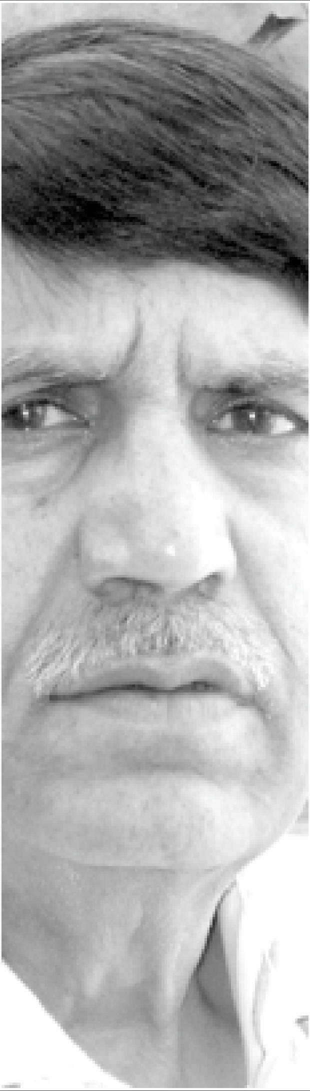

بات گلوں کی کیا کریں' کیا ہو بیانِ گلستاں
روٹھا ہوا ہے آنکھ سے' خوابِ بہارِ جاوداں

رنج ہے دل میں جاگزیں' آنکھ میں ہے سراب سا
یہ جو ہنسی لبوں پہ ہے' سب ہے کمالِ داستاں

اُجڑی ہوئی سرائے ہے پھرتے ہیں سائے چار سو
ایک اجاڑ موڑ پر ٹھہرا ہوا ہے کارواں

اے مرے یار چھیڑ مت' موسمِ گل کا تذکرہ
کوئی للک نہ پیار میں اور نہ ہجومِ دوستاں

چپ کا مقام ہے میاں' چپ کی ردا ہی اوڑھیے
شور و شر کے راج میں کچھ بھی ہے کہنا رائیگاں

عظمی عجیب روپ ہے اب کے برس بہار کا
تاک میں گل فروش ہیں اور پریشاں تتلیاں

اسلام عظمی

غزل

اکرم سحر فارانی

دھڑکنوں کے ساز میں بھی سوز پیدا کر دیا
ہجر نے نغماتِ دل کو مشقِ گریہ کر دیا

پھول ایسا کھینچ کے مارا مرے ہمدرد نے
سنگ باری سے لگے زخموں کو تازہ کر دیا

مجھ سے ملنے اب کوئی تیماردار آتا نہیں
میرے چارہ گر مجھے کیوں تُو نے اچھا کر دیا

راہ میں آنکھیں بچھائیں ہر ادا پر مر مٹے
حُسن والوں کا پھریرا ہم نے اونچا کر دیا

لن ترانی کی وضاحت جب خُدا نے کی سحر
ایک ہلکی سی جھلک سے طُور سُرمہ کر دیا

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

چلو دل اُس کا وفادار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

غزل

وصالِ یار نا ممکن نہیں ہے
تو پھر ہونے کو کیا ممکن نہیں ہے

جو یاں ممکن لگا، ممکن نہیں ہے
سو کیا ممکن ہے کیا ممکن نہیں ہے

سوالِ وصل کو مت ٹال ہنس کر
بتا ممکن ہے یا ممکن نہیں ہے

تغیر کے خلیج اتنے بڑے ہیں
کہ تم سے سامنا ممکن نہیں ہے

میں تم سے لاکھ دھوکے کھا چکا ہوں
اگرچہ بارہا ممکن نہیں ہے

نہ تکمیلِ بقا کی آرزو کر
مکمل تو فنا ممکن نہیں ہے

دکھائی بھی وہی دیتا ہے ہر سو
کہ جس کو دیکھنا ممکن نہیں ہے

یہی دو صورتیں ممکن ہیں اے دل
کہ یا ممکن ہے یا ممکن نہیں ہے

وصالِ یار مانگا اور کچھ بھی
صدا آئی کے جا! ممکن نہیں ہے

طلب توحید پر قائم رہے گی
کوئی تیرے سوا؟ ممکن نہیں ہے

تسلسل غم کا کیونکر ہو گوارا
خوشی جب بارہا ممکن نہیں ہے

مرے ہونے سے کیا ہونا نہ ہونا
مگر میرے سوا ممکن نہیں ہے

کہوں میں شعر کتنے اس زمیں میں
غزل کی انتہا ممکن نہیں ہے

کسی کو تو نے اتنا چاہا ساگر
کہ جتنا چاہنا ممکن نہیں ہے

تجلی طور نے دیکھی تو ساگر
کھلا ممکن ہے نا ممکن نہیں ہے

محمد سلیم ساگر

غزل

کس قدر دو بدو ہے سناٹا
اب مرے چار سو ہے سناٹا

ایک ہی شخص بزم میں کم ہے
شہر میں کو بہ کو ہے سناٹا

چھوڑ آئی ہوں جیسا گھر کے بیچ
دشت میں ہو بہ ہو ہے سناٹا

شور و غل کے مدار میں پیہم
محورِ گفتگو ہے سناٹا

کر رہی ہے دھمال خاموشی
صورتِ ہاوہو ہے سناٹا

اب ذرا روک دے سخن افروز
اب مرے رو بہ رو ہے سناٹا

افروز رضوی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اے ذکر! مرے فکر کی تقدیر بدل دے
اے نور! مرے نطق کے کاسے میں چھنک بھی

غزل

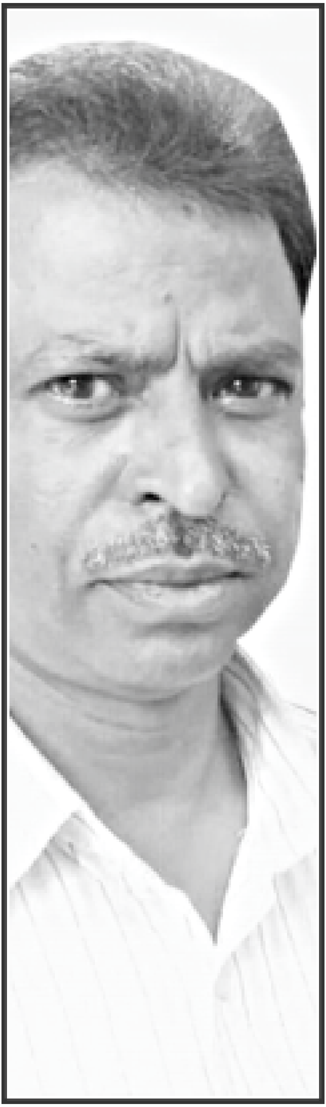

بخش دی عالمی پہچان ذرا دیکھو تو
مجھ پہ رب کا مرے احسان ذرا دیکھو تو

سارے پھولوں کی صفات اس کے بدن میں ہیں بھری
وہ تو ہے پورا گلستان ذرا دیکھو تو

آپ کے ساتھ کے بن، جان کسی دن آ کر
زندگی کتنی ہے ویران ذرا دیکھو تو

جس کا دنیا سے کرایا ہے تعارف میں نے
آج مجھ سے ہے وہ انجان ذرا دیکھو

آ رہا ہے بڑی تیزی سے مٹانے کو تمھیں
اشک اور آہ کا طوفان ذرا دیکھو تو

جب بھی پلٹے گا تو آئے گا مرے پاس ہی وہ
اس کا کیا کوئی ہے امکان ذرا دیکھو تو

حسنِ شہکار بھی بن اس کے ہے بے معنٰی سا
عشق کو کیا ہے ملی شان ذرا دیکھو تو

آ گئی ان کے عیادت کو ''ذکی'' آتے ہی
ڈوبتی نبض میں پھر جان ذرا دیکھو تو

ذکی طارق

غزل

بتا رہی ہے مسلسل شکست ذات مجھے
درست کرنے پڑیں گے معاملات مجھے

میں جانتا ہوں نیا دن ابھی حصار میں ہے
گزارنی ہی پڑے گی طویل رات مجھے

یہ منظروں کا بہاؤ کہاں سے آیا ہے
دکھائی دیتی ہے آنکھوں میں کائنات مجھے

میں کیسی جنگ سے واپس پلٹ کے آیا ہوں
جہاں سے جیت ملی ہے نہ کوئی مات مجھے

میں ہر غزل میں پرندوں کے دکھ بتاتا ہوں
بلند رکھتے ہیں میرے تخیلات مجھے

ہر اک محاذ پہ ڈٹ کر کھڑا ہوا ہوں میں
پکارتے ہیں زمانے کے حادثات مجھے

مجھے یقیں ہے وہ لمحہ ضرور آئے گا
کوئی سنائے گا بچپن کے واقعات مجھے

وہیں سے شعر و سخن کا ہنر ملا ہے نوید
عطا ہوئے تھے جہاں سے قلم دوات مجھے

محمد نوید مرزا

غزل

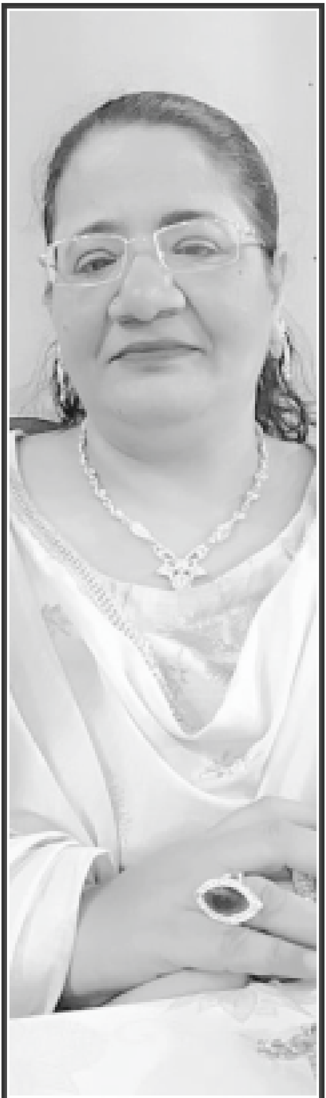

تم اگر چاہو تو تصویر بھی ہو سکتی ہوں
زائچہ بن کے میں تقدیر بھی ہو سکتی ہوں

خواب دیکھو تو سہی شوق سے تم تا بہ سحر
میں ترے خواب کی تعبیر بھی ہو سکتی ہوں

مجھ کو پڑھنے کی طلب گر ہے ترے دل میں تو
دل کے کاغذ پہ میں تحریر بھی ہو سکتی ہوں

یہ الگ بات کے پھولوں کی طرح نازک ہوں
وقت پڑنے پہ میں شمشیر بھی ہو سکتی ہوں

تم قریب آنے کی کوشش نہ کرو جانِ غزل
میں ترے پاؤں کی زنجیر بھی ہو سکتی ہوں

مجھ پہ تہمت نہ لگا چھوڑ بھلا دے مجھ کو
تری اس بات سے دلگیر بھی ہو سکتی ہوں

شاعری میں گو تخلص میرا رومی ہے مگر
سوچتی ہوں میں کبھی میر بھی ہو سکتی ہوں

رومانہ رومی

غزل

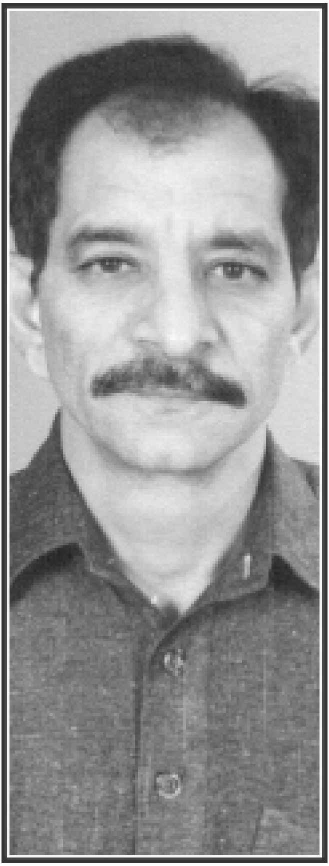

طاہر ناصر علی

مجھ سے کل مل کر وہ شاید اس لیے مغموم تھا
اُس حسیں میں تھی کمی گویائی سے محروم تھا

خواب ہو جائیں گی اک لمحے میں ساری رونقیں
کل جب آئے گی، یہ ہوگا! یہ کسے معلوم تھا

حوصلہ دیکھو کہ خوں کے پیاسے تھے چاروں طرف
اُن میں رہ کر بھی رہا زندہ میں وہ مظلوم تھا

شاخ سے پتے گرے اور گرتے ہی مرجھا گئے
زندگی دو چار دن ہے، اُن پہ یہ مرقوم تھا

اُسکو پڑھ لیتا کسی میں یہ بصارت تھی کہاں
میرے رُخ پہ حالِ دل سب صورتِ منظوم تھا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لے نہ لکیروں میں گرفتار مجھے بھی
وہ، نقش نہ کر دے سرِ دیوار مجھے بھی

غزل

پابندیوں نے حرفِ تمنا کیا مجھے
اک ان کہی نے دہر میں افشا کیا مجھے

آشفتگی تھی وصل کی لذت سے بے خبر
وارفتگی نے ہمسرِ صہبا کیا مجھے

میں پیاس سے نڈھال تھی صحرا نصیب تھی
اک مہرباں کے لطف نے دریا کیا مجھے

تشخیص کر سکا نہ مرض کی کوئی طبیب
میرے مریضِ عشق نے اچھا کیا مجھے

برسوں پرانے زخم کا بھاری تھا مجھ پہ بوجھ
اک تازہ غم کی لہر نے ہلکا کیا مجھے

آتی نہیں ہے راس کوئی بزم ان دنوں
ایسے خیالِ یار نے تنہا کیا مجھے

اک عکس کی طرح تھی میں اس سے ملے بغیر
اس کی نگاہِ شوخ نے چہرہ کیا مجھے

جب تک نفی میں تھی میں ثمینہ تو خیر تھی
افسوس میری ہاں نے ہی رسوا کیا مجھے

ثمینہ سیّد

غزل

اک زمانے کا حالِ دل ہے عیاں
دشت ہے مجھ کو بس یہاں سے وہاں

شہر آوارگاں سے خالی ہے
ڈھونڈیے اب صدائے ہم نفساں

میں نہیں اس دیار میں تنہا
داستاں بھی ہے میرے ساتھ رواں

روشنی روشنی کا پہناوا
دیدہ ور ہیں برائے دیدہ وراں

میں اگر سامنے سے ہٹ جاؤں
پھر تو خالی ہے دامنِ امکاں

ہمیں تسخیر کرنے والوں کی
بات اپنی کوئی نہ اپنی زباں

لوگ رکھتے ہیں یادِ یار عزیز
لے چلوں میں بھی اپنے ساتھ دھواں

وہ جسے روح میں اُترنا تھا
کیا اُٹھاتے اُسے سرِ مژگاں

اُس گلی کے لیے اٹھا رکھوں
رت جگے اور آبلوں کے نشاں

شہر کے انتظام سے باہر
اک گلی ہو برائے دل زدگاں

تم رہو گے زمانے کی لے پر
اور زمانہ ہمارے ساتھ رواں

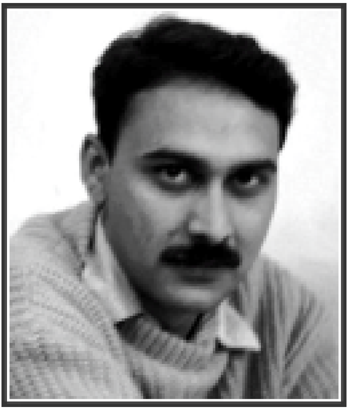

سبطین رضا

غزل

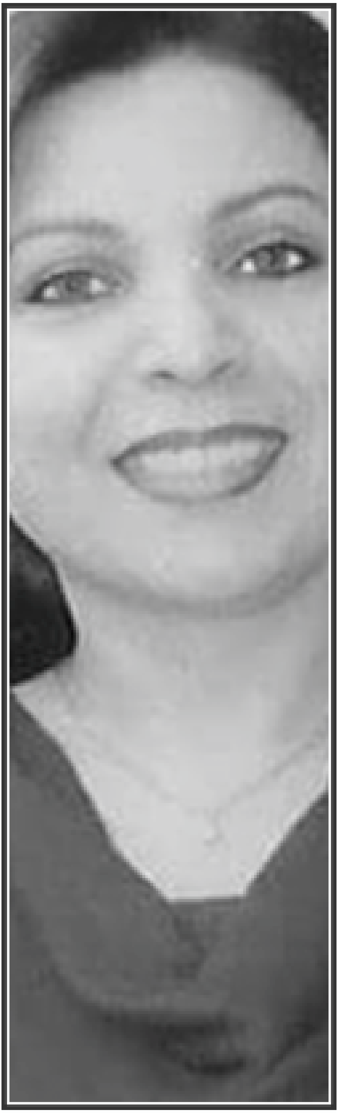

مت سمجھ صورتِ سزا مَیں ہوں
تیرے ہر درد کی دوا مَیں ہوں

گُھپ اندھیرے میں اک دیا مَیں ہوں
گنبدِ حبس میں ہوا مَیں ہوں

مَیں ہی منزل ہوں ، راستہ مَیں ہوں
ابتدا مَیں ہوں انتہا مَیں ہوں

جان دینے کا جب سوال آیا
مَیں ہی بولی تھی برملا ، مَیں ہوں

ایک انسان کو کیے سجدے
اُس نے جانا کہ بس خدا مَیں ہوں

غمِ دوراں میں وہ رہے مصروف
غمِ جاناں میں مبتلا مَیں ہوں

عشقِ کامل کی ہے تلاش اگر
اس کا اک ادنیٰ واسطہ مَیں ہوں

یہ زمانہ کہ وہ زمانہ ہو
کُو بہ کُو ، چارسُو بپا مَیں ہوں

خالدہ انور

غزل

اظہار ہو تو آپ سنور جائے آدمی
خاموش کوئی کر دے تو مر جائے آدمی

خود ہی بگاڑتا ہے مقدر بنا ہُوا
الزام کیوں نصیب پہ دھر جائے آدمی

انساں کی چاہتوں میں تو یکجا ہُوا مگر
نفرت ملے تو روز بکھر جائے آدمی

دنیا جہان تیری محبت میں وار کر
اب کس جگہ، کس اور نگر جائے آدمی

معلوم ہو اگر اِسے دنیا کا حال تو
دنیا میں آتے آتے مُکر جائے آدمی

اخلاقیات کو جو نہ رکھے نظر میں تو
ہر شخص کی نظر سے اُتر جائے آدمی

گر رحمتِ خدا نہ ہو سایہ فگن تو پھر
دنیا کی ہر ڈگر پہ پسر جائے آدمی

ہوں لاکھ پہرے دار کہ بندش کے باوجود
محبوب کی گلی میں ٹھہر جائے آدمی

جن منزلوں پہ عشق کی جاگیر ہو ندیمؔ
"اُن منزلوں سے کیسے گزر جائے آدمی"

ریاض ندیم نیازی

غزل

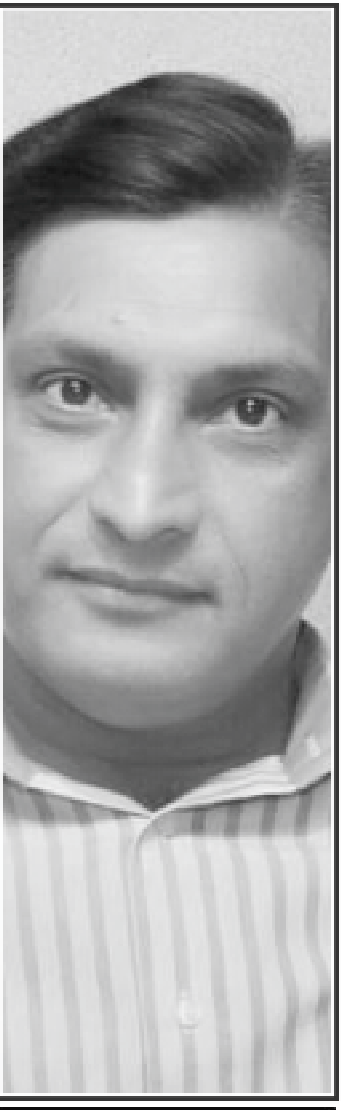

آفتاب خان

جو زندگی کی بلاؤں پہ ہاتھ ڈھیلا ہے
سو ہم نے اپنے ہی ناخن سے زخم چھیلا ہے

ہر ایک چہرے سے اُمڈی پڑے ہے پیلاہٹ
درونِ جسم تو ہر نَس کا رنگ نیلا ہے

سمجھ نہ پاؤ گے مفہوم آخری خط کا
کہ آبِ چشم سے ہر ایک حرف گیلا ہے

سُنا ہے عشق میں کڑواہٹیں ہی ملتی ہیں
یہ ذائقہ بھی مگر کچھ نہ کچھ رسیلا ہے

جسے تلاش کیا ، مل گئی کتابِ وفا
یہ غم نہیں ہے جو کاغذ کہیں سے پیلا ہے

نفیس باپ کی جو آنکھ کا ستارہ ہو
وہ نوجواں تو بھرے شہر میں سجیلا ہے

ہے جس کا نُور ستاروں کے درمیاں موجود
اے آفتاب اُسی کا مجھے وسیلہ ہے

غزل

اعجاز روشن

ناؤ منجدھار میں ڈبو بیٹھے
کیا ہوا ناخدا تو ہو بیٹھے

پھول بھی زیبِ لب کیے لیکن
خار بھی روح میں چبھو بیٹھے

دل کئی بار ہم پہ ہنس بیٹھا
ہم کئی بار دل کو رو بیٹھے

لو دِوانہ تو بات کر کے چلا
اب مری جان تم ہنسو بیٹھے

اور کس کام کے رہے روشن
گھر میں اب شاعری کرو بیٹھے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چھیڑی نہ مرے عجز کی دستار کسی نے
لوٹی ہے فقط دولتِ پندار کسی نے

غزل

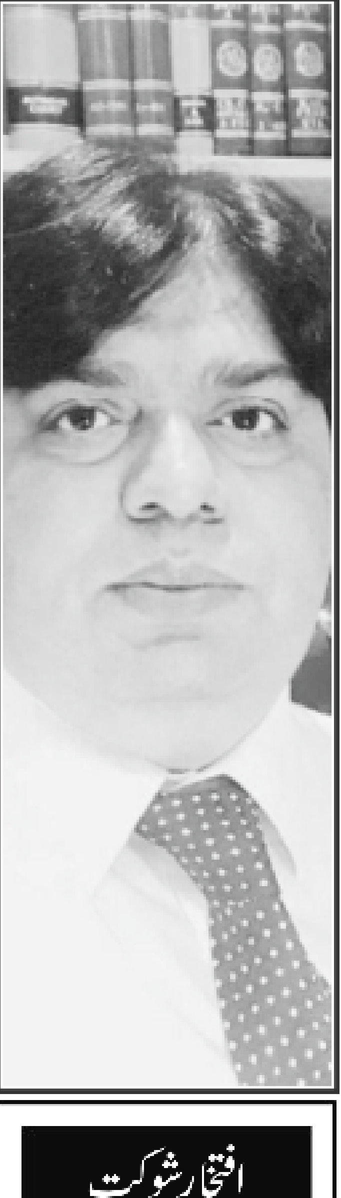

جیسے دریا اور کنارا ساتھ ہے
اس طرح سے ہی ہمارا ساتھ ہے

ہو گئے ہو جب سے تم پھر مہرباں
ہر خفا منظر دوبارہ ساتھ ہے

ہاتھ کیا آیا تمہارا ہاتھ میں
یہ جہاں سارے کا سارا ساتھ ہے

شام کا یا صبح کا ہو اس سے کیا
اتنا کافی ہے کہ تارا ساتھ ہے

جس سے بچھڑا اور جس جس سے ملا
زندگی کا ہر نظارہ ساتھ ہے

وہ سفر میرے لئے ہے معتبر
جس سفر میں بھی تمہارا ساتھ ہے

زندگی ہوتی نہیں ہے یک رخی
فائدے میں تو خسارا ساتھ ہے

اس لئے رہتا ہوں تنہا افتخار
ساتھ اپنا، سب سے پیارا ساتھ ہے

افتخار شوکت

غزل

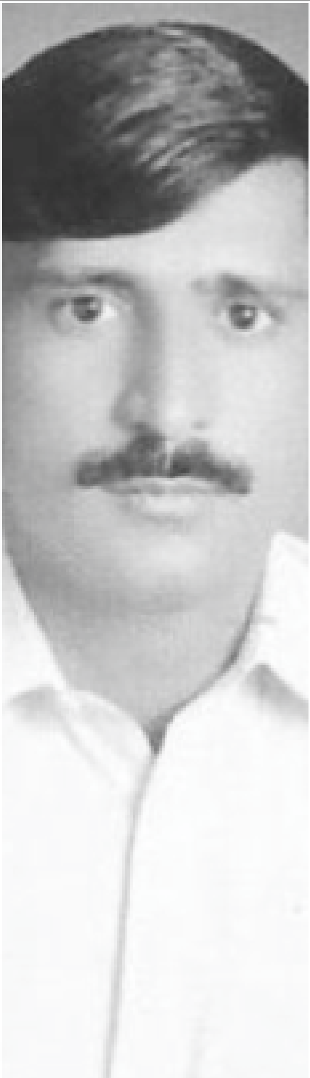

کیا تجھے یاد دلاتا کہ حقیقت کیا ہے
جو مرے دل پہ لکھی ہے وہ عبارت کیا ہے

ڈھالنا خود کو ضرورت کے مطابق ہر پل
گر سیاست یہ نہیں ہے تو سیاست کیا ہے

وہ صلہ مانگتا ہے اپنی وفا کا مجھ سے
یہ محبت ہے تو پھر کارِ تجارت کیا ہے

اس سے بڑھ کر بھی کوئی ہوگا مقامِ حیرت
آئنہ دیکھ کے کہتے ہیں کہ حیرت کیا ہے

کس لیے آج مجھے یاد کیا ہے اس نے
اس سے یہ پوچھنا اب میری ضرورت کیا ہے

شعر میں ڈھل کے ہر اک دل میں اتر جاتے ہیں
اس سے بڑھ کر مرے لفظوں کی صداقت کیا ہے

میں سمجھتا ہوں اسے واحد و یکتا دانش
یہ عبادت جو نہیں ہے تو عبادت کیا ہے

اعجاز دانش

غزلیں

تجھ کو سوچوں تو رنگ در کھل جائیں
جس طرح مورنی کے پر کھل جائیں

اس کی خوشبو سے مہکے میرا چمن
راستے اس کو دیکھ کر کھل جائیں

طور سے ایک ہاتھ دور ہوں میں!!
جلوہ و حسن آنکھ بھر کھل جائیں

جانے کیا کیا ہو تیرے جانے سے
کتنے وہم و گمان ، ڈر کھل جائیں

آسماں بن گیا مرے بازو
اور اب کتنا بے خبر کھل جائیں

مونھ نہ موڑیں گے کافر و مومن
باغِ جنت کے جب ثمر کھل جائیں

دل سے اٹھ جائے ایک اک دربان
جب کہیں بند سارے گھر کھل جائیں

رخشندہ نوید

جو اپنے من کو بھایا کون دے گا
سکونِ دل ، خدایا کون دے گا

سمے کی دھوپ پھیلی چار جان
سِوا تیرے ، یہ سایہ کون دے گا

لٹا دیتے ہیں ہم ، ورنہ کوئی بھی
جو مشکل سے کمایا کون دے گا

دوبارہ راستہ دے گا ؟ وہ جس نے
مجھے رہ سے ہٹایا ، کون دے گا

کہاں تک ڈھونڈیے مالِ غنیمت
فلک نے جو لٹایا کون دے گا

اگر یہ نوکری چھٹ جائے میری
مرے گھر کا کرایہ کون دے گا

غزل

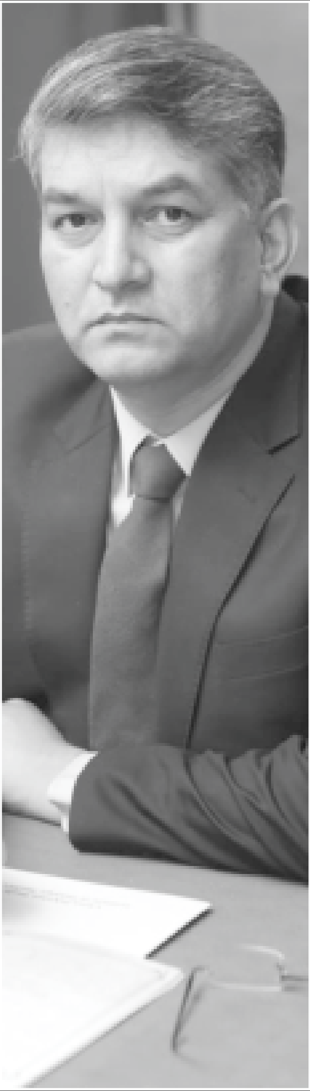

طلعت شبیر

اک ربط استوار تھا
عجیب سا خمار تھا

ہماری سانس سانس پر
کسی کا اختیار تھا

فریب در فریب تھے
مگر اک اعتبار تھا

اسی نے غم دیے مجھے
جو میرا غمگسار تھا

ملا نہیں جو عمر بھر
اسی کا انتظار تھا

مٹا نہیں سکے ہو تم
میں حرفِ پائیدار تھا

زندگی کی دھوپ میں
وہ شخص سایہ دار تھا

غزل

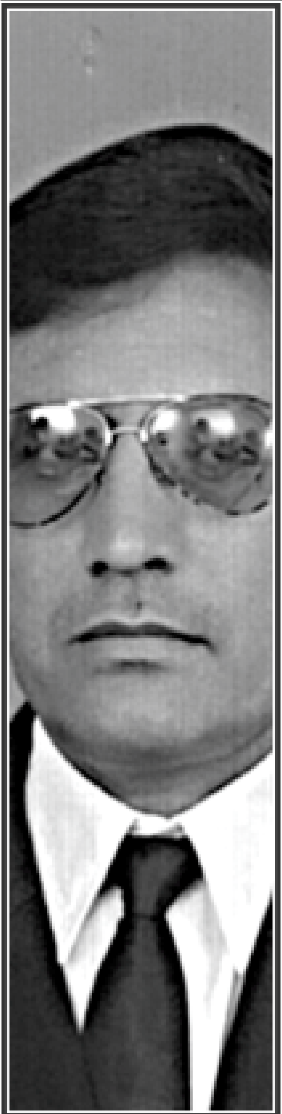

شوکت محمود شوکت

مجھے روز و شب سے غرض نہیں، نہ ہی کام صبح سے، شام سے
کہ سکونِ دل ہے جڑا ہوا، ترے ذکر سے، ترے نام سے

مرے حال پر یوں کرم ہوا، کہ ہوئے وہ راز بھی منکشف
جو نہاں تھے میری نگاہ سے، جو ورا تھے دانشِ تام سے

کوئی آ کے کوچۂ یار سے بڑی خامشی سے گزر گیا
کوئی آہ بھر کے ہی رہ گیا، اُسے دیکھ کر، لبِ بام سے

ترے ہاتھ ہی تو یہ کھیل ہے، یہ حیات کیا یہ ممات کیا
کئی مر گئے، کئی جی اُٹھے، تری اک نگاہ کے جام سے

جہاں امن ہو، جہاں حسن ہو، جہاں خامشی ہو، سکوت ہو
مجھے پیار ایسی جگہ سے ہے، مجھے عشق ایسے مقام سے

وہی بات لب پہ مرے بھی ہے، جو کہ میر پہلے ہی کہہ چکے
مرے شعر عام نہیں مگر، مجھے گفتگو ہے عوام سے

مری لوحِ دل پہ جو نام تھا، وہ حروفِ شعر میں ڈھل گیا
اسے لوگ جان گئے سبھی، مرے انتخابِ کلام سے

یہ غلط ہے، شوکتِ خستہ جاں، تری کیفیات ہیں دائمی
وہ فراق ہو کہ وصال ہو، ہیں ورا یہ دونوں دوام سے

غزل

ہم کہ رشتے نبھانے والے ہیں
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

اُن کے لہجے میں کاٹ تھی کتنی
جیسے رکھے زباں پہ بھالے ہیں

تم نے کب تھا کہا محبت ہے
اپنے ہاتھوں ہی درد پالے ہیں

ہیں ترستے مکاں مکینوں کو
لوٹتے کب وہ جانے والے ہیں

زندگی رک گئی کہاں آ کر
وقت کے کھیل بھی نرالے ہیں

دیکھتا ہے وہ آسمانوں سے
کیا ہوا جو لبوں پہ تالے ہیں

نائلہ راٹھور

کوئی ستم نیا نہیں ، کوئی کرم نیا نہیں
مرکزِ التفات بھی ، جاں ، ہدفِ خدنگ بھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

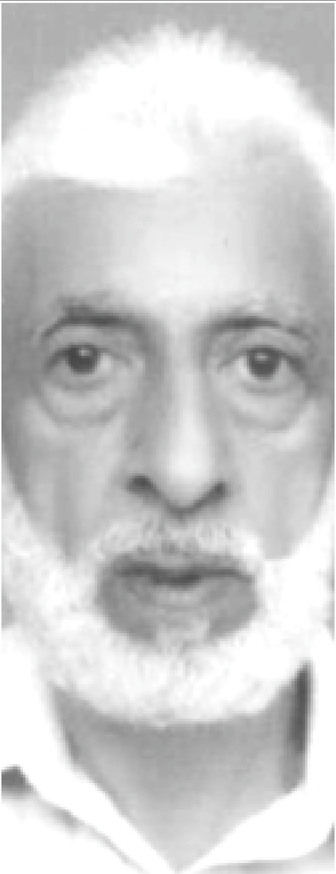

ہمایوں پرویز شاہد

عجیب دیکھا حساب تیرا
ہیں خار میرے گلاب تیرا

مرا بھی کچھ حق ہے روشنی پر
فقط نہیں آفتاب تیرا

ہوئی ہے سب کی حیات بوجھل
یہی ہے کیا انقلاب تیرا

گئے زمانے ہیں یاد مجھ کو
وہ شوخیاں وہ حجاب تیرا

سکوں کا پل بھی نہیں ہے جس میں
ہے ہجر ایسا عذاب تیرا

غرور اتنا پرائی شے پر
نہیں ہے تیرا شباب تیرا

نظر سے دل تک تھی دھند شاہد
ہوا تھا جب انتخاب تیرا

غزل

اجمل اعجاز

ساری خلقت مرے قریں آئی
جس نے آنا تھا وہ نہیں آئی

میں زمیں زاد چاند پر بھی گیا
واں بھی قدموں میں یہ زمیں آئی

رنگ بکھرے تھے میرے بستر پر
تتلی اک خواب میں کہیں آئی

زندگی جس دیار میں گزری
موت بھی آئی تو وہیں آئی

حُسنِ تقدیس کا تقاضا ہے
پاؤں سے پہلے یہ جبیں آئی

بعد مدت کے اس کو دیکھا ہے
آج پھر ساعتِ حسیں آئی

وہ نظر آئے خواب میں اجملؔ
نیند پھر ڈھنگ سے نہیں آئی

غزل

پلکیں نہیں جھکائے نہ یوں تلملائے صبح
کیسے ہے داغدار سویرا بتائے صبح

خوش بخت ساعتوں سے سجی ہو ہر ایک شام
اتنی سی التجا ہے سرِ لب خدائے صبح

بستر بدن کی آنچ سے جب کپکپا اٹھے
سرد آہوں کی کتھا بھی تڑپ کر سنائے صبح

تعبیر کی سڑک پہ مرا ہاتھ تھام کر
رستہ دکھائے یوں نہیں آنکھیں گھمائے صبح

اک بار مسکرا کے وہ دیکھے جب آسماں
تیرہ شبی کو پاؤں پہ اپنے جھکائے صبح

میں دوڑ آؤں تاروں کا لشکر لیے ہوئے
مشکل پڑے جو سر پہ مجھے آزمائے صبح

سچائیوں کا بوجھ اٹھائے گی بوڑھی رات
جگنو جوان لہجے میں جونہی بلائے صبح

خوشبو ہوا لپیٹ کے آئے مرے قریب
خوابیدہ آنکھ میں یہ کبھی گل کھلائے صبح

زنجیر سے الجھتے بدن کو رہائی دے
بیکار قہقہے تو نہ مجھ پر اڑائے صبح

میں نے کمائی تیرہ شبی میں بھی روشنی
لازم ہے میری خواہشِ خستہ کمائے صبح

مرجاؤں گا کروں گا نہ منت میں دھوپ کی
جاتی ہے مجھ کو چھوڑ کے دانش تو جائے صبح

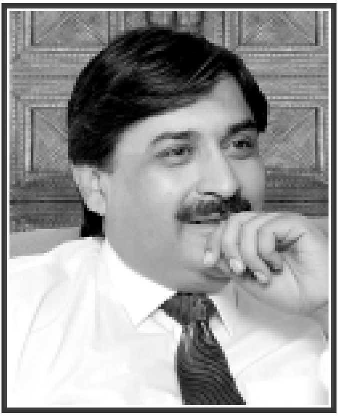

دانش عزیز

غزل

مجھے سفر کی اذیت سکون دیتی ہے
کہ ہم خیال رفاقت سکون دیتی ہے

کریدتا ہوں جو بھرتے ہیں گھاؤ سینے کے
پرانے زخم کی لذت سکون دیتی ہے

قرار آتا ہے مجھ کو کنارِ دریا پر
مجھے پہاڑوں کی سنگت سکون دیتی ہے

مرے حواس پہ اتری ہے رات وادی کی
ہوا و سبزہ کی کثرت سکون دیتی ہے

دلوں کی پیاس بجھاتے ہیں دلربا چشمے
نظر کو رہ کی نظارت سکون دیتی ہے

تمام دن کی تھکن اور فاقہ مستی کو
لذیذ و سادہ ضیافت سکون دیتی ہے

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

غزل

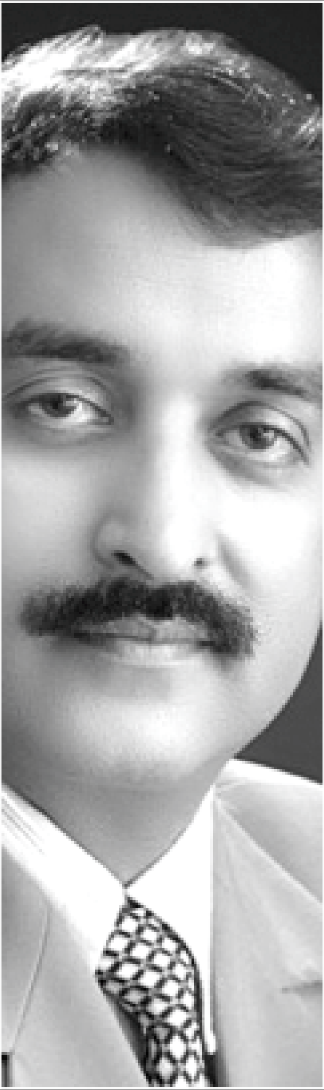

محمد اشرف کمال

اشک آنکھوں میں ستارا نہیں ہونے والا
کچھ بھی ہو اب وہ ہمارا نہیں ہونے والا

اب تو جیسے بھی گزرتی ہے گزاری جائے
اب کہیں کوئی اشارا نہیں ہونے والا

اب کہاں کوئی بسائے گا نئی دنیا کو
سانحہ کوئی دوبارہ نہیں ہونے والا

دنیا والوں کا رویہ نہیں بدلے گا کبھی
وہ جو دریا ہے کنارا نہیں ہونے والا

اس جدائی کے سوا اور بھی ہو کوئی زخم
میرا اس غم میں گزارا نہیں ہونے والا

تو نے اک بار کنویں سے جو پیا ہے پانی
اب یہ پانی کبھی کھارا نہیں ہونے والا

غزل

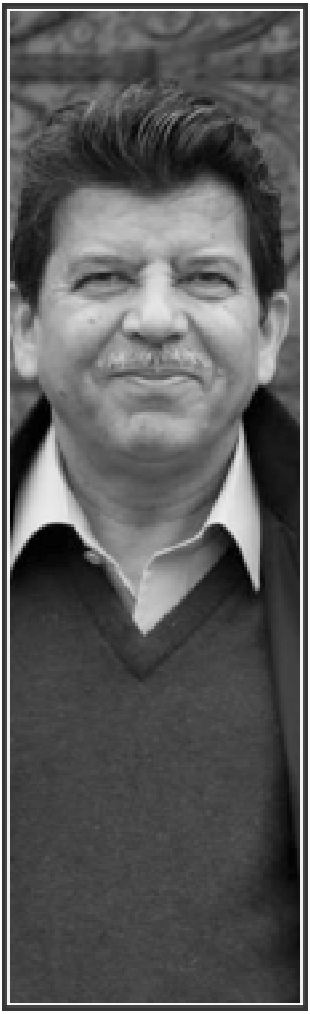

یہ سچ ہے کہ رہ میں زمانہ پڑے گا
مگر تم سے ملنے تو آنا پڑے گا

یقیں گر نہیں ہے وفا پر ہماری
تمہیں پھر ہمیں آزمانا پڑے گا

بجا ہیں یہ سامانِ ہستی پہ پھر بھی
انہیں چھوڑ کر جلد جانا پڑے گا

پریشاں رُتوں کے تغیر کی خاطر
تمہیں بس ذرا مُسکرانا پڑے گا

زمیں بیضوی ہے تو یوں چلتے چلتے
کہیں راہ میں آشیانہ پڑے گا

راجہ عبدالقیوم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ابھی تک آنکھ نَم ہے دل لہو ہے
مجھے کافی مرا پہلا وضو ہے

غزل

دن کی آغوش سے جس طرح اُجالے نکلیں
ہم تجھے چھوڑ کے گھر سے کبھی ایسے نکلیں

جن کے بارے میں کچھ اچھی نہیں رائے اپنی
عین ممکن ہے کہ وہ لوگ ہی اچھے نکلیں

اب تو چھاؤں کو ترسنے لگے پنچھی مولا!
اب تو اِس سوکھی ہوئی شاخ سے پتے نکلیں

اُس کو گھر چھوڑ کے ہر روز ہی یوں جاتا ہوں
دانہ چُگنے کے لیے جیسے پرندے نکلیں

جب شبِ ہجر اُسے ڈھونڈنے نکلوں میں ظہور
یہ بھی ممکن ہے مرے ساتھ ہی تارے نکلیں

ظہور چوہان

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

غزل

صرف آنکھوں کے مسکرانے پر
جو فسانہ بنا فسانے پر

میری پرواز دیکھنا اب کے
نوچ ڈالے ہیں سب پرانے پر

عام لوگوں سے مختلف ہیں ہم
یہ کھلے گا کبھی زمانے پر

میں بھی معیار پر نہیں اترا
وہ بھی نادم ہے آزمانے پر

تم بھلے احتیاط کرتے رہو
بات چھپتی نہیں چھپانے پر

ہم تو انسان ہیں ہمارا کیا
پھول روئے تھے اس کے جانے پر

اس کی نظروں سے کیا ملی نظریں
تیر جیسے لگے نشانے پر

کام چلتا ہے گلستانی کا
حسن والوں کے مسکرانے پر

یار سارے صغیر کھو بیٹھے
اپنے بارے میں سچ بتانے پر

صغیر احمد صغیر

غزل

چند روزہ زیست کے دن یوں گزارے جائیں گے
توبہ توبہ! کیسے کیسے روپ دھارے جائیں گے

کیا ہوا، گر آج کوئی پوچھنے والا نہیں
ہو تو اپنے بھی کبھی وارے نیارے جائیں گے

سوچنے کی بات ہے اے آنے والے انقلاب
تیرے اس چکر میں کتنے لوگ مارے جائیں گے

عدل حاصل ہو نہ ہو، زنجیر چھوٹے گی نہیں
ہو نہ ہو شنوائی، فریادی پکارے جائیں گے

گر نہ اب بھی دونوں جانب ہوش آیا دوستو
کچھ ہمارے جائیں گے اور کچھ تمہارے جائیں گے

شانۂ غفلت سے دعویٰ کر رہے ہیں سر پھرے
گیسوئے ہستی کے پیچ و خم سنوارے جائیں گے

روز افزوں نسلِ نو کو دیکھ کر لگتا ہے یوں
بچے موبائل آئیں گے، گیس غبارے جائیں گے

اے اجل، تیری عمل داری کی جے جے کار ہو
جاں سے پیارے جائیں گے، آنکھوں کے تارے جائیں گے

سوچتے رہتے ہیں بے چارے کنوارے رات دن
کیا جہاں سے ہم کنوارے کے کنوارے جائیں گے

خالد احمد کا عجب فیضان بھی فیضان ہے
کر کے اُن کو یاد، شعر اپنے نکھارے جائیں گے

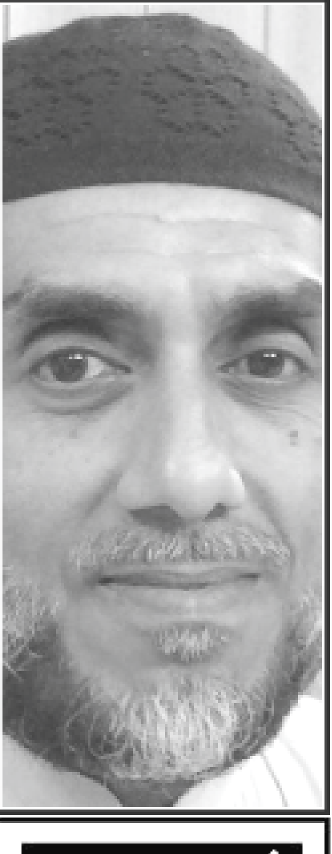

فیض رسول فیضان

غزل

زرد پھولوں پہ مینہ برستا ہوا
سوندھی مٹی سے بَن مہکتا ہوا

چاند اُگتا ہوا ہتھیلی پہ
آنکھ میں آئنہ چٹختا ہوا

کوئی کھٹکا رہا ہے دروازہ
دل مرا بے طرح دھڑکتا ہوا

بال شبنم سے بھیگ جاتے ہوئے
عکس ہر بوند میں چمکتا ہوا

شام آئی ہے میرے کمرے میں
میرے آنگن میں دن نکلتا ہوا

تیرے بارے میں مجھ سے پوچھتا ہے
باغ سے راستہ گزرتا ہوا

کھڑکیاں انتظار کرتی ہیں
اور آنکھوں میں دیپ جلتا ہوا

نیند تکیے پہ سانس بھرتی ہے
خواب اِک ساتھ ساتھ مرتا ہوا

شبہ طراز

غزل

آسماں کی گود تاروں سے کہیں خالی نہیں
سرمئی شامیں نظاروں سے کہیں خالی نہیں

کچھ نہ کچھ تو غم کی تلخی بھی لہو میں ہے رواں
شاخِ جاں کوئی بھی خاروں سے کہیں خالی نہیں

سرحدوں سے ہٹ کے رہ سکتا نہیں قائم وجود
ایک بھی دریا کناروں سے کہیں خالی نہیں

فیصلہ تو ہم نے کرنا ہے کہ جانا ہے کہاں
راستے سارے اشاروں سے کہیں خالی نہیں

سچ کو جو قرطاس تک لایا وہی مارا گیا
یہ زمیں فتنہ شعاروں سے کہیں خالی نہیں

آرزوؤں کے کھنڈر، خوابوں کے کچھ ٹوٹے مکاں
دل کی بستی یادگاروں سے کہیں خالی نہیں

خدمتِ سرکار کر کے بھی ہوئے مقروض ہم
خواہشیں پھر بھی سہاروں سے کہیں خالی نہیں

اُس کے ماتھے پر رعونت کی ہیں شکنیں موجزن
گویا پتھر بھی چناروں سے کہیں خالی نہیں

مجھ سے پُرکھوں نے تو فرمایا تھا تم آزاد ہو
زندگی اپنی حصاروں سے کہیں خالی نہیں

ہم ہی پستی کی طرف ہیں گامزن فرحان جی!
یوں زمیں ایمانداروں سے کہیں خالی نہیں

سرور فرحان

غزل

گو انتظار نقل مکانی ہے زندگی
پر دائما زمیں پہ بسانی ہے زندگی

جو لوگ حق کا کھوج لگاتے گزر گئے
تردید کر گئے ہیں کہ فانی ہے زندگی

منظر بھی کیفیت کے ہی ہم رنگ ہیں اگر
ہر روپ میں فریبِ معانی ہے زندگی

ہر ساز ترجمانِ دلِ درد مند ہو
سرتال میں کچھ ایسے ہی لانی ہے زندگی

زخموں کو قہقہوں کی رداؤں سے ڈھانپ کر
تازہ گلوں سے روز سجانی ہے زندگی

منظر کچھ اس حصار سے باہر بھی ہیں مگر
انکار کیا ہو قیدِ زمانی ہے زندگی

اس آبشار سے ہی کرے راحتیں کشید
جس جس کو آنسوؤں کی روانی ہے زندگی

دن کو چٹکتی کلیوں کا حسن و جمال ہے
ڈھلتے ہی شام رات کی رانی ہے زندگی

کیسے غلط کسی کو کہوں، کیوں اداس ہوں!
جاذب لکھی ہوئی جو کہانی ہے زندگی

اکرم جاذب

غزل

بشیر احمد حبیب

ڈوب مرنے سے تو بہتر ہے کہ پانی سے نکل
خواہشوں کے بحر کی اس بے کرانی سے نکل

آگ سے ڈھالے گئے؟ آغاز تھے پانی سے ہم!
راز سب کھل جائیں گے، اک بے مکانی سے نکل

تُو فنا ہو جائے گا اک خوش ادا کے نام پر
سوچ کی اس راجدھانی، رائیگانی سے نکل

اس سے پہلے کہ ترا کردار زنگ آلود ہو
تُو بدل دے اس کو یک سر یا کہانی سے نکل

جس کے ہاتھوں لٹ گیا میں، وہ تو کوئی اور تھا
کم سے کم اس عمر میں اس خوش گمانی سے نکل

غالب و اقبال پڑھ لے، میر بھی اور فیض بھی
شاعری کی سمت آ جا، خوش بیانی سے نکل

بارشیں سب کے لیے ہیں اور صبا سب کے لیے
میں الگ ہوں، تو الگ ہے، اس کہانی سے نکل

ہجر میں بھی وصل کی لذت کا لپکا ہر گھڑی
تُو بشیر احمد حبیب! اس خوش گمانی سے نکل

غزل

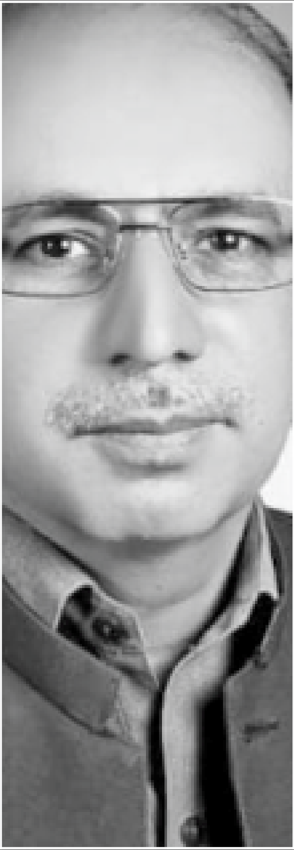

عطا ہوئے ہیں کئی حرف گفتنی جو مجھے
خلش ہے کوئی اور نہ کوئی بے کلی جو مجھے

کسی ستم کے کرم نے نہال رکھا ہے
بہم رہی ہے اذیت میں آشتی جو مجھے

حدودِ ذات کے آتش کدے کو خیر آباد
نگاہِ یار مظہر ہے جھیل سی جو مجھے

مجھے ہر ایک زمانے کی دستیابی ہے
میاں نہیں ہے کسی رنج کی کمی جو مجھے

دھواں ضرور کسی درد کا اٹھا ہے عزیز
یہ بوجھ لگتی ہے سینے پہ سانس بھی جو مجھے

عزیز عادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس شہر کی جانب مرے پاؤں نہیں اُٹھتے
اس دل سے وہی دور کرے گا یہ جھجک بھی

غزل

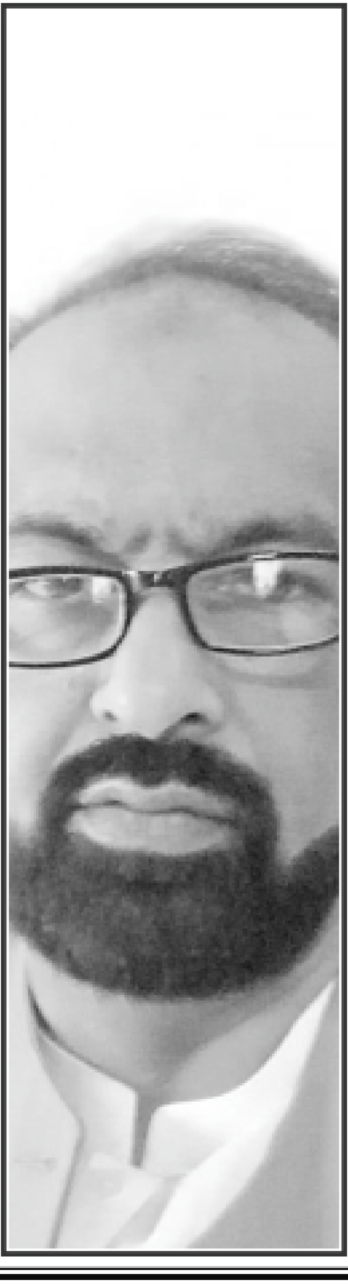

ہجر کا جب سامنا ہو جائے گا
سارا موسم ایک سا ہو جائے گا

میں سمجھتا تھا کہ تجھ کو دیکھ کر
دل گرفتارِ بلا ہو جائے گا

تیری خوابیدہ نگاہیں دیکھ کر
زخمِ خواہش پھر ہرا ہو جائے گا

لب کشائی کی اجازت دیجیے
حقِ خاموشی ادا ہو جائے گا

صرف دل سے دیکھنے کی دیر ہے
منظرِ جاں ہی جدا ہو جائے گا

ہے مرے پہلو میں تنہائی مری
تم نہ لوٹے بھی تو کیا ہو جائے گا

عاصم اعجاز

غزل

گیت گائیں خوشی سے رقص کریں
غم بھگائیں خوشی سے رقص کریں

کتنی بیزار کُن ہے تنہائی
آپ آئیں خوشی سے رقص کریں

یار آئے ہوئے ہیں محفل میں
گنگنائیں خوشی سے رقص کریں

منتظر ہیں ، کہ وہ کبھی ہم کو
گھر بلائیں خوشی سے رقص کریں

ہم تو ہر حال میں ہیں خوش جاناں
آپ جائیں خوشی سے رقص کریں

بیتے لمحے کبھی اگر عابد
لوٹ آئیں ، خوشی سے رقص کریں

عابد معروف مغل

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ابھی تک آنکھ نم ہے ، دل لہو ہے
مجھے کافی مرا پہلا وضو ہے

غزل

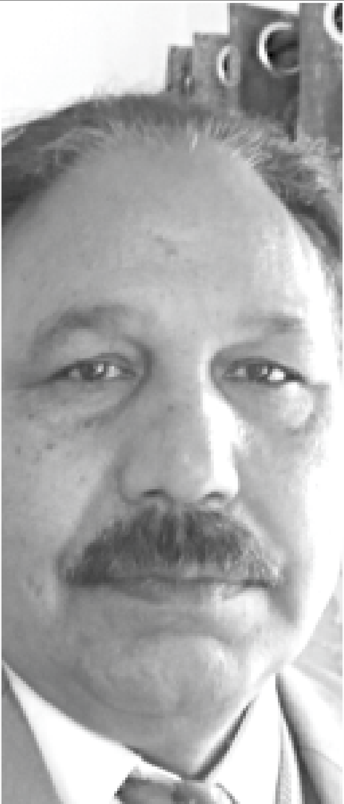

میتھیو محسن

رابطے اتنے ہمارے تیرگی سے ہو گئے
ہم تو بیگانے خود اپنی زندگی سے ہو گئے

سانس کا آہنگ ٹوٹا زندگی تو مٹ گئی
جیتے جی تو مردہ ہم پژمردگی سے ہو گئے

حال بدلا موڑا جو تقدیر نے منہ دوستو
دوستانے بھی یہاں بیگانگی سے ہو گئے

پوچھتا ہے کون اس دنیا میں اشکوں کا سبب
اپنے یارانے بھی اب افسردگی سے ہو گئے

ذات پر اُس کی بھروسا پہلے بھی تھا اب بھی ہے
سب تعلق اپنے اس کی بندگی سے ہو گئے

یوں ہوئے حیران مل کر جانتے جیسے نہیں
محسن اپنے یار کیسے اجنبی سے ہو گئے

غزل

گھاؤ لگا ہے یار سے
جا لگا دیوار سے

محوِ رقص ہوا، مجھ میں
سُر بکھرے ملہار سے

ٹھوکر تو پھر لگتی ہے
رستے ہیں دشوار سے

کتنا خوش میں لگتا ہوں
گو ٹوٹا ہوں ہار سے

کچھ خوشیاں اور غم جا کر
لے آیا بازار سے

مل جاتا ہے سب کچھ ہی
مانگوں اس دربار سے

من موہنی دیکھی صورت
ٹھیک ہوا بیمار سے

اُس کا روشن چہرہ ہے
کھل اُٹھا کردار سے

سُر کے بل تو گرنا تھے
سر اونچے دستار سے

شیریں سخن تو اپنے آپ
ہوا عیاں گفتار سے

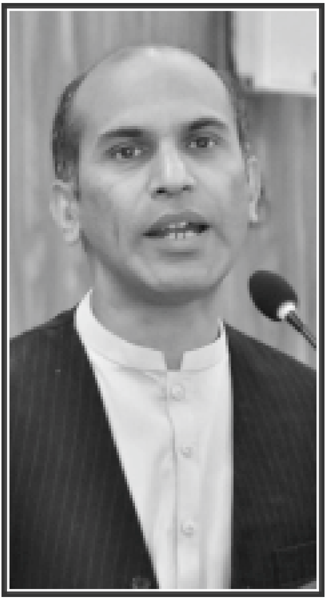

محمد شفیق انصاری

غزلیں

ہمارے بیچ ہے کیا چل رہا پتہ نہ لگے
جو خال و خد ہوں بدلتے تو ارتقا نہ لگے

روا نہیں مجھے گھٹ گھٹ کے زندگی جینا
بنا لیا ہے تعلق تو والہانہ لگے

حسیں نہیں وہ زیادہ تو کیا ہوا، اے دل
جمالیات کی رو سے مگر برا نہ لگے

میں اتنا دور چلا آیا ہوں فریب میں دوست
پلٹنا چاہوں کسی روز تو زمانہ لگے

غلو کی اس میں ضرورت نہیں بلند ہے وہ
بڑھاؤ اتنا اسے قد میں وہ خدا نہ لگے

مزاج بدلے تو بستر ہے کائنات قمر
کبھی کبھی تو یہ دنیا بھی قید خانہ لگے

قمر نیاز

کب زمین آسمان سے آیا
جو ستم تجھ مکان سے آیا

دلکشی ان لبوں کی اپنی جگہ
ذائقہ جو زبان سے آیا

دھوپ میں کس کا سایہ ہے سب پر
کوئی تو سائبان سے آیا

کیا وضاحت کمان ابرو سے
تیر بھی کب مچان سے آیا

میں یقیں سے پلٹنے والا تھا
اور یقیں پھر گمان سے آیا

آنکھ پہلے بھی خشک کب تھی قمر
نم جو تیرے بیان سے آیا

غزل

ملے گا پیار آپ کا؟
بنوں شکار آپ کا؟

سبو تو میرے پاس ہے
ملے خمار آپ کا!

قبول ہے ہر ایک شے
بھلے ہو وار آپ کا

تو موسمی عذاب تھا؟
مجھے بخار آپ کا

مرے لیے حرام ہے
یہ اختیار آپ کا

چلا گیا ہے بھاڑ میں
گلہ گزار آپ کا

بھلی ہے اس کی روشنی
بھلا ہے یار آپ کا

سنبھالنا پڑے گا کیا
ہمیں غبار آپ کا

کبھی سمجھ میں آئے گا
رضا شعار آپ کا

نعیم رضا بھٹی

غزل

وحید ناز

تیری ہی جستجو میں رہتا ہے
دل اسی آرزو میں رہتا ہے

کوئی تو بات ہے کہ تیرا ہی
تذکرہ گفتگو میں رہتا ہے

کس کی خوشبو رچی ہے پھولوں میں
کوئی تو رنگ و بو میں رہتا ہے

ذکر کرتا ہے آپ کا ہر پل
قلب میرا وضو میں رہتا ہے

اک تماشا ہے میرے چاروں طرف
اور دل ہاؤ ہو میں رہتا ہے

نفرتیں تار تار کرتا ہے
دل محبت کی جُو میں رہتا ہے

مجھے ورثہ ملا یہ پرکھوں سے
عشق میرے لہو میں رہتا ہے

کیسا غم ہے کہ ناز شام و سحر
غرق جام و سبو میں رہتا ہے

غزل

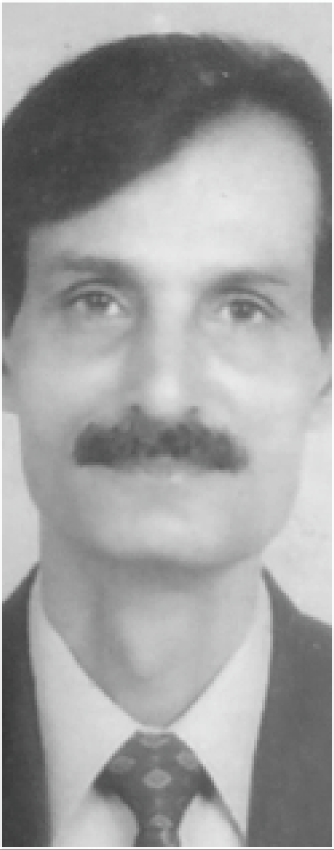

مظہر امام

یاد رکھ تری جاگیر نہیں ہوں
دست گیر ہوں کف گیر نہیں ہوں

جانیں کیا یہ تماشائی سمجھے
میں شکاری ہوں نخچیر نہیں ہوں

میرے اشکوں سے پڑھ سکتے کہانی
گزرے وقتوں کی تحریر نہیں ہوں

جب گواہ نے موقع پہ نہ دیکھا
پھر تو قابلِ تعزیر نہیں ہوں

کر توجہ مرا حال ذرا دیکھ
زندہ انساں ہوں تصویر نہیں ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آواز کا جادو بھی جگانے نہیں دیتے
چڑیوں کو وہ اب شور مچانے نہیں دیتے

غزل

کچھ اِس طرح ہے اپنی اسے سادگی عزیز
ہوتی ہے جس طرح کسی کو زندگی عزیز

ہر بات تلخ لہجے میں کرنے لگا ہے وہ
شاید اسے رہی نہیں اب دوستی عزیز

جس سے مرے قریب کے گھر جل اٹھیں خدا
ہرگز نہیں ہے ایسی مجھے روشنی عزیز

تجھ پر نہ حرف آئے مری لب کشائی سے
مجھ کو اسی لئے ہے فقط خامشی عزیز

جو غیر ہو کے بھی ہے مرا آشنائے حال
دل کو ہے روشناس سے وہ اجنبی عزیز

مجھ کو نہیں خیالِ زر و مال کی ہوس
ہر کام سے ہے بڑھ کے مجھے شاعری عزیز

زبیر خیالی

مری بات کہتے رہنا، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علَم فرو نہ کرنا، یہ فلک سجائے رکھنا

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

غزل

بے وفائی کی حمایت نہیں ہونے والی
اب ترے ساتھ محبت نہیں ہونے والی

دلِ وحشی ترے دھوکے میں نہ اب آئیں گے
اب کبھی تیری اطاعت نہیں ہونے والی

میں سمجھتا ہوں وفاؤں کا تقاضا کیا ہے
میری جانب سے شکایت نہیں ہونے والی

کیا مجھے رہنا ہے محرومِ تمنا یوں ہی
مجھ پہ کیا تیری عنایت نہیں ہونے والی

ہم طرف دار ہیں مظلوم کے ہم لوگوں سے
ظالموں کی کبھی بیعت نہیں ہونے والی

ہم اُجالوں کے طرف دار رہیں گے پھر بھی
شبِ تیرہ کی حمایت ہونے والی

یہ عدالت ہے محبت کی مرے دوست! یہاں
کبھی مجرم کی وکالت نہیں ہونے والی

جن کے ہوتے ہوئے تقدیر بدل جاتی تھی
اب میسر وہ قیادت نہیں ہونے والی

وہ فسانہ تو دوبارا نہیں لکھا جانا
وہ کہانی تو عبارت نہیں ہونے والی

ایک ٹھہراؤ ہے اب میری طبیعت میں نبیل
اب کسی کام میں عجلت نہیں ہونے والی

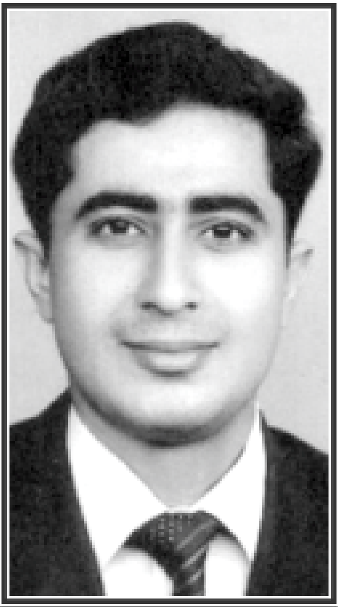

نبیل احمد نبیل

غزل

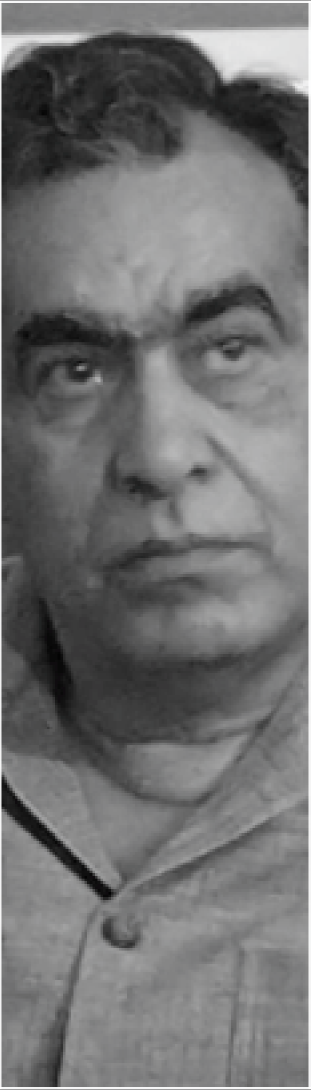

اس طور تری بزم سے اک روز اٹھا میں
نظروں سے گرا میں نہ ترے دل میں رہا میں

اک تیر چلایا جو کبھی تیز ہوا نے
اس تیر کے پیچھے تھا بہت دور گیا میں

جب درد اٹھے دل پہ رکھوں ہاتھ کہوں خیر
پھر ڈر نہ رہے کوئی کروں شکر ادا میں

کیا دن تھے کہ تخلیق خیالوں نے کیا تھا
منظر وہ انوکھا کہ رہا جس میں سدا میں

اک جام تصور میں دیا پیر مغاں نے
پھر اِس پہ گرا میں تو کبھی اُس پہ گرا میں

سڑکوں پہ کہیں سایہ نہ پانی ہے میسر
آواز درختوں کی کبھی سن نہ سکا میں

میداں میں کھڑا ہوں تو یہ سب اس کا کرم ہے
اک شخص بہت عام سا لکھا نہ پڑھا میں

اورنگزیب حسام حر

غزل

ہوا ہے مجھے یہ گماں رفتہ رفتہ
زمیں کھا گئی آسماں رفتہ رفتہ

نہ پوچھو شبِ غم کٹی کس طرح سے
سنو بس مری داستاں رفتہ رفتہ

گری برق میرے نشیمن پہ آ کر
جلا ہے مرا آشیاں رفتہ رفتہ

بھنور سے نکل آئے گی اب یہ کشتی
ہے کھلنے لگا بادباں رفتہ رفتہ

رہیں گے نہ چاہت کے آثار باقی
مٹیں گے یہ سارے نشاں رفتہ رفتہ

قفس سے رہائی ملی دیکھنا اب
کھلے گی مری اب زباں رفتہ رفتہ

رہیں گی نہ تاریکیاں اب مقدر
اب اترے گی اک کہکشاں رفتہ رفتہ

رہا کب تعلق میں اب وہ تسلسل
خلا آ گیا درمیاں رفتہ رفتہ

میں اشفاق پھر آ گیا ہوں وہیں پر
چلا تھا جہاں سے وہاں رفتہ رفتہ

محمد اشفاق بیگ

غزل

جانے کدھر سے، کیسے، کب آیا ہے ایک شخص
قلب و نظر میں میرے سمایا ہے ایک شخص

دُنیا کے لین دین میں تو بس زیاں ہوا
ہاں کاروبارِ دل میں بچایا ہے ایک شخص

میں نے نبھایا عشق تو سب کا ادا ہوا
شرعِ وفا میں فرضِ کفایہ ہے ایک شخص

اُس کے ہی رنگ ڈھنگ کھلے ہیں نگاہ میں
یوں گلشنِ نظر میں اُگایا ہے ایک شخص

نعمان وہ جو میری ہے واحد پناہ گاہ
سارا زمانہ دھوپ ہے، سایہ ہے ایک شخص

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عکسِ جمالِ مستقل، کھنچ کے رہ گئے خجل
ہم کہ یہاں تھے میہماں، ایک دن ایک رات کے

غزلیں

سونی پلکوں پہ جگمگ ستارے لیے
میں فقط جی رہا ہوں تمہارے لیے

بٹ گئی روشنی خاص لوگوں میں سب
رہ گئی تیرگی بس ہمارے لیے

کب تلک زندگی یوں ہی بے سود سی
کب تلک زندہ رہنا خسارے لیے

دنیا والوں کا ہم نے بگاڑا ہے کیا
سوچتے ہیں برا کیوں ہمارے لیے

کچھ ابھی تک ہیں طوفاں سے الجھے ہوئے
کچھ تو کب سے ہیں بیٹھے کنارے لیے

کچھ کتابیں لیے طفل اسکول میں
کچھ ہیں سڑکوں پہ افضل غبارے لیے

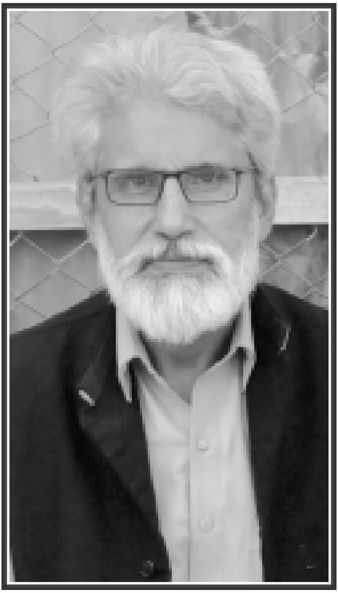

افضل ہزاروی

آنکھ میں اشک بن کر ملال آ گیا
جب بچھڑنے کا لب پر سوال آ گیا

بھول بیٹھی ہیں آنکھیں جھپکنا مری
روبرو آج کس کا جمال آ گیا

کل تلک تو نہیں تھی کوئی ایسی بات
کس طرح آج شیشے میں بال آ گیا

ہنس کے ٹالے ہے وہ میری ہر بات کو
دل دکھانے کا اس کو کمال آ گیا

ناز تھا چڑھتے سورج کو خود پر بہت
شام ہوتے ہی اس کو زوال آ گیا

بڑھ گئی رونقِ بزم دیکھو ذرا
کون محفل میں یہ خوش خصال آ گیا

پھر نہ اڑنے کا افضل ملا راستہ
سامنے جب پرندے کے جال آ گیا

غزل

اک نظر تجھ کو فقط دیکھ لیا کافی ہے
میری آنکھوں کے لیے اتنی ضیا کافی ہے

اپنے بارے میں کوئی رائے نہ دوں گا ہرگز
تُو نے جو کچھ بھی مرے بارے کہا کافی ہے

اِس کی کرنوں سے اُجالا ہے مرے چاروں طرف
دل کے حُجرے کے لیے غم کا دِیا کافی ہے

یار ممنون ہوں تُم سب کا، کہ یوں میرے لیے
جِس نے جو کچھ بھی کیا، جتنا کیا کافی ہے

ہائے کچھ وقت مرے ساتھ رہا پھر یہ کہا
میں جو کچھ وقت ترے ساتھ رہا کافی ہے

محمد کاشف حنیف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رَس بَس جا ، یوں ، تو مجھ میں
آئے تری خو بو مجھ میں

غزلیں

تیرگی کو اُجالنا پڑے گا
خود کو سورج میں ڈھالنا پڑے گا

داد خواہی اگر ہے پیشِ نظر
شعر اچھا نِکالنا پڑے گا

یُوں گداگر نہیں ہے جانے کا
جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑے گا

نہ ہی بچے نہ والدین مرے
خود کو خود ہی سنبھالنا پڑے گا

کھیل کے بعد فیصلہ ہو گا
آج سِکّہ اُچھالنا پڑے گا

امجد مرید حیدری

زعمِ حزم و گمان سے نکلا
سُرخرُو اِمتحان سے نکلا

عطر افشاں تھی رات کی رانی
سانپ کچّے مکان سے نکلا

ہم زمیں پر اِدھر اُدھر بھٹکے
راستہ آسمان سے نکلا

گھونسلے میں ڈرے پرندے کا
خوف آخر اُڑان سے نکلا

ہائے! وہ ہونٹ اور اُن پہ دیپک راگ
ایک شعلہ سا تان سے نکلا

غزل

محمد علی ایاز

نہ صرف یہ کہ ابھی بارشوں سے واقف ہیں
ہم اپنی ذات کے سب موسموں سے واقف ہیں

اگرچہ ہم نے ابھی تک نہیں اڑان بھری
اے آسمان تری وسعتوں سے واقف ہیں

ہے کون کون گرفتار خبطِ عظمت میں
ہم اپنے شہر کے سب جاہلوں سے واقف ہیں

کسی بھی شخص کی باتوں میں آنے والے نہیں
ہم اپنے دوستوں اور دشمنوں سے واقف ہیں

ہم ایک پیڑ کی مانند راستے پر ہیں
اور آتے جاتے ہوئے قافلوں سے واقف ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پتھر ہوں، مجھ کو بھی رتبہ، مل جائے شہکار کا
شرط، کہ ضرب لگائے تیشہ، دنیا سے فنکار کا

غزلیں

اب وہ پچھتا رہا ہے رات کے بعد
ٹوٹ جائے گا دل برات کے بعد

کیسا خطرہ ہے بول پڑنے پر
مر نہ جائے گا اپنی بات کے بعد

میڈیا نے بڑی ترقی کی
رات دن اور قلم دوات کے بعد

میری غزلوں پہ بات تو ہوگی
ہوگی لیکن مری وفات کے بعد

چاہے جانے پہ تو غرور نہ کر
تجھ کو چاہا ہے اپنی ذات کے بعد

زندگی کا اصول ہوتا ہے
جیت ملتی ہے پہلی مات کے بعد

رخسانہ سمن

ہاتھ اڑتی ہوئی پتنگ لگے
جسم پر جیسے جبہ تنگ لگے

چوڑیوں کی کھنک ، دعا کرنا
مجھ کو بھی ہیر جیسا رنگ لگے

تیری آنکھیں ہیں پھول کا نقشہ
تیری باتوں سے کوئی سنگ لگے

تیری مٹی میں عشق بہتا ہے
تیری مٹی کا نام جھنگ لگے

ایک حیرت مجھے خراب کرے
تو بلا وجہ مجھ کو دنگ لگے

غزل

خراشیں بدگمانی کی اتاروں
تو پھر عرضی محبت کی گزاروں

وہی شامل نہیں جب زندگی میں
تو گیسو زندگی کے کیوں سنواروں

مرے دل میں ٹھکانہ ہے غموں کا
کرم کا شکر اب کیسے گزاروں

تقاضے ختم ہو جائیں وفا کے
میں تُم پر زندگی اپنی جو واروں

مرے ہر شعر میں تو بولتا ہو
میں اپنے شعر کو ایسے نکھاروں

مجھے آغوش میں اے موت لینا
اگر میں زندگی سے جنگ ہاروں

عبدالرؤف زین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سو تھے ، ہمی غبار فرما
تو تھا کہ ہوا کا قہقہہ تھا

غزلیں

آنکھ لڑتی رہی محبت سے
عشق ہوتا رہا سہولت سے

دنیا والوں سے میں ڈری ہی نہیں
بچ گئی ہوں بڑی عداوت سے

مشکلوں میں کبھی نہ پڑتا تو
چلتا رہتا اگر شرافت سے

رابطے ترک کر دیے سارے
جان چھوٹی ہے اس مصیبت سے

واسطہ رب کا گل نہیں دے گی
کھینچ لائے گا وہ کرامت سے

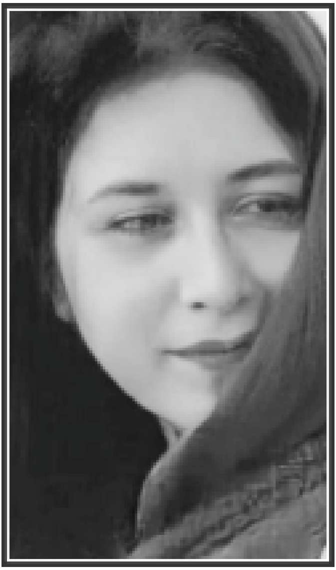

کوکی گل

یہ بادل بارشیں برسائے، تب نا
ٹھہرنے کا بہانا لائے، تب نا

چلی تو جاؤں، لیکن کیسے، بولو!
کوئی رستہ نظر بھی آئے، تب نا

پہاڑوں میں ہی جی کو میں لگا لوں
کوئی منظر بھی دل کو بھائے، تب نا

وہ آئے، اور کہہ دے جان میری!
مرے بن اس کا دل گھبرائے، تب نا

میں ایسے کس طرح جینے کا سوچوں
وہ گل کے سامنے آ جائے، تب نا

غزل

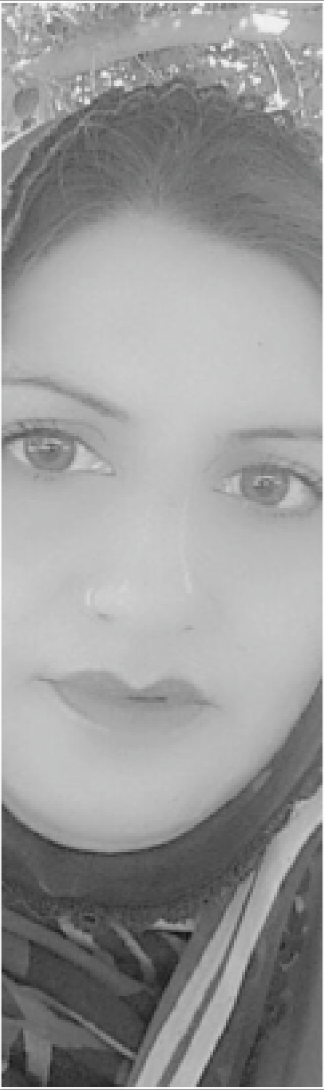

ایسے جینا کوئی کمال نہیں
ایک بھی دوست حسبِ حال نہیں

تم نے تو بات پھر گھما دی ہے
ایسا بھاری مرا سوال نہیں

آہٹیں سن رہی ہوں مدت سے!
تیرے آنے کا احتمال نہیں

ہاتھ میں ہاتھ آ گیا، لیکن
اُس کو دل سے مرا خیال نہیں

زندگی کٹ رہی ہے ٹکڑوں میں!
یہ جو ہے یہ بھی میرا سال نہیں

ہنستے چہرے نے رکھ لیا ہے بھرم
تو نے دیکھا ہمارا حال نہیں

صدق دل سے لکھا ہے جو بھی لکھا
وجہِ شہرت فقط جمال نہیں

اتنی مصروف ہو گئی ہوں حنا
مجھ کو آتا مرا خیال نہیں

حنا بابر چودھری

چھبیس کلومیٹر والی سرکار

طالب علم واپسی کی بکنگ کروا کر بیٹھا تھا۔
مامے سے خبر ملی کہ ابدال بیلا آ رہے ہیں۔
مفتی جی سے زندگی میں نہ ملنے کا افسوس لیے ہوئے جب انکے بالکے سے ملنے کی خوشی میں بکنگ کینسل کروادی۔ کسی بڑے روحانی ادیب سے ملنے کا پہلا موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔
ادیب بھی وہ جو روحانی پرواز کے ساتھ محبِ وطن بھی۔
خاص موقع تھا۔
محفل پوری رات جاری رہی۔ محفل کی مرکزی شمع شاہؒ جی تھے۔ بیلا صاحب کو شاہؒ جی کی چاہت ملتان سے بہاولپور لے آئی۔
شاہؒ جی ان بہت سارے کرداروں میں سے ایک گمنام کردار۔ بڑی روحانی شخصیت۔ اللہ نے علم لدنی سے نوازا۔ ساتویں جماعت فیل۔ اللہ نے فراست عطا فرمائی۔ نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز کے عین مطابق۔ بیلا صاحب نے بھی سفر در سفر روحانی سفر کیے، مگر کہتے شاہ جی کمال کے ہیں۔ مجھ سے مبتدی کو بھی بیلا صاحب کی روحانی یاترا سے تھوڑا بہت سیکھنے کو مل جاتا۔ خالص روحانی غذا مل جاتی۔ عجیب ہی رنگ ہوتا۔
شاہ جی بھی پیٹھ پیچھے کہتے، بڑی پرواز ہے اس بندے کی۔ اس پہلی ملاقات کے چند سال بعد شاہ جی انتقال کر گئے اور بیلا صاحب بھی مڑ کر نہ آئے۔ میرا دل تو پہلے ہی ان کی طرف جھکا ہوا۔ اسلام آباد میں نوکری مل گئی۔ لگتا وارے نیارے ہو گئے، پھر سے وہی ملاقاتیں۔ بس بندے دو رہ گئے۔
بیلا صاحب اور بالکا۔
ہفتے میں دو چھٹیاں ہوتیں تو ڈیڑھ دن ان کے گھر گزرتا۔
گپ شب چلتی رہتی۔ رات ہوتی تو میں اجازت مانگتا۔ کہتے، رہ جا۔ میں رہ جاتا۔ کیوں کہ بہت کچھ رہتا، پوچھنے والا، سمجھنے والا۔
اگلی رات پھر بھی کچھ ہوتا۔ اگلی ڈیوٹی شروع ہونے سے کچھ گھنٹے قبل چھٹی ملتی۔
اکثر پوری رات جاگ کر گزارتے۔ صبح ہونے پر سو جاتے۔ کیا سردی کیا گرمی کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ سردی ہوتی تو یہ ہیٹر جلا کر اس

فہد حمید

کے قریب ہی کرسی کر لیتے۔ ایک دفعہ کچھ شاید باتوں کی گرمی سے کچھ ہیٹر کی قربت سے کرسی کی ٹیک پر پڑے گندولے کو آگ لگ گئی۔ یہ خطرہ سے بے پرواہ اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجھے ان کے پیچھے آگ بھڑکتی نظر آئی۔ لپک خبردار کیا۔ انہوں نے اٹھتے ہی مشکل سے آگ کو خود بجھایا۔

ایک سخت سردی کی رات کے پورے ساڑھے تین بجے، ان کے موبائل پر کال آئی۔ میں پریشان ہوا کہ یا اللہ خیر ہو اس وقت۔

مگر یہ فون اٹھاتے ہی نہ سلام نہ دعا، کہا۔

اوہ دنی ٹی رات دے ساڑھے تین وجے

دنی ٹی نے پتہ نہیں کیا کہا کہ دعائیں دینا شروع کر دیں۔ حالانکہ ان دنوں ٹی وی پر دنی ٹی کو تلف کرنے کے لیے دوائیں بتائی جاتی تھیں۔ یہ عجیب کسان ہے جو دنی ٹی کو دعائیں دے رہا ہے۔

ہر آدمی کی طرح ان کے بھی کئی رخ ہیں۔

فوج میں افسر رہے، اُدھر اور رنگ رہا۔ فوج میں بھی مسیحائی کرتے رہے۔

ڈاکٹری بھی کرتے رہے، ڈاکٹری کرتے ہوئے پہلا نسخہ طبی حکمت والا بتاتے۔

کلینک چلایا۔ کوئی مرض کی آخری سٹیج والا مریض آ گیا تو اس سے فیس بھی نہ لی۔

مریض کا درد محسوس کیا تو کلینک بند کرنا پڑا۔

آپ تو جانتے ہیں ان کی پریکٹس زیادہ چلتی ہی جو مریض کا درد محسوس نہ کرتے ہوں۔

ادیب تو نوکری سے پہلے ہی تھے۔ لکھا تو ضخیم ضخیم کتابیں عرق ریزی کر کے لکھ ڈالیں۔

میں کیا کہوں، مفتی جی پہلے ہی کہہ گئے، یا اللہ، یہ ابدال بیلا کیا چیز ہے۔

اسی چیز کی تلاش میں میں لگا رہا۔ کسی طرف سے کوئی ایک سرا نظر آیا تو دوسرا نظر نہ آیا۔ بیچ میں صدیوں کی مسافت، میں کہاں تک چلتا۔

اگرچہ مجھے ورانگ بھی دی گئی۔

میں نے شاہ جی سے کہا، شاہ جی اس بندے کی میرے دل میں بڑی چاہت ہے۔

کہنے لگے، بے پرواہ مست ہے۔ سوچ لے۔

میں نے ہلکی سی تیز آواز میں احتجاجا کہا، شاہ جی۔

کہنے لگے، میں نے تجھے بتا دیا ہے آگے تیری مرضی۔

بس پھر میں نے ہمیشہ کی طرح اپنی مرضی کی۔

پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

بس ایک دفعہ دیکھا۔

حالانکہ بچپن سے کہانیوں کے اختتام میں پڑھا تھا کہ کسی مشکل حالات سے نکلتے ہوئے مڑ کر نہ دیکھنا، ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔

میں بھی پتھر کا ہو گیا۔

غلطی میری ہی تھی۔

یہ بیمار تھے، CMH میں داخل تھے۔

میں اپنے گھر کا سامان پیک کر کے واپس اپنے آبائی شہر بہاول پور جانے کے لئے تیار تھا۔ کمپنی بند ہو گئی تھی۔ کئی مہینے تک کوئی ذریعہ معاش نہ ملا تھا۔

ہسپتال میں ملاقات کئی گھنٹے رہی۔ اس وقت یہ سیرت پر اپنی کتاب آقاؐ لکھ رہے تھے۔

مجھے اس سے ایک سبق سنایا، فیمیوں والا۔
پھر کمرے سے باہر آ کر کھلے آسمان تلے بیٹھ گئے۔
تھوڑی دیر بعد میں نے بھاری دل کے ساتھ اجازت مانگی۔
صدیاں بیت گئیں۔
وقت تو ویسے ہی جذبات سے ناپا جاتا ہے۔
صدیوں بعد اجازت ملی۔
میں بھاری قدموں سے چل دیا۔ کچھ دور جا کر مڑ کر دیکھا۔
اشکبار نظر آئے، میرا بھی یہی حال تھا۔
بقول جمیل احمد عدیل صاحب، رقت کی ان کو بیماری ہے۔
بس اس دن مڑ کر دیکھا، اس کے بعد بالکل نہیں، اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔
میری جو تلاش مفتی جی کے لئے تھی وہ انہیں پر آ کے ختم ہوئی۔
نجیبہ عارف صاحبہ کے بقول "محبت کرنے والے مرجاتے ہیں اور محبت سے محروم زندہ رہتے ہیں"۔
ادب تو مفتی جی سے شروع ہوا اور ان پہ ختم۔
جو انکے قریب ہوا وہ میرے دل کے قریب جو دور رہا وہ دور۔
ایک رات مجھے کہا، ایک بندے کی کہانی سنانی ہے، تھوڑی ہی میں نے سنی ہے باقی حل کر سکتے ہیں۔ سرما کی ایک سرد رات میں وہ بندہ آیا۔ جس نے اپنے بھائی کے قاتلوں سے راضی نامہ کے بعد ایک موقع پر اپنے بارے میں اتنا سننے پر کہ "ایک مکھی یہ بیٹھی ہے"، پر گھر سے پسٹل لا کر تین بندوں کا قتل کر ڈالا۔ ساڑھے تین سال جھنگ میں جیل کاٹی۔ پھر راضی نامہ ہونے پر رہا ہوا۔ منگیتر کے گھر والوں نے شادی سے انکار کیا تو منگیتر کو اغوا کر لیا۔ دشمنوں سے بچتا بچاتا، بیلا صاحب کے محلے کے قریب اسلام آباد آ بسا۔ عجیب آدمی تھا۔ پیشہ سے سنگتراش تھا۔ پہاڑوں سے نکلے پتھروں کو کہتا کہ یہ پتھر نہیں پرانے دور کے آدمی ہیں۔ اس رات بیلا صاحب اور مجھے اس آدمی نے اپنی مہماتی کہانی سے مسحور کئے رکھا۔ بیلا صاحب کہنے لگے، میں نے اس پر کہانی لکھنی ہے۔
وہ سنگتراش اپنے کام میں بھی ماہر تھا۔ بیلا صاحب کے گیراج میں لگے ماربل میں نمکیات واضح ہونے سے انکا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔ سنگتراش نے کہا میں اس کا حل کر دوں گا پر شرط یہ ہے کہ رات کے وقت کروں گا اور کوئی دیکھے گا نہیں۔ بیلا صاحب نے بڑی کوشش کی کہ بس میں دیکھوں گا بتاؤں گا نہیں۔ پر وہ نہ مانا۔ آخر اس کی شرط پر کام کروایا گیا۔ اور مسئلہ واقعی حل ہو گیا۔ یہ بہت دل گرفتہ ہوئے کہ مسلمانوں میں یہ بیماری عام ہے کہ اپنا فن کسی کو سونپتے نہیں ہیں اسی وجہ سے یہ آگے نہیں بڑھ پا رہے۔
شاہ جی کے پاس آتے تو ان کے ہاتھ پاؤں دبانا شروع ہو جاتے۔ ساتھ ساتھ کہتے

جاتے، شاہ جی کوئی بھید بتائیں۔ انکے پوچھنے سے ہمیں بھی مقابل جانا۔ شاہ جی ان لوگوں میں سے تھے جو مناسب فاصلہ رکھنے کے قائل، جبکہ بیلا صاحب، گڈ مڈ کے۔

بیلا صاحب پہلی دفعہ جب ماموں کے گھر آئے تو گھر کے اندر ایک چھوٹی سی میٹنگ ہوئی کہ بندہ پہلی دفعہ گھر آیا ہے کیا دیا جائے۔

گھر میں موجود ایک ان سلے سوٹ پر اتفاق ہوا۔ سوٹ پیش کیا گیا تو کہنے لگے مجھے حکم نہیں ہے لینے کا۔ کہنے لگے مفتی جی نے مجھے منع کیا تھا۔ مامے نے کہا، کہ میں مفتی جی کی بیگم کے لئے دوپٹہ لے گیا تھا، نہ نہ کہتے ہوئے مفتی جی نے آخر کہا کہ، چل رکھ جا۔

اس واقعے کو سند بنا کر کوشش کی گئی۔ مگر یہ نہ مانے۔

اُدھر ماما بھی بہت جذباتی آدمی وہ بھی نہ مانے۔

تھوڑی دیر بعد کہنے لگے، یہ سوٹ میرا ہو گیا نا؟ مامے نے کہا، ہاں

فوراً اُٹھا کر شاہ جی کے سامنے رکھ دیا اور کہا شاہ جی میری طرف سے قبول کریں۔

شاہ جی نے مسکرا کر مامے کی طرف دیکھا اور کہا، تو دیکھ لے، تجھ سے بھی بڑے بڑے پڑے ہیں۔

مامے نے کھسیا کر کہا، میں نے کب دعوی کیا ہے کہ میں بڑا ہوں۔

شاہ جی سے بھید پوچھتے پوچھتے اکثر اپنے بھی بھید بتا جاتے۔

شاہ جی کو ہاتھ دکھا کر کہنے لگے، شاہ جی میرا ہاتھ دیکھ کر بتائیں۔

شاہ جی کہنے لگے اچھا ہاتھ ہے پر مجھے ہاتھ نہ دکھائیں۔

یہ اصرار کرتے۔

شاہ جی کہتے پردے کا وقت ہے۔ شاہ جی رات کو خواب سنانے سے بھی منع کرتے کہ یہ پردے کا وقت ہے۔

بھارت میں بھی جب بیلا صاحب روحانی یاترا پر گئے تو وہاں ایک پنڈت کو جو ہاتھ دیکھ کر مستقبل کا بتاتا، اس نے بھی انکار کر دیا کہ رات کا وقت ہے دن کے وقت آئیے گا۔ اگرچہ ظاہر میں تو ڈاکٹر کیول دھیر کا لدھیانہ سے بلاوا تھا۔ جہاں ان کے اجداد نے اپنی زندگی کا وقت گزرا، مگر اصل میں انکی روحانی سیر اور انعامات کی وصولی کا دورہ تھا۔

شاہ جی نے انکا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ آپ کی خواجہ خضر سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ کہتے، پتہ نہیں، مگر میٹرک میں مجھے آقا کی زیارت ہوئی تھی۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے اور میں پیاسا ہی رہ گیا۔

کسی نے انکے بارے میں لکھا یہ پہنچ جانے والوں میں سے ہیں پہنچ جاتے ہیں۔ شاہ جی کے ساتھ آخری ملاقات میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے شاہ جی مامے کے گھر نہ آسکے، تو بیلا صاحب خود چل کر شاہدرہ کی گلیوں میں شاہ جی کے تین مرلہ گھر میں جا پہنچے۔

گلے ملتے ہی نہ سلام نہ دعا

کہنے لگے، شاہ جی، نام ہمارا، رینک آپ کا۔
بیلا صاحب کہنے لگے کہ میں دو لوگوں سے مشورہ کرتا ہوں۔ ایک شاہ جی اور دوسرے پروفیسر صاحب۔
یہ الگ بات ہے کہ بعد میں دکھی ہو کر دو مواقع پر پروفیسر کے متعلق بے اعتمادی ظاہر کی۔
ایک دفعہ کہا، ہاں جی، صبح ایک جرنیل آ کر ملتا ہے تو شام کو ایک پیشین گوئی کر دیتے ہیں۔
دوسری دفعہ کہا، کہ یہ مفتی جی کے لگائے ہوئے ناجائز بوٹے ہیں۔
بندہ سوچے کہ کدھر جائے
الٰہی تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری
کچھ ادبی ان مٹ کرداروں سے ان کے طفیل ملاقات رہی۔
ان میں امجد چودھری جو ISPR میں ہیں۔ اس بندے پر مجھے ہمیشہ ہی رشک رہا۔ اس کے علم اور روحانیت دونوں کی وجہ سے۔ یہ بھی خزانہ لوٹنے والوں میں سے ہے۔ بیلا صاحب کی طرح پکا ہاتھ ڈالتا تھا، وار خالی نہ جاتا۔ اکثر اوقات روحانی معاملات میں سہولت کاری بھی کرتا اور پکڑا بھی نہیں جاتا۔
بیلا صاحب بیٹھے لکھ رہے ہیں، امجد کی کال آتی ہے کہ فلاں بزرگ کہہ رہے ہیں کہ بیلا صاحب کی لکھنے والی ٹیبل پر حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کی کتاب کشف المحجوب تو ہے ہی نہیں۔ بیلا صاحب فوراً اٹھتے ہیں اور بیسمنٹ میں بنی لائبریری سے کتاب لا کر اپنی میز پر رکھ لیتے ہیں۔ اس سے مجھ پر واضح ہو جاتا کہ یہ عام میں خاص ہیں اور خاصوں میں خاص الخاص۔
اور بھی کئی انہونے واقعات ہیں۔
بیلا صاحب کی اسی روحانی پرواز نے ہی تو مجھے انکی طرف مائل کیا۔
بندہ سوچے کہ کیا کیا لکھوں اور کیا چھوڑ دوں۔
ایک سمندر ہے ٹھاٹھیں مارتا ہوا، مجھ سا ناتواں کشتی پر کتنی دور جا سکتا ہے؟
لکھنے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔
بے ادب بھی ادبی ہو جائے۔
ایک دن کال آئی کہ عکسی مفتی کی کتاب ''اللہ ماورا کا تعین'' کی تقریب رونمائی ہے مرینا ہوٹل میں۔ مجھے دعوت نامہ آیا ہے تو بھی آ جا۔ میں پریشان، کہ بلاوہ تو ان کو آیا ہے میں کس طرح جاؤں۔ میں تو ان لوگوں سے ہوں جو بلاوہ پر بھی نہ جانے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور یہ تو پھر بن بلایا جانا ہے۔
خیر ہمت کر کے چلا گیا۔ نجیبہ صاحبہ نے میلا لوٹ لیا۔ میں خالی گیا تھا، بھرا لوٹا۔ عشا کے بعد ان کی بیگم صاحبہ کی کال آئی کہ کب آنا ہے؟
گھر بتا کر آئے تھے کہ مغرب کے بعد۔ بعد میں مجھے کہنے لگے کہ یار عشا کے بعد بھی تو مغرب کے بعد ہی ہے۔ کچھ معاملات میں ایسے کہ
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر۔
ڈاکٹر کیول دھیر سے جنھوں نے ان کے

ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' کا ہندی میں ترجمہ کیا، بھی جب ہندوستان سے پاکستان آتے تو ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ بیلا صاحب اور ڈاکٹر کیول دھیر کے بیچ فنی معاونت اور ڈاکٹر کیول دھیر کا انسائیکلوپیڈیا، وکی پیڈیا پر تعارف بھی ابدال بیلا کے نقش کے نام رہا۔

قدرت اللہ شہاب صاحب، مفتی جی اور اشفاق احمد کے اعزاز میں محکمہ ڈاک نے اعزازی ٹکٹ جاری کیے - تقریب پوسٹل آفس کے G-8 اسلام آباد میں ہوئی۔

تقریب کی صدارت بانو آپا نے کرنی تھی، مگر وہ نہ آسکیں۔ قدرت اللہ شہاب صاحب کی بھانجی میڈیم ثمینہ قادر نے صدارت کی۔

شہاب صاحب کے بیٹے ڈاکٹر ثاقب شہاب نے کینیڈا سے آن لائن شرکت کی خواہش کی۔

میں تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچا تھا، کہا کہ پہلے بتا دیتے تو انتظام ہو جاتا۔ بیلا صاحب سے ڈانٹ کھائی کہ آخری وقت پر آتے ہو، پہلے آؤ تو کام ہو سکے۔

کچھ سال پہلے میڈیم ثمینہ قادر سے اپنی VC پروفیسر ڈاکٹر صاعقہ امتیاز آصف کے توسط سے بات ہوئی، پتہ چلا کہ یہ بھی بیلا صاحب کے پڑوس میں رہتی ہیں، ڈاکٹرز ٹاؤن میں۔ آج کل راجہ گدھ کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی ہیں۔ اس کی انھوں نے بانو آپا سے اجازت بھی لے لی تھی۔

میری رہائش گاہ سے انکا گھر 26 کلومیٹر تھا۔

میری ہمشیرہ نے اسی لیے انکا نام 26 کلومیٹر والی سرکار رکھ دیا۔

شکر ہے اللہ نے سواری اور جذبہ دونوں دیئے۔

جب دل چاہتا چلا جاتا۔ خوب گپ شپ چلتی، رات دن کا ہوش ہی نہ ہوتا۔ ہوش تب آتا جب ڈیوٹی کا ٹائم ہونے والا ہوتا۔

ایک رات انکی بیسمنٹ میں بنی لائبریری میں بیٹھے تھے۔ لائبریری بھی انھوں نے کچھ اس طرز پر بنائی کہ باہر سے آنے والے کو گھر کے اندر بغیر پوچھ تاچھ کے لایا جا سکے۔ جانے والا ہو تو گھر کے اندر سے لے جایا جائے۔ ایک رات بات چیت کے دوران اچانک اونچی آواز میں کہا، آ جا آ جا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو عفت ماں سیڑھیوں پر خاموشی سے اترتی آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر عفت کی نظر میں یہ مشکوک تھے، نظر رکھنا بنتا تھا۔

مفتی جی نے بھی تو انکے بارے میں علی اعلان کہا تھا۔

Abdaal Bela, the great romancer

باشرع بیوی کو شرع سے دو سوتر اوپر کوئی رویہ برداشت نہ تھا۔

یہ روحانی بات کرتے، وہ فٹ قرآن کی آیت پڑھ کر جواب دیتیں۔

یہ پھر کوئی تنگ گلی سے نکلنے کی کوشش کرتے پھر قرآن کی آیت آ جاتی انکی بات کے رد میں۔

اس دن مجھے ان پر بڑا ترس آیا۔

چار دنوں کی زندگی میں اتنی نیک بیوی کا ہونا۔
رب دیاں رب ہی جانے۔
اپنے گرو ممتاز مفتی کا نام گھر میں لینا پابندی ہے، کیونکہ بقول ڈاکٹر عفت ابدال، انہیں گمراہ کرنے والے ممتاز مفتی ہی تھے۔ انہی کی وجہ سے یہ عورتوں کے چکر میں پڑے۔
بیلا صاحب خود کہتے، دیکھو یار، اسی اپنے گر وداناں اپڑے گھر وچ نہیں لے سکدے۔
شروع شروع میں، میں نے بچگانہ پن میں سب اچھا کرنے کی کوشش کی۔ میاں بیوی دونوں کو عرض کہ پچھلے کھاتوں پر لائن پھیر کر نئے سے شروع کریں۔ گھسان کا رن پڑا۔ پچھلے قصے شروع ہو گئے، ایک ایک کر کے۔ مفتی جی کی ایک دیوانی کی وجہ سے قصے نے کافی طول پکڑا۔
میں خود کپڑے جھاڑتے ہوا اٹھا۔ توبہ کی کہ آئندہ اس مسئلے میں نہیں آؤں گا۔ خود کو تسلی دی کہ جس مسئلے کو مفتی جی اور شاہ جی نہ حل کر سکے اس کو یہ تن آسان کہاں سے حل کر سکے گا۔
اس سب کے باوجود دل رکھنا آتا۔
مجھے ہوٹل میں کھانا کھلا رہے تھے، پیٹ بھر کر کھا چکے، گھر سے بیگم کی کال آئی، پتہ لگا کچھ بنایا ہے اور انتظار ہے۔ فٹ کہنے لگے، زبردست، میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں آ کر کھاتا ہوں۔
میرے ساتھ ایسا ہوتا تو میں صاف انکار کر دیتا۔
مجھے تو اس حقیقی ماحول کو دیکھ کر ایسا ہی ایک فلمی سین یاد آ گیا۔ اس میں بھی ہیرو ایسی ہی تابعداری ظاہر کرتا، گھر جا کر بھی کھانا کھا لیتا، پھر ڈکاریں مارتا رہتا۔
سگریٹ پینے اور نیند کی گولی لینے پر بیگم کی طرف سے سخت ردعمل کا سامنا ہوتا۔
مگر یہ پھر بھی داؤ لگا جاتے۔
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی
ایک دو دفعہ تو میں نے بھی عفت ماسی سے ڈانٹ کھائی۔
کچھ روز تو وہ آتی رہیں، جب ناامید ہو گئیں کہ میں ان کے شوہر کو راہ راست پر لانے میں ان کی کوئی خاطر خواہ مدد نہیں کر سکا، تو انھوں نے آنا چھوڑ دیا۔
وقت وقت کی بات ہے۔
ایک وہ وقت تھا کہ جب یہ 1980 یا 1981 میں سعودی عرب سے منگیتر کو کال کرتے۔
ایک کال کا بل 350 ریال بن جاتا۔
پی سی او والا عربی انہیں کہتا:
انت مجنوں (تم مجنوں ہو؟)
وہیں سے منگیتر کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں ہنی مون کے پروگرام بناتے۔ شادی ہوئی تو سوئٹزرلینڈ تو کیا مری بھی نہ لے گئے۔
کہتے، اپنا کیس میں نے خود خراب کیا۔
بعد میں دوسروں کو بھی تلقین کرتے کہ ایکدم بھرپور جذبات کی جگہ دھیرے دھیرے سے چلنا مناسب رہتا ہے۔
مفتی" جی نے بھی تو انہیں کے کیس کے بارے میں کہا تھا:
"صاحبو! مجھے ہر اس خاتون سے بے پناہ

ہمدردی ہے جو محبوبہ سے بیوی ہو جاتی ہے۔ بیچاری دو ایک برس جذبات کی جگ مگ چکا چوند میں رہنے کے بعد باقی ساری زندگی لالٹین کی ٹم ٹم روشنی میں بسر کرتی ہے"۔

جب میں نے دعا کے لئے کہا کہ میری ہونے والی شریک حیات باعث رحمت ہو تو کہا، ایسی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

بہت ساری باتوں کی باوجود مجھے ایسا لگتا کہ شاید صحیح سے بات ہو نہیں پائی، ابھی تو اور بھی بے تحاشا چیزیں ہیں پوچھنے والی، کریدنے والی۔

تقریبا آٹھ سال گزارنے کے بعد اللہ پاک نے اپنے شہر واپس بھیج دیا۔ دکھ تو ہوا۔ وہی شعر یاد آیا جو شاہ جی نے انکے لئے پڑھا تھا:

چلتے چلتے ہم سے پوچھا پاؤں کے چھالوں نے

کتنی دور بنالی بستی دل میں بسنے والوں نے

کچھ مہینوں سے بیمار ہیں - گردوں کا عارضہ ہے۔ ہفتے میں دو دفعہ ڈائیلاسسز کروانا پڑتا ہے۔ گردوں کا مرض انہیں کافی عرصے سے ہے۔ سیرت پاک لکھنے سے پہلے بھی تھا۔ تب بھی یہ تیاری کر بیٹھے۔ ایک روز ابھی میں موٹر سائیکل گیٹ سے اندر ہی کر رہا تھا، کہ آواز آئی۔

ٹائم آ گیا ہے۔

دیکھا تو لان کے کونے میں بیٹھے ہیں۔ پوچھنے پر بتایا کہ گردوں کی رپورٹ ٹھیک نہیں آئی۔ اسی فیصد ختم ہیں۔ کچھ حوصلہ دیا۔ ایک دو مثالیں بیان کیں کہ کس طرح آدھے گردے پہ بھی بندہ بیس سال گزار گیا۔

انھوں نے اُسی وقت اپنے دوست ڈاکٹر فیض کو کال کی۔ ڈاکٹر فیض وہی ہیں جو ان کی کہانی 'پھر کھو' کا ایک کردار ہیں جو مربے کھا کر سردیوں میں بغیر لحاف کے چادر تان کے سو لیتے تھے۔ ڈاکٹر فیض کے اجداد حکمت کا کام کرتے تھے، خود انہوں نے ڈاکٹری کر لی۔ انھوں نے حوصلہ دیا کہ کچھ نہیں ہوتا، رپوٹ من کر کہا، مسواک کیا کریں، کچھ نہیں ہوگا۔ پھر ساتھ میں بتایا بھی کہ مسواک منہ میں سے ایسے مواد کو نکال دیتی ہے جسے گردوں کو بعد میں صاف کرنا پڑتا ہے۔ مسواک سے گردوں پر کام کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ اس کال کے بعد اٹھے اور جرمنی سے لایا ہوا ایک کٹر اٹھایا، اور ڈاکٹرز ٹاؤن کے کیکر سے مسواک بنانے لگے۔

کچھ دن تو مسواک کی۔ پھر بعد میں ویسے ہی ڈاکٹر بن گئے جو انگریزی ادویات کے مقابلے پر حکمت کو کسی کام کا نہیں سمجھتے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک انہیں کامل صحت عطا فرمائے۔ اور انھیں اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ صحت و تندرستی و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے۔

آمین ثم آمین۔

☆☆☆☆☆

شاما چڑیا

محمد طارق علی

ضروری کام تھا، کئی دنوں سے ٹال رہا تھا لیکن ذہن میں یہ خیال بدستور کہ وہاں جانا لازمی ہے۔ آخر ایک روز موقع نکال کر میں راولپنڈی صدر کے اسٹاپ پر گیا، بس میں بیٹھا اور اسلام آباد پہنچ گیا۔ خوابیدہ سا شہر جو اُن دنوں آہستہ آہستہ تعمیری مراحل طے کر رہا تھا۔ ٹرمینل پر اُترتے ہی ڈھلتی شام میرے قدموں میں آ گری۔ سایہ پیچھے کی طرف لمبا ہو گیا، پر مَیں اتنے کا اتنا ہی رہا۔ اوپر نیلگوں آسمان پر سفید گالوں ایسی ٹکڑیاں ساکت کھڑی تھیں۔ ہوا کم اور خاصی گرم تھی۔ گھڑی دیکھی تو ٹھیک پانچ بجے تھے۔

تیز قدموں سے مَیں اپنے میزبان کے گھر کی طرف چلا، زیادہ دُور نہ تھا، کوئی دس منٹ کا فاصلہ۔ سوچا، اُن کا دیرینہ بُلاوا بھی ہے اور میرا ایک چھوٹا سا کام بھی۔ سو، ملاقات اچھی رہے گی۔ صدر دروازہ سامنے آ گیا۔ ٹرن ٹرن۔ اسی وقت آدھا دروازہ کھلا اور باہر کی طرف جھانکی شاما چڑیا ایسی ایک سانولی سلونی صورت، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ماتھے پر جھولتی اُلجھے بالوں کی لٹ اور گلے میں نیلگوں دوپٹہ۔ لیکن پہلی نظر والے عشق سے منزا، یہ چہرہ مجھے فوٹو جینک ضرور لگا۔ اس چہرے نے چند ہی سیکنڈ میں درپیش منظر کو اتنا جاندار بنا دیا کہ میں نے اسے فوراً آنکھوں میں بھرا اور ذہن کی اسکرین پر اُتار لیا۔ رہی "شاما چڑیا" تو اس پرندے سے میری پرانی شناسائی تھی۔ لڑکپن والا ماضی مجھے فوراً کھینچ کر شہر کے واحد نالہ لئی سے متصل ایک ایسی سنسان جگہ لے گیا جہاں بہت سے دھوبی گھاٹ پر سارا دن مصروف رہتے تھے۔ آس پاس گھنے درخت اور ان کے نیچے یہ ہلکے مٹی و سفید رنگ والے پرندے جھنڈ کی شکل میں دانے دنکے چگتے پھرتے تھے۔ میں اپنے دوست کے ہمراہ کیمرا لیے کئی بار وہاں جا چکا تھا۔ لیکن ہر پرندے کی طرح شاما بھی ایک آزاد چڑیا تھی، کبھی فوکس میں آئی ہی نہیں۔

"فرمایئے، کس سے ملنے گا؟" شاما چڑیا بولی اور میرے خیال کی لڑی ٹوٹ گئی۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں جستجو کا رنگ گہرا اور آواز میں شرلی تھی، زیادہ تیز نہیں بس کم کم کھنک لیے ہوئے۔ اپنی اس دوسری/تیسری وزٹ میں مَیں نے اس شاما چڑیا ایسی صورت کو پہلی بار دیکھا۔ 'شاید یہ کوئی مہمان لڑکی ہے' میرا خیال تھا۔

"کمال صاحب ہیں؟"۔ "ابھی سوئے ہوئے تھے، جا کر دیکھتی ہوں، آپ کا نام؟" نام سنتے ہی دروازہ بند۔ چند منٹ بعد صاحب خانہ میرے سامنے تھے۔ خوش دلی سے ملے۔ آنکھوں میں چمک لیکن نیند

کا ہلکا سا خمار بھی۔ مجھے گلے سے لگالیا۔ ”میں معذرت چاہتا ہوں، آپ کو بے آرام کیا“۔

”نہیں، نہیں، بہت خوشی ہوئی۔ کافی دنوں بعد آپ کی شکل نظر آئی، اس دیری کی وجہ؟“

”اخباری ملازمت کی مصروفیات زندگی کی دیگر سب ضروری باتوں کو بھلا دیتی ہیں۔ آج کچھ فرصت ملی تو دفتر سے سیدھا یہاں حاضر خدمت ہوں“۔

”آیئے، اندر تشریف لائیں“۔ ہم بیٹھک میں جا بیٹھے۔

”تو آپ بدستور روزنامہ ”پنڈی ایکسپریس“ میں ہیں؟“

”جی ہاں، آج کل صبح کی شفٹ میں ہوں۔ صبح نو سے چار بجے تک“۔

ڈرائنگ روم کے قریباً وسط کے کچھ کم حصے میں ایک پارٹیشن وال تھی۔ غالباً دوسری طرف کمرہ بنایا گیا تھا۔ چند ایک باتوں کے بعد کمال صاحب اٹھ کر اسی کمرے میں چلے گئے یا شاید کہیں اور آگے چلے گئے ہوں۔ دو چار منٹ بعد پارٹیشن والے کمرے سے وہی کھنکتی آواز ابھری۔ ”ابھی تو میں تمھیں یہ چند لاکھوں والا سبق یاد کرا رہی تھی۔ واپس آئی تو دو منٹ میں ہی بھول گئے“۔

پھر چند ایک سیکنڈ کھسر پھسر۔

اسی اثنا میں کمال صاحب واپس آگئے، ہاتھ منہ دھو کر۔ ساٹھ پینسٹھ سال والا چہرہ اور ہلکی داڑھی گیلی گیلی سی تھی۔ انھوں نے بات چیت کا آغاز کیا۔ موضوع تھے ایلو پیتھک کے مقابلے میں حکمت کی اہمیت (کیونکہ وہ خود نیم حکیم تھے)، روز بروز بگڑتے سیاسی حالات اور جانے کیا کیا۔ لیکن تان یہاں ٹوٹی کہ تقسیم ہند سے پہلے کا وقت اچھا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر یہ بات دوہرائی:

”اسی دور سے ہمارے اور آپ کے بڑوں سے رشتے داری چلی آرہی ہے، وہ بہت اچھے دن تھے، محبتیں ہی محبتیں۔ میں اسی دور کے بزرگوں کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہوں۔ یہ اور بات کہ آج کے بے مہر حالات نے ہمارے درمیان خاصے فاصلے ڈال رکھے ہیں“۔ میں خاموش، گوش بر آواز بیٹھا رہا۔

چائے آگئی۔ شاما چڑیا نہیں آئی۔ ایک چھوٹی لڑکی پانی کا جگ اور اس سے قدرے بڑا لڑکا ٹرے لے کر آیا۔ ادھر میزبان کی یک طرفہ باتیں مسلسل جاری تھیں، کوئی خاص ٹاپک بھی نہیں تھا۔ میں صبر کے گھونٹ بھرتا اور ساتھ ساتھ چائے بھی پیتا رہا۔ وہ کہنے لگے: ”میرا لڑکپن تقسیم سے پہلے کا ہے جبکہ جوانی اور اب یہ ڈھلتی عمر اسی نئے ملک یعنی پاکستان کی دین ہے۔ تقریباً سارا وقت جہلم شہر میں گزرا۔ اور ہاں، یاد آیا، کئی دنوں سے آپ کے بارے سوچ رہا تھا، ایک کام تھا ضروری“۔

”اتفاق کی بات ہے۔ میں بھی آج آپ کے ہاں ایک کام ہی سے آیا ہوں۔ لیکن پہلے آپ فرمایئے، ناچیز کے لیے کیا حکم ہے؟“

اسی وقت ساتھ والے کمرے سے وہی شرل بھری آواز ابھری اور میرا چھوٹا سا کاسۂ سماعت بھر گیا۔ میں قدرے بے چین ہوا کہ آخر ہے کون یہ لڑکی؟ لیکن بولا کچھ نہیں کہ اس کی بابت کچھ پوچھنا معیوب سی بات ہوتی۔

''میری بڑی لڑکی تو شاید جہلم گرلز کالج میں فورتھ ایئر کی طالبہ ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ پی ایس سی کا سالانہ امتحان دینے کے فوراً بعد گھر واپس آنے والی ہے۔ کام بھی اسی کی بابت ہے۔ اسے صحافت کا اور لکھنے لکھانے کا شوق ہے۔ کیا آپ کے اخبار میں اسے انٹرن شپ مل جائے گی؟ آج کل گھر سے دُور سہی لیکن پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ کچھ نہ کچھ لکھتی بھی رہی ہے''۔

''ان کی تحریریں کہیں چھپتی ہیں؟''۔ ''جی ہاں''۔ کمال صاحب نے چند وومنز ویکلی اور ادبی پرچوں کے نام لیے۔

''آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پوری کوشش کروں گا''۔ میرا جواب۔

''اب آپ اپنے کام سے آگاہ فرمایئے؟'' کمال صاحب بولے۔

''مجھے ریڈیو پاک کے ایم ڈی ظفر صاحب سے ان کے گھر پر ملنا ہے۔ شعبہ خبر میں آدمی کی ضرورت ہے۔ سُنا ہے، ان سے آپ کی اچھی جان پہچان ہے''۔

''ملاقات کے لیے ابھی چلتے ہیں، یہیں جی پی او کے قریب رہتے ہیں لیکن ہے وہ کچھ مغرور سا بندہ''۔

کمال صاحب نے چلنے سے پہلے فون پر اجازت مانگی، مل گئی لیکن ہمیں جلد آنے کا کہا گیا کہ وہ کہیں جانے والے ہیں۔ سو، ہم دونوں بذریعہ ٹیکسی بھاگم بھاگ ایم ڈی کے دردولت پر پہنچے۔ مختصر سی ملاقات گو چائے پر ہوئی لیکن موصوف زیادہ تر کمال صاحب ہی سے مخاطب رہے۔ موضوع تھا: جہلم شہر میں ان کی کامیاب صحافتی زندگی اور اب اسلام آباد سے کسی نئے پرچے کے اجرا کے امکانات۔ مجھے صرف اتنا کہا:

''امیدوار بہت ہیں، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا''۔ میں شرمندگی میں شرابور ہو کر ان کے گھر سے نکلا، ٹیکسی لی، کمال صاحب کو گھر ڈراپ کیا، ان کا دلی شکریہ بھی ادا کیا۔ پھر آب پارا بس اسٹاپ سے پنڈی کے لیے روانہ ہوا۔

اگلے دن سے وہی صبح و شام اور روٹین ورک۔ میں سب کچھ بھول گیا، اسلام آباد یاور ہا نہ وہاں کی ایک خجالت آمیز ملاقات۔ ہاں، انہی روٹین دنوں میں ایک دلچسپ سی ہلچل بھی ہوئی کمال صاحب نے ایک روز مجھے فون پر بتایا کہ ریڈیو کے شعبہ خبر کی مشتہر ہونے والی ویکنسی دراصل خالی نہ تھی، وہاں ایک آدمی پہلے ہی سے کام کر رہا ہے۔ اور وہ کوئی عام آدمی نہیں، ظفر صاحب کا خاص منظور نظر ہے یعنی کہ ان کا ہونے والا داماد۔ پورے گھر کی پسند۔

وہ پھر گویا ہوئے: ''آپ (یعنی میں) نے اچھا کیا کہ اس پوسٹ کے پیچھے نہیں بھاگے، ویسے امیدوار واقعی بہت سے تھے۔ لیکن اخبارات میں اشتہار اور دیگر دفتری پراسس صرف خانہ پُری والے تھے''۔ کمال صاحب نے سچ کہا تھا لیکن میرے لیے یہ خبر بہت حیران کن نہیں تھی۔

''اور وہ ظفر صاحب کی مجھے سنجیدگی سے کہی بات؟'' میں نے پوچھا۔ جواباً کمال صاحب کا قہقہہ۔ ''کیا بتاؤں عزیز من، خود میں نے بھی ان کی بات کو سچ سمجھ لیا تھا لیکن وقت کی اچھال صحیح بات سامنے لے آئی''۔ پھر قہقہہ۔ ''خیر، آپ سنائیں، اس دوران

کسی اور جگہ کوشش کی؟'' انہوں نے پوچھا۔
''جی ہاں، میں نے پچھلا اخباری ادارہ چھوڑ کر روزنامہ ''ترنگ'' حال ہی میں جوائن کیا ہے۔ بہتر تنخواہ ہے اور سہولتیں بھی''۔ انہوں نے مبارک باد دی اور ملاقات کا بھی وعدہ کیا، بلاوا میری جانب سے تھا۔ چند دن گذرے کہ ایک اتوار کمال صاحب مع فیملی غریب خانے پر تشریف لائے۔ میرے سبھی گھر والے خوش ہوئے، خصوصاً والدین تو بہت زیادہ کہ گئے دنوں کی یادیں لہلہانے اور خوشبو دینے لگیں۔
وقت کا بہاؤ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ گاہے گاہے دونوں خاندانوں میں باہم ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک دوسرے کے لیے جذبات کسی توقف کے بغیر اچھے رہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی تیوہاری فنکشن میں کمال صاحب کے اہل خانہ نے گھر والوں سے میری شادی کے بارے میں سوال پوچھا۔ پھر کچھ گھما پھرا کر اپنی بڑی لڑکی رافعہ کا ذکر کیا کہ وہ جہلم کالج سے بی ایس سی کر کے اب کمپیوٹر کی مزید تحصیل کی خواہش مند تھی۔
ایک روز بہن نے مجھے بتایا: ''دو ہفتے پہلے کمال صاحب کے گھر والوں نے رافعہ کے لیے آپ کو پسند کر لیا تھا۔ اور اب وہ ہمارا عملی جواب جلد چاہتے ہیں''۔
''میں فوری طور پر تیار نہیں۔ میری ساری جیبیں بھائیں بھائیں کر رہی ہیں''۔ میرا جواب
''لیکن بھائی کوئی بھی شادی مختصر سے خرچ میں تو ہوتی نہیں''۔ بہن بولی
''تو پھر دعا کرو، اُوپر سے کوئی فرشتہ آ کر میری جیب میں تھیلی ڈال دے۔ تم خود سوچو، کرائے کا مکان، بوڑھے اور بیمار والدین اور دو بہنیں، بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
''بھائی، مسائل ہر گھر میں ہوتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے اہم کام کوئی بھی روکے نہیں رکھتا''۔ بہن کی دلیل
''لیکن تم یہ سب حقائق اُن کے گوش گذار کر دو۔ وہ سادگی سے شادی چاہیں گے تو ٹھیک، ورنہ ہم اپنی کھال میں مست ہیں''۔
''بھائی کچھ تو کرو ورنہ اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی''۔ بہن کی بات سن کر میرے دل میں سرسراہٹ سی ہوئی لیکن جواب میں سوائے مسکراہٹ کے کچھ بھی نہ تھا۔
وقت کے پرت پلٹتے رہے۔ ہماری آنکھ اُس وقت کھلی جب ایک روز اچانک کمال صاحب کے ہاں سے شادی کارڈ آیا۔ ان کی بڑی بیٹی کی رخصتی تھی اور ہم سب کا بلاوا تھا۔ حقیقتاً اس کے رشتے کے بارے ہماری مسلسل خاموشی پر ایسا ہی جواب ہونا چاہیے تھا۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میری بہنوں کے بھی رشتے آئے اور میری ماں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر بنائے ہوئے ہلکے پھلکے زیورات دیے، مختصر سے فنکشنز کیے اور لڑکیوں کو رخصت کر دیا۔ تاہم کمال صاحب کی بڑی لڑکی کا رشتہ کھو کر سبھی گھر والے حالتِ افسوس میں تھے۔ میں بھی خود کو ایسا شخص سمجھ رہا تھا جو دنیا سے ماورا ہو کر جی رہا ہو، اپنے کسی لاحاصل سے خیال کے تحت۔ لیکن رفتہ رفتہ وقت نے دلوں پر پڑی ان افسوس ناک خراشوں کو مندمل کر دیا اور ہمیں بتا دیا کہ جینے کے لیے کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا ہے۔
ایک اتوار کی شام بالکل غیر متوقع طور پر ہمارے

گھر کمال صاحب کی ٹیلی فونک کال آئی۔ پرسشِ حال اور چند ایک دیگر باتوں کے بعد انھوں نے میرے والد سے کہا: ''ہمیں اپنی بڑی بیٹی کو فوری طور پر اس کے گھر رخصت کرنا تھا۔ سو، بحکمِ ربی ایسا ہی ہوا۔ اب ہم اپنی دوسری بیٹی کی بھی جلد شادی کرنا چاہتے ہیں''۔

''آمین، بڑی خوشی کی بات ہے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے''۔ میرے والد نے کہا۔ اس وقت گھر میں بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں۔

کمال صاحب کی بات سے گھر میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا کہ کیا ان دور کے عزیزوں سے رشتہ داری مضبوط کی جائے۔ سبھی متفق تھے۔ تو کیا اس سلسلے میں ان کی دوسری بیٹی شگفتہ کا رشتہ مانگا جائے۔ والد صاحب کا کہنا تھا کہ رشتوں کے ذریعے قرابت داری بڑھانے کے لیے آپس میں شادی بیاہ کرنا ایک قدیمی رواج ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہن نے کہا: ''ہم تو تیار ہیں، یہ دولہا میاں اگر مگر کر رہے ہیں''۔ دوسری بولی: ''لیکن اس کے باوجود ہم جلد از جلد کمال صاحب کے گھر جائیں گے ضرور، خواہ یہ بغیر سہرے کے دولہا میاں کچھ بھی کہیں''۔ میری سٹی گم ہو گئی۔ ''کیسی ہے وہ لڑکی، کیا نام ہے اور کہاں تک پڑھی ہے؟'' میرے گھبراہٹ بھرے سوال۔

''نام شگفتہ، ایم اے انگلش اور اُس کا رنگ آپ سے بہتر ہے''۔ سبھی مسکرا دیے۔

''نہیں نہیں، وہ کالی ہے، شاما چڑیا جیسی، میں اُسے دیکھ چکا ہوں کمال صاحب کے گھر''۔ ''نہیں، بالکل جھوٹ۔ شادی سے بھاگنے کا ایک اور بہانہ''۔ بہنیں ہنس پڑیں۔

اب میرے والدین اور بہنوں کو اسلام آباد جانے کے لیے کسی موقع کی تلاش تھی۔ جلد ہی مل گیا۔ وہ اس طرح کہ کمال صاحب کے ہاں سے انھیں زنانہ محفلِ میلاد اٹینڈ کرنے کا بلاوا آ گیا۔ وہ مقررہ دن اور تاریخ پر ٹیکسی سے اسلام آباد چلے گئے۔ فنکشن کے بعد والدین نے رشتہ کا سوال ڈالا۔ جواب ملا: ''پہلے ہم بچی سے اس کی مرضی معلوم کریں گے''۔ سب واپس آ گئے۔

دو روز بعد میری بہن کے نام ایک خط آیا۔ لکھا تھا:

''نسیم باجی، آپ کے گھر سے آنے والے سوال کا مجھے علم ہوا ہے۔ میں کسی بے حس آدمی سے ناتا نہیں جوڑ سکتی۔ یہ وہی صاحب ہیں کہ جنھوں نے میری بڑی بہن کے رشتے کی پروپوزل کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ کوئی بھی جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ نکاح ایسے مبارک رشتے کو منظور کرنے کے لیے اگر ان کے پاس پیسے نہیں تھے تو ہم سے صاف بات کرتے۔ ہم بساط بھر ان سے تعاون کر سکتے تھے لیکن ان صاحب کے سامنے اپنی بڑھی ہوئی حیثیت تھی، میرے والد کے اعتماد کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ رہی میری بہن، تو وہ بہادر نکلی۔ وہ اپنے کسی خواب کے ٹوٹنے کا کوئی افسوس کرنے کے بجائے سکون سے نئی منزل کی طرف چل دی۔ اس کا فیصلہ فوری تھا اور درست بھی۔ میں نے ان صاحب کو ایک بار اپنے ہاں دیکھا تھا۔ ان میں کوئی غیر معمولیت نہیں پائی۔ میں ان سے رشتے کے سوال کو غیر اہم سمجھ کر رد کرتی ہوں۔ کوئی مجھے کیا سمجھے، پروا نہیں۔ میرا اجلا مستقبل میرا منتظر ہے۔ آپ کی مخلص۔ شگفتہ کمال''۔

☆☆☆☆☆

یہ اپنا جہنم

جب وہ آدمی، دُنیا کو سمجھنے لگا تو اس کے اندر عجیب سی جرأت پیدا ہوگئی - عبادت گاہ میں پہلی صفوں کے پجاریوں کے ساتھ بیٹھا وہ اپنی باری آنے پر دیوتا کے مجسمے کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہوگیا- اور پھر سجدہ میں گر گیا- عبادت گاہ کے اندر موجود پجاریوں نے اس کے جذبے اور شوق بندگی کو دیکھ کر بڑی عزت اور ہمدردی سے اُسے اُٹھایا کہ بہت سے دوسرے لوگ بھی سجدہ کرنے کے منتظر تھے- وہ دو آدمیوں کے درمیان جا بیٹھا- اور کراہتے ہوئے بولا ابھی میرا دل نہیں بھرا- میرے دل کو سکون نہیں ملا- ابھی دماغ پر سیاہ بوجھ کی تکلیف قائم ہے- میں پھر سجدے میں گروں گا- اور اُس وقت تک نہیں اُٹھوں گا جب تک مجھے دیوتا کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں مل جاتا- ایک آدمی جو اُس کے ساتھ جُڑ کے بیٹھا ہوا تھا- چیخ کر بولا- یہ شخص عجیب بات کر رہا ہے- یہ دیوتا کے مجسمے سے کسی خاص اشارے کا طلبگار ہے - یہ ہم سب کے جذبات اور پوجا کی توہین کر رہا ہے- یہ ہمارے ذہن میں عجیب طرح کی سوچ منتقل کر کے ہمیں کسی اور طرف لگانا چاہتا ہے - اس کی بات ختم ہوئی تو اگلی صف میں ایک لمبا تڑنگا اور سفید چادر اوڑھے آدمی غصے سے للکارتے ہوئے بولا، کیا کہہ رہا ہے؟ کیا دیوتا اشارے کرے گا، کیا وہ دلال ہے - تم اشارے کرنے کا مطلب سمجھتے ہو- دونوں آدمیوں کے رویے سے وہ مشتعل ہو کر کھڑا ہوگیا- اور چیختے ہوئے بولا- یہ میرے اور دیوتا کا آپس کا معاملہ ہے مجھے اس نے پہلے بھی اشارے کیے ہیں- اور اب بھی کرے گا اگر تمہاری آنکھوں اور دماغوں میں اشارے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں تو مجھ پہ یوں برس کیوں رہے - تم سجدے کرنے نہیں آئے- تم صرف دکھاوا کرنے آئے ہو تم صرف نیک اور عبادت گزار ہونے کی سند لینے آئے ہو- حالانکہ تم نے دیوتا کے مجسمے کو آج تک غور سے دیکھا ہے نہ ہی اسکے یہاں ہونے کے مقصد کو سمجھا ہے اصل میں تمہارے دلوں میں دیوتا کا کوئی بہت ہی نیچ اور بدشکل سا تصور موجود ہے -فرش پہ بیٹھے ہوئے سارے پجاری اُٹھ کھڑے ہوئے- بہت سے مشتعل ہو کر اُس پر جھپٹ پڑے- چند پجاری

کلیم خارجی

دیوتا کی محبت میں بے بسی اور بے چارگی سے اپنے سینے پہ ہاتھ مار مار کر رونے لگے۔ وہ بھی مضبوط جسم کا پھرتیلا آدمی تھا۔ وہ اپنے دفاع میں اُن کے ہاتھ سے نکل نکل جاتا۔ اور شور شرابے میں اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کسی نے اُس کا بازو پکڑ کر عبادت گاہ کے دروازے سے باہر دھکیلتے ہوئے کہا بھاگ جاؤ بڑے لوگوں کے ہاتھوں سے مر کے انہیں بہت مرتبہ دے جاؤ گے۔ بھاگ جاؤ اپنی موت سے دوسروں کے لیے دُنیا آسان اور سستی کیوں بنانا چاہتے ہو اپنے حصے کا سب کچھ دوسروں کی جھولی میں ڈال کر خود آگ میں کودنا چاہتے ہو وہ حیرت زدہ ہو کر اس آدمی کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ جو اس کے اور حملہ آوروں کے درمیان دیوار بنے سسک سسک کر اُس کے ساتھ سرگوشیاں کیے جا رہا تھا۔ تم پاگل پن کر بھوتوں کو فرشتوں کے مرتبے تک پہنچا دو گے ۔ وہ پھرتی سے چھلانگ لگاتے ہوئے عبادت گاہ کی سیڑھیوں سے نیچے اُترتے ہوئے دوڑ پڑا۔ اور اپنے پیچھے لپکتے اور للکارتے ہوئے چند لوگوں سے چیختے ہوئے بولا۔ میں کسی دن دیوتا کو دیر تک اپنی مرضی سے سجدہ کر کے تمہارے بارے میں ضرور بتاؤں گا تم پر لعنت بھجوا کے مروں گا۔

عبادت گاہ سے کچھ فاصلے پر تنگ، تاریک اور غلیظ گلیوں کی قطاریں تھیں ۔ وہ جل دیتا ہوا کچرے اور بدبو سے بھری گلی میں داخل ہو گیا۔ اور بہت تیزی سے گلی کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ نعروں اور للکاروں کی آوازیں سن کر تماشہ دیکھنے والوں کا ہجوم گلی میں منجمد ہو گیا۔ آگے جانے والے لوگ پھنس کر رہ گئے۔ ہجوم کی اکثریت معاملے کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ بہت سے لوگ چیخ چیخ کر راستہ کھولنے کی فریادیں کر کے نڈھال ہوئے جاتے تھے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ آپس میں اُلجھ پڑے ۔ دھینگا مشتی اور گتھم گتھا لوگوں کو دیکھ کر گھروں کی چھتوں پر عورتوں اور بچوں نے بین کر کے گلی میں پھیلی ہوئی سنسنی اور وحشت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اندھیرے، حبس اور بدبو میں تشدد پسند لوگوں کے ہاتھوں سے گلی میں چند لاشیں گرتی دیکھ کر ہجوم شور مچاتا ہوا بکھر گیا۔ لیکن لاشیں پڑی رہ گئیں۔ سرکاری لوگوں کی مداخلت سے گلی کے دونوں راستے سیل کر دیئے گئے گھر گھر تلاشی کے دوران رحم اور بے گناہی کی صداؤں کے باوجود بہت سے مرد گرفتار کر لیے گئے ۔ مرنے والوں کے رشتہ داروں کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اور گلی میں سول کپڑوں اور سرکاری وردی میں خوفناک سرکاری افسر گشت کرتے نظر آنے لگے ۔ گلی کے چھوٹے چھوٹے گھروں سے ہر روز ایک نہ ایک لاش برآمد ہونے لگی۔

وہ گلی جو تاریکی، غلاظت اور اپنی تنگی کی وجہ سے ویرانی اور نحوست کا نمونہ تھی۔ اب چہل پہل روشنی اور تفتیشی اہل کاروں کی آمد و رفت کا منظر پیش کرنے لگی تھی۔ گلی کے دونوں

طرف ناکہ بندی کے باوجود ہر روز گلی کے کسی گھر سے ایک لاش برآمد ہونے لگی۔ اس بارے میں خودکشی، فاقہ، جسمانی تشدد وغیرہ کی وجوہات بیان کرکے پریشان حال لوگوں کو مزید بے بسی میں دھکیل دیا جاتا کئی ماہ کے محاصرے اور تفتیش کے بعد سرکار نے نہ جانے کن لوگوں کی تسلی اور اطمینان کے لیے صورت حال پر قابو پانے کی تفصیلات بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ گلی کے ایک سرے پر ایک سیاہ جیپ کی چھت پر باہر نکل کر ایک اہلکار نے لوگوں کی ہجوم کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے میگا فون منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ گلی میں امن قائم ہو چکا ہے۔ قاتلوں کے ٹھکانوں کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اچھنبے کی بات یہ ہے کہ یہ گلی جس میں سرکاری اہل کاروں نے دن رات ایک کر کے صورتحال پر قابو پایا ہے۔ یہ گلی سرکاری نقشے کے میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس گلی کا کوئی نام ہے نہ تاریخ اور آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس گلی میں کون لوگ آباد ہیں۔ کب سے آباد ہیں اور ان کا مسلک اور انکے روزگار کے ذرائع کیا ہیں۔ ہم انسانی جانوں کے مارے جانے پر افسوس کرتے ہیں۔ لیکن مرنے والوں کی موت کی وجوہات کا ابھی تک مکمل سراغ نہیں مل سکا۔ سرکار کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ اس گلی کے لوگوں کو کن شرائط پر ایسے حقوق دیئے جائیں کہ وہ یہاں آبادکاری، رہائش اور سرکاری تعاون کے لیے مستحق سمجھے جائیں۔ لوگ گھر بسر کرتے ہوئے اِدھر اُدھر ہونے گئے۔ لیکن یہ کاری محافظوں کے دستوں کے درمیان سیاہ گاڑی کی چھت سے سے آدھا دھڑ باہر نکالے اہل کار بولتا رہا۔ اسکی سرخ گردن کے دائیں بائیں موٹی موٹی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ اور سفید قمیض پسینے سے بھیگ کر اس کے نرم سفید اور پلپلے بدن سے چمٹ چکی تھی۔ اسکی باتوں اور کمزور ہوتی ہوئی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پوری طرح کہہ نہیں پا رہا۔ ہجوم کو چھٹتا دیکھ کر اس نے اپنے آس پاس کھڑے مسلح محافظوں کی طرف دیکھا جو بے چینی اور پریشانی کے عالم میں کھڑے کھڑے اپنی ٹانگیں جھاڑ رہے تھے۔

سرکار کا ایک جاسوس دستہ جو ہجوم میں کھڑا تھا۔ وہ کھڑا رہ گیا۔ اسی دوران گندی سیاہ گلی سے ایک مردود، نیم عریاں اُلجھے ہوئے بالوں والا شخص برآمد ہوا۔ اس کے کندھے کی سیاہ ہڈیاں گردن کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ قمیض کے بغیر وہ عریانی کے ساتھ بدصورتی، بیماری بدحالی غربت کا ایسا تماشہ بنا ہوا تھا۔ کہ ایک نظر دیکھنے کے بعد اُسے کسی نے دوبارہ دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ وہ لرزتے بدن کے ساتھ مشکل سے قدم اٹھاتے ہوئے ہجوم اور گلی سے دور ہوتا گیا۔ اور پھر

عبادت گاہ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ کچھ دیر زینے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا- ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو مشکل سے قابو کر کے اس نے عبادت گاہ کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا عبادت گاہ کو کھلا اور بغیر کسی پجاری کو دیکھ کر وہ خوشی سے جھومنے لگا اور اس کا بدن اوپر نیچے جھولنے لگا- دروازے کے اندر گھستے ہی داخلی دروازے کو اندر سے بند کر لیا- اور عبادت گاہ کے وسطی ہال کی طرف جاتے ہوئے اس نے لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی پہلی سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش جو بالائی منزل کی طرف جاتی تھی- وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سیڑھیوں کو گھورتے ہوئے خود سے بولا میں آج تک ان سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر نہیں گیا- شاید دوسری منزل پہ بھی دیوتا کا کوئی مجسمہ رکھا ہوا ہے- وہ کچھ دیر کھڑا رہا- لیکن اس کے اندر لمبی سیڑھیوں کے چوڑے تختوں پر پاؤں رکھنے کی سکت نہیں تھی- چنانچہ وہ پوجا کے بڑے ہال میں داخل ہو گیا- قربان گاہ کے بائیں جانب دیوتا کا مجسمہ اُسے یوں لگا جیسے اُس کے انتظار میں تھا- وہ بھوک، خوف اور کمزوری کے باعث لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ مجسمے کے پاس جا کھڑا ہوا- اور جھڑکتے ہوئے بولا- اس سے پہلے کہ میں تجھے سجدہ کر کے اُٹھنے کے قابل نہ ہوں- اور پہچانے جانے کے بعد تیرے پجاریوں کے ہاتھوں مارا جاؤں- میری بات سُن- تو کس مٹی اور کس پلید پتھر سے بنا ہے- تیری پوجا سے تیرے پجاریوں کے اندر کمینے اور ظالم بھوت باہر نکل کے برباد نہیں ہو پاتے- کیا تو گندگی اور بدی کا دیوتا ہے؟ تجھے سجدہ کرنے کے بعد منصف انصاف نہیں کر پاتا- تیرے پاؤں کو چھو لینے کے بعد مسیحائی کا دعوی کرنے والے حکیم اور طبیب موت کا کاروبار کرنے لگتے ہیں- اور عالم و فاضل کہلوانے والے جہالت اور پسماندگی پھیلانے میں جت جاتے ہیں- اے کیا تو کمینگی کو طاقت دیتا ہے کہ تیری ستائش میں گیت گانے والے لوگ رہزن، لٹیرے اور قاتل بنے پھرتے ہیں- اے انسان نما، بدروحوں کے مرکز، تیرے پجاریوں میں قسم کھانے والے پہرہ داروں اور محافظوں کو بھوک، نفرت اور افلاس پھیلانے کے بعد کنواریوں، بیواؤں اور بچوں کی ماؤں کی عزت لوٹنے کی طاقت کیوں مل جاتی ہے- اور تیری ثنا میں جھوٹ بولنے والے لوگ پھلدار درختوں کو بے رحمی سے کاٹ کر کے تجھے نذرانے کیوں پیش کرتے ہیں- تیرے جسم کو دودھ سے نہلانے اور والے لوگ دودھ میں زہر گھول کر کیوں بیچتے ہیں- تیری بندگی کرنے والے میٹھے اور صاف پانی کے چشموں میں غلاظت اور مردہ انسانی اعضا کیوں پھینکتے پھرتے ہیں- بولتے بولتے نقاہت اور تھکن سے ان کا توازن بگڑ گیا- اور گرتے گرتے اس کا سر دیوتا کے سے ان

چوڑے اور سفید سینے سے جا ٹکرایا۔ ہلکے سے دھماکے کے ساتھ مجسمہ فرش پر بچھے ہوئے دبیز اور سرخ رنگ کے قالین پر گر پڑا۔ اس کا دھڑ اور ٹانگیں علیحدہ ہو گئیں۔ اور قالی اور قالین پر چھوٹی بڑی کرچیں بکھر گئیں۔ وحشت اور خوف سے اس نے دیوتا کے مجسمے کو دیکھا۔ مجسمے کی آنکھوں سے اُسے انتقام نظر آنے لگا۔ لرزتے ہوئے جسم کو قابو کرنا اُس کے لیے بہت مشکل تھا۔ لیکن وہ پجاریوں کے ہاتھوں اذیت ناک موت کے خوف سے لرزتے ہوئے اُٹھا۔ اور دھمکی دیتے ہوئے۔ بولا میں ایسے نہیں مروں گا۔ میری موت میرا پیچھا کرتے ہوئے گندی گلی کے دس پندرہ لوگوں سے جا لپٹی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ میں ابھی نہیں مروں گا۔ یکا یک اس کے اندر ایک طاقت سی اُبھر آئی۔ اس نے جیسے تیسے فرش پر بچھے ہوئے قالین کو گھسیٹ کر ایک بے ترتیب سے ڈھیر بنا دیا۔ پھر اس نے قربان کے اوپر بھی ہوئی کتابیں ڈھیر پر رکھ دیں۔ ہال کے اندر سے ایک اور کمرہ نظر آیا۔ وہاں کا ٹین کے ڈبوں میں اُسے مقدس تیل مل گیا۔ لکڑی کی سیڑھیوں اور ڈھیر پہ تیل چھڑک کر اس نے ہال کا اندرونی دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا۔ کچھ دیر وہ بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ پھر وہ قربان گاہ کے عقبی کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے وہاں سے بڑی شمعیں اور آگ جلانے کا سامان مل گیا۔ اُس نے

سب سے پہلے قالین کو شعلہ دکھایا۔ پھر سیڑھیوں، کتابوں اور کمروں کے اندر سے جو چیز کو سے ملی۔ وہ ڈھیر پہ ڈالتا رہا۔ عبادت گاہ کا ہال دھوئیں اور شعلوں سے گرجنے لگا۔ دھوئیں اور تپش سے اُسکی سانس بند ہونے لگی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو سیڑھیوں پر آگ کی لپٹوں میں اس نے چند نوجوانوں کو عریاں حالت میں چیختے اور بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ آرام سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے مرنے کا انتظار کرنے لگا۔ کروٹ بدلتے ہوئے اُسے دروازے کو توڑنے کی آوازیں آتی رہی۔ لیکن وہ بے دم ہوتا جا رہا تھا اس نے پوری ہمت سے آنکھیں کھولنے کی کوشش جاری رکھی تو اُسے ہر طرف ننگ دھڑنگ لوگ نظر آئے۔ اس کے ہونٹوں پہ اک مسکراہٹ سی دوڑ گئی اور وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا یہ آگ میری اپنی لگائی ہوئی ہے اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی میں جل مرنے سے پہلے اپنی جسم سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا رہوں گا مجھے اتنی مہلت تو ضرور ملے گی کیونکہ یہ میرا اپنا جہنم ہے اس نے بدن ڈھیلا کر کے ٹانگیں پھیلا دیں اُسکی آنکھیں بند ہو گئیں لیکن اسکے ہونٹوں سے بار بار سرگوشیاں دھوئیں میں گم ہوتی جا رہی تھی کہ یہ میرا اپنا جہنم ہے پھر اُس نے اپنے آپ کو دھوئیں میں اُڑتے ہوئے محسوس کیا۔

☆☆☆☆☆

حاصلِ زندگی

سوچتے سوچتے وہ ماضی کے اُن کھنڈروں میں بھٹکنے لگی، جہاں اب صرف یادوں کی راکھ باقی تھی۔ جس کو کریدنے سے کوئی چنگاری برآمد نہیں ہوتا تھی۔ جو بھڑک کر شعلہ بنتی اور 25 سال بعد یاس کو آس میں تبدیل کرتی۔ بس سب کچھ اچانک منجمد ہو جانے والے خیال کے برفانی جزیرے میں دفن ہو چکا تھا۔ آس کی آنکھوں میں بس نراشا کا سمندر تیرتا رہتا جس میں اُس کے دل کی کشتی ڈوبتی اُبھرتی لہریں لیتی رہتی۔ یونہی زندگی گذر گئی تھی۔ جوانی سے بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھتی آس کو اچانک ہی یادوں کے بگولے میں ایک شناسا چہرہ نظر آیا تھا۔ خیالوں کی چمنیوں پر پڑی گرد لحہ لحہ اُڑنے لگی۔ چہرہ واضح ہونے لگا۔ 25 سال کا طویل سفر کرکے وہ بلا خراب سیٹ ہو چکی تھی۔ جب اُس شناسا چہرے کا کنکر اُس کی ذات کے ٹھہرے ہوئے پانی میں گرا۔ وہ اُلجھ سی گئی۔ کہیں یہ وہ ہی تو نہیں، جس کو اُس زمانے میں دیکھا تھا۔ جب جذبے جوان تھے۔ خیالات ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرح لہروں کی جھاگ اُچھالتے رہتے۔ آنکھوں میں کئی تصویریں بنتی ٹوٹتی۔ ذات کے آئینہ خانہ میں چہرہ سج جاتا تو اُس کا عکس ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ تب وہ سُندر سا معصوم چہرہ، لمبی آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت بالوں سے بھرا ہوا سر اور آواز جیسے گلے میں بھگوان بولتا تھا۔ واقعی اُس کی آنکھوں کی تختی پر نقش ہوا تھا جو اب دیکھنے والی عمر میں یہ باتیں حیرت انگیز نہیں لگتیں۔ مگر آس کی بے چین روح کو کسی پل سکون نہیں ملتا تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ یہ لمحے تھم جائیں اور زندگی یہیں کہیں اس آواز کے گرد ٹھہر جائے۔ عجیب سی کشمکش تھی اُس کی آواز میں

آسناتھ کنول

اور کشش تو اِس بندے کے اندر بھی بہت تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں پسند آ جانے والا شخص۔ وہ پسند آیا بھی مگر جس جگہ وہ تھی وہاں کسی کی نگاہ غلط انداز سے دیکھنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو پسند کرنا تو دُور کی بات تھی۔ کجا کہ آپ کو کسی سے محبت ہو جانے کی بات سوچیں۔ خیر آخر اللہ کرتو ممکن نہیں تھی۔ مگر پسند کرنے پر تو کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی تھی۔ سو وہ اُس کی پسند کی کسوٹی پر پورا اُترا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ بات گُل کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں تھی کہ وہ کسی کو پسند آیا ہوا ہے۔ اُسے پسند کرنے والوں کی تو لائن لگی ہوئی تھی۔ پھر بھلا اک عام سی لڑکی کی پروا کون کرتا۔ سو یہ لمحے بھی گزر گئے۔ مگر اپنے ساتھ یادوں کے نقش لے کر اُس کے دل میں پھانس بن کر چبھ گئے تھے۔ وہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گئی۔ پھر اُس کی زندگی میں کتنے طوفان آئے، کتنے مدوجذر آئے، وہ ایک الگ کہانی ہے۔ اس کی شادی ایک بھلے آدمی سے ہو گئی۔ اور پھر وہ بچوں میں ایسی اُلجھی کہ خود کو بھی تقریباً بھول گئی تھی۔ جب اچانک وہ چرچ میں ملا تھا۔ دراز قامت، صحت مند بہت ہی بدلا ہوا۔ 25 سال بعد ہم پہلے جیسی شکل تو نہیں ڈھونڈ سکتے۔ مگر اُس کے نام گُل فراز نے اُس کے ماضی میں چھلانگ لگائی تھی۔ خوبصورت نام پہلے سے بھی زیادہ گریس فل اور شاندار پُر اعتماد آدمی۔ وہ ماضی کو کریدتی رہی۔ دبی ہوئی راکھ سے ایک چہرہ نکلنے لگا۔ وہی جو اُس کی پسند کی شلف پر اب بھی ٹنگا ہوا تھا۔ خدوخال واضح ہوئے تو وہ تڑپ اُٹھی۔ اُف یہ وہی ہے۔ کرسمس ایوننگ پر وہ مائیک پکڑے اپنی ہی دُھن میں مگن اپنی دلنشین آواز کا جادو جگا رہا تھا اور وہ سامنے بیٹھی خود کو سنبھال رہی تھی۔ وہ اُس کی آواز کے زیرو بام میں ڈوبتی اُبھرتی رہی۔ اُس نے خود کو لاتعلق رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ خود کو اُس سے ہار دیگر پسند کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔ وہ اپنی پوری آب وتاب سے اُس کے حواسوں پر چھا گیا تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک ہی نام کا ورد اُس کی سوچوں میں جاری تھا۔ اور وہ خود کو چوری چوری سمجھاتی تھی، یقین دلاتی تھی کہ اُس کا گُل سے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اُس نے اُسے فیس بک پر ڈھونڈ لیا اور کچھ نہ سہی وہ اُس کا فیس بک فرینڈ تو بن گیا تھا۔ مگر یہاں بھی گریز پائی کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ اجنبی تھا اور اجنبی ہی رہا کہ وہ تو آس کے گہرے جذبات سے ناواقف تھا اور آس اُسے یہ بتا ہی نہیں پائی تھی کہ وہ اُس کے لیے کیا تھا۔

اور 25 سال بعد تو یہ سوال ہی نہیں اُٹھتا کہ وہ اُس سے کچھ کہہ سکے۔ پھر بھی اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُسے یہ تو بتائے کہ وہ اُسے کتنا عزیز رہا تھا۔ احمد فراز کا شعر بھی تو یاد آگیا تھا۔

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تم کو نہ آئیں محبتیں کرنی

....

وہ اپنی محبت کو رسوا نہیں کرسکتی تھی۔ یک طرفہ محبت کا تو کوئی وجود بھی نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے ثابت ہو۔ اِنہی اُلجھنوں کے درمیان وقت گزر گیا۔ اُس سے کیسے رابطہ کیا جائے۔ کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ دو تین ہفتے اِسی اُدھیڑ بن میں گزر گئے۔ ایک دن جب چرچ گئی تو اُسے یوں لگا جیسے الہام ہوا ہو۔ وہ یہیں کہیں ہے۔ اُس نے سامنے دیکھا تو ایک شخص کی پشت دیکھ کر اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا، ہو نہ ہو یہ گل ہی ہے۔ وہ ہی ہے وہ خوش ہوگئی۔ چرچ سروس کے بعد جب اُس نے دیکھا تو وہ وہی دُشمنِ جاں تھا۔ بہت دیر وہ یہی سوچتی رہی۔ کہ وہ اُسے ملے کہ نہیں۔ سب لوگ اُس سے مل رہے تھے۔ بہت دیر کافی کشمکش کے بعد بالآخر وہ اپنے حواس مجتمع کر کے اُس کے سامنے چلی آئی۔

25 سال بعد وہ پرانی باتیں اُسے یاد کروانے لگی۔ وہ مُسکرایا، اُس نے اُس پروگرام کا اقرار کیا۔ اُس نے کچھ فوٹو بھی اپنے موبائل میں بنائی تھیں۔ جیسے جہانوں کی دولت اُسے ملی تھی، مگر وہ تو اجنبی تھا۔ اُسے گزری زندگی کے واقعات تو یاد تھے مگر وہ اُسے یاد نہیں تھی۔ ناشناسائی کے سائے گہرے ہو گئے، تو وہ واپس لوٹ آئی۔ اُس کا تعلق تو صرف دو انسانوں کا ہے۔ وہ کیا چاہتی تھی، آخر وہ کیا سُننا چاہتی تھی اور کیوں؟ اب اِن سب باتوں کے کوئی معنی نہیں رہ گئے تھے کہ اب دونوں کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر وہ اُسے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ گزرے ہوئے تلخ ماضی کے چند اوراق اُس کے سامنے کھولنا چاہتی تھی۔ صرف اِس لیے کہ اُس نے پوچھا تھا کہ آپ اب بائبل کالج کیوں نہیں آتیں۔ وہاں بہت عمدہ پروگرام ہے۔ آپ وہاں تشریف لائیں، تو وہ اُسے کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ اوہو! یہ تو اب بھی معصوم ہی ہے۔ زندگی نے اُسے کیسے کیسے کچوکے دیئے کہ اُن کا بیان مشکل ہے۔ وہ شدت سے اپسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ وہاں کیوں نہیں آسکتی تھی۔ اُس کے ساتھ وہاں کیا ہوا تھا۔ زندگی کیسے اُس کے لیے تنگ کردی گئی تھی۔ وہ ذہن کی عمیق گہرائیوں میں دبے ہوئے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ اُسے یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ وہاں کیسے کیسے لوگ

رہتے ہیں۔ اُسے ایک خط لکھتی ہوں، آس نے سوچا، جو واٹس ایپ پر لکھ کر بھیج دوں گی۔ اُس نے سوچا مگر لکھنے سے پہلے اُسے کاغذ پر لکھ لوں۔ اور پھر وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اِک جذب و مستی کے عالم میں وہ کہیں ماضی کو تہ در تہ کھولنے لگی۔

میرے عزیز سلامتی ہو۔
ماضی کریدنا کبھی سہل نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی ناسوروں کو ختم کرنے کے لیے نشتر چلانا پڑتا ہے۔ گند باہر نکل جائے گا تو شفا مل جاتی ہے۔ مگر اب یہ سوچنے لگی ہوں کہ سب کچھ تمہیں کیوں بتانے لگی ہوں، نہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ مُردے جب قبروں میں دفن کر دیئے جائیں تو پھر اُنہیں باہر نکالنا ممکن نہیں ہوتا تو ذہن و دل کی قبر میں دفن شدہ لمحوں کو میں کیسے باہر نکال سکتی ہوں - ہرگز نہیں!! عزیز میں ایسا نہیں کر سکتی - میرا تمہارے ساتھ عزت و وقار کا رشتہ ہے۔

نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی
نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

....

سو میں اِسے یہیں ختم کرتی ہوں۔ چہرہ لمحہ لمحہ اُبھرتا رہا۔ یادوں کے سمندر میں ڈوبتا رہا۔ اُس کے سارے دیئے ٹمٹماتے رہے۔

آخر ہم کب تک اور کہاں تک سچ بولیں گے۔ ماما میرا کارڈ بنا دیں۔ آس کی کی بیٹی جانو نے گم شدہ ہوتی ہوئی ماں کا کندھا ہلایا تو وہ اپنی 25 سال پرانی دُنیا سے واپس آ گئی۔ ہاں ہاں کرتی ہوں۔ اُس نے سر جھٹکا۔ یہ میں کن خیالوں میں کھو جاتی ہوں۔ میں اپنے جذبات کے ہاتھوں اتنی کمزور کیوں ہو جاتی ہوں - خیالات کی یورش مجھے ورآتی ہے اور میں اپنے اندر بکھرنے لگتی ہوں۔

مجھے کیا حق ہے کہ اپنی ہی بنی بنائی دُنیا کو بگاڑوں۔ ہر کام وقت کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ جانے کا وقت گزر چکا ہے۔ وہ بادل ناخواستہ اُٹھی اور گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ اب یہی ہوگا، میں اُسے کوئی میسج نہیں کروں گی۔ بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی کو خواہ مخواہ تنگ کرنے کی۔ وہ جو کوئی بھی ہے اپنے گھر میں خوش رہے۔ آس نے سارے تعلق سارے احساس کو ایک طرف رکھا اور بیٹی کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ پھر گھر تھا اور بچے تھے۔ اپنی مصروفیات تھیں۔ کہاں کے تعلق رشتے داری۔ وہ اُبھرتی ہوئی شکل معدوم ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی دُنیا میں واپس آ گئی تھی۔ کب تک خوابوں کے سہارے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

زندہ در گور

میں اچھی طرح سے سانس نہیں لے سکتا۔ آنسو میری آنکھوں سے رواں ہیں۔ میرے منہ کا ذائقہ خراب ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے بہت بوریت، تھکاوٹ اور اُکتاہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ مجھ میں کسی بھی چیز کے لیے اب کوئی جذبہ اور طاقت نہیں رہی ہے۔ میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ میرے بازو میں لگے ہوئے اتنے زیادہ انجکشنوں نے اس کو پن کوشن بنا دیا ہے۔ بستر سے بخار اور پسینے کی گندی بُو اُٹھ رہی ہے۔ میں بستر کے ساتھ رکھی چھوٹی میز پر، پڑی گھڑی کو دیکھتا ہوں۔ اتوار کا دن ہے اور صبح کے دس بجے ہیں۔ میری نظر چھت اور اس کے بیچ لٹکتے بجلی کے لیمپ پر پڑتی ہے۔ میں کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں: وال پیپر پر سرخ اور گلابی خمیدہ نقش و نگار کندہ ہیں اور باقاعدہ کچھ فاصلے پر دو سیاہ پرندے ایک دوسرے کی جانب منہ کیے ہوئے ایک شاخ پہ بیٹھے ہوئے ہیں: ایک کی چونچ کھلی ہوئی ہے جیسا کہ وہ دوسرے کے ساتھ بات کر رہا ہو۔ یہ نمونہ مجھے پاگل کر دیتا ہے۔ میں جس جانب بھی اپنا رُخ تبدیل کرتا ہوں، میں پھر بھی اسے دیکھ سکتا ہوں۔ میز بوتلوں، کپڑے کے ٹکڑوں اور دوائیوں کے ڈبوں سے بھری پڑی تھی۔ جلے ہوئے الکوحل اور بیماری زدہ کمرے کی بدبُو فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں اُٹھنا چاہتا ہوں اور کھڑکی کھولنا چاہتا ہوں لیکن ایک خوشگوار سی سُستی مجھے بستر پر لیٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں ایک سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔ دس سے بھی کم منٹ پہلے، میں نے اپنی داڑھی بنائی ہے جو کہ بہت سخت ہو چکی تھی۔ میں آ کر بستر پر لیٹ گیا اور شیشے میں دیکھا کہ میں کتنا کمزور اور پتلا ہو گیا ہوں۔ یہ صرف چہل قدمی کرنے کی سعی تھی۔ کمرہ سارا درہم برہم ہے۔ میں اپنے آپ میں گم ہوں۔

صادق ہدایت (ایران)
مترجم: حمزہ حسن شیخ

ہر قسم کے عجیب و غریب خیالات میرے سر پر سے گزر رہے تھے- بالکل ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان سب کو لکھنے کے لیے دیکھ سکتا ہوں لیکن ان سب سے اہم معمولی سا احساس یا سب سے اہم، وہ گزرے خیالات ہیں، جو مجھے اپنی زندگی کے شروع سے لیکر آخر تک دوبارہ یاد کرنے پڑیں گے اور ایسا اب ناممکن ہے- یہ سارے خیالات اور یہ سارے احساسات، میری پوری زندگی، زندگی کے طور طریقے، اپنے ورثہ شدہ خیالات اور جو کچھ بھی میں نے دیکھا، سُنا، پڑھا، محسوس کیا اور سوچا ہے، کے چکر کا ایک نتیجہ ہیں- اور یہی وہ ساری چیزیں ہیں جنھوں نے ایک بے جوڑ اور بے مقصد تخلوق کو جنم دیا ہے جو کہ میں اب ہوں-

میں بستر پر کروٹیں بدلتا ہوں اور بغیر کسی مقصد کے، اپنے ماضی کے بارے میں لیے گئے نوٹس پڑھتا ہوں - وحشی اور پاگل خیالات میرے ذہن کو گھیر لیتے ہیں- میری گردن میں تکلیف ہوتی ہے اور درد کی ٹیس نکلتی ہیں- میری کنپٹیاں جل رہی ہیں- میں خود کو جکڑ لیتا ہوں- میں اپنی آنکھوں پر رضائی ڈال دیتا ہوں اور سوچتا ہوں- میں تھک چکا ہوں- یہ بہت ہی اچھا ہو کہ اگر میں اپنی کھوپڑی کھول سکوں اور نرم سرمئی گھنگھریالے گوشت کو نکال لوں اور--- کسی کتے کے سامنے پھینک دوں-

کوئی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتا، کوئی بھی اس پہ یقین نہیں کرے گا- اگر کسی کو کچھ ملتا ہے، وہ کبھی بھی اس دنیا میں نہیں پا سکتا- اُسے بتایا گیا ہے، درحقیقت، کہ وہ جائے، اپنا سر نیچے لٹکا دے اور مر جائے- لیکن اگر موت تمہیں کبھی بھی نہیں چاہتی ہے، اگر موت بھی تمہاری جانب اپنی پیٹھ کر لیتی ہے جس طرح باقی سب کچھ --- موت کبھی بھی --- نہیں آنا چاہتی ہے---!!!

دوسرے تمام لوگ بھی موت سے خوف زدہ ہیں، میں اپنی اس اصرار آمیز، لٹکتی ہوئی زندگی سے بہت خوف زدہ ہوں-

یہ کتنا خوفناک ہے کہ جب موت بھی آپ کو نہیں چاہتی اور آپ سے دُور بھاگتی ہے!

صرف ایک چیز مجھے تسلی دیتی ہے- دو ہفتے پہلے، میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ آسٹریا میں کسی نے مختلف طریقوں سے تیرہ دفعہ خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ تمام مراحل سے گزرا تھا- اُس نے خود کو لٹکانے کی کوشش کی تھی اور رسہ ٹوٹ گیا تھا؛ اُس نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی اور لوگوں نے اُسے باہر نکال دیا تھا، وغیرہ وغیرہ- آخر میں ایک دن، جب گھر خالی تھا تو اُس نے ایک آخری کوشش کی تھی- اُس نے باورچی خانے سے ایک چاقو لیا تھا اور اپنے جسم کی ساری رگیں اور شریانیں کاٹ دی تھیں--- اور اس تیرہویں بار، وہ مرنے میں کامیاب ہو گیا تھا-

یہ مجھے بہت لُطف دیتی ہے-

نہیں، خودکشی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تم کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ یہ صرف چند لوگوں میں ہوتی ہے۔ یہ اُن کے مزاج اور فطرت کا حصہ ہوتی ہے۔ وہ اس سے دُور نہیں جا سکتے۔ قسمت فیصلہ کرتی ہے لیکن یہ میں ہوں، جس نے اپنی قسمت بنائی ہے اور اب میں اس سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا۔ میں خود سے فرار نہیں ہو سکتا۔

پس، وہاں کرنے کے لیے کیا ہے؟ قسمت مجھ سے زیادہ مضبوط ہے۔

وہ خیالات جو میرے ذہن میں آتے ہیں! جیسا کہ میں یہاں پر لیٹا ہوں، میری خواہش ہے کہ میں ایک چھوٹا بچہ ہوتا۔ بڑی گولن باجی، جو میرے اُوپر بیٹھ کر، مجھے کہانیاں سُناتی اور رال ٹپکاتی۔ میں بستر پر تھکا ہوا ایسے ہی لیٹا رہوں، اور وہ مجھے حیران کن پریوں کی کہانیاں سُناتی یہاں تک کہ آہستہ آہستہ میری آنکھیں بند ہو جاتیں اور مجھے نیند آ جاتی۔ میں اسے ابھی بھی دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے بچپن کا کچھ حصہ، ابھی تک اچھی طرح یاد ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ سب کل کی بات ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا بچپن اتنا دور بھی نہیں جتنا کہ میں نے سوچا تھا۔ اب میں اچھی طرح، اندھیری، کینہ زدہ اور بے مقصد زندگی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ سکتا ہوں۔ کیا میں اُس وقت خُوش تھا؟ نہیں، کیا ہی بڑی غلطی ہے! ہر ایک سوچتا ہے کہ بچے خُوش ہیں۔ لیکن مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ میں اُس وقت کہیں زیادہ حساس اور خاموش تھا اور دوسروں پہ نظر رکھتا تھا۔ شاید، بظاہرا میں ہنستا مسکراتا اور کھیلتا تھا لیکن اندر سے میں خاصا تلخ یا کچھ حد تک میرے دماغ پہ ناخوشگواریت نے گھنٹوں تک قبضہ کر لیا تھا جو مجھے اندر ہی اندر کتراتی رہتی۔ اگرچہ میں صرف اپنے اس مزاج سے ہی نجات پا سکوں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ دماغ میں ہیں، وہ شاید سچ کہتے ہیں۔ کچھ لوگ صحت مند پیدا ہوتے ہیں اور کچھ غیر صحت مند۔

میں سرخ ششکی پنسل کو دیکھتا ہوں جو کہ میرے ہاتھ میں ہے جس کے ساتھ میں بستر پر لیٹے لیٹے نوٹس لکھ رہا ہوں۔ یہ وہی پنسل ہے، جس سے میں اُس لڑکی کے ساتھ چائے ملاقات کی تفصیل لکھتا تھا جسے میں نے ابھی جاننا شروع کیا تھا۔ ہم دو تین بار فلم دیکھنے بھی گئے تھے۔ آخری بار، جب ہم گئے تو یہ ایک متحرک بولتی ہوئی فلم تھی، اور موسیقی کا ایک پروگرام بھی تھا جس کے ایک حصے میں، شگاگو کے ایک مشہور گلوکار نے گانا گایا تھا، ''میری سیلویہ کہاں ہے؟'' میں نے اس سے خوب لُطف لیا تھا اور آنکھیں بند کر کے یہ سنتا رہا تھا۔ اُس کی طاقتور پرکشش آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ سارے لوگ اس میں مگن ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا تھا، ''اس شخص کو کبھی بھی

نہیں مرنا چاہیے۔'' میں اس بات پر یقین نہ کرسکا کہ ایک دن یہ آواز دوبارہ کبھی بھی نہیں گائے گی۔ اُس کی پُر درد آواز کی لے نے مجھے اُداس کردیا تھا۔ اُسی وقت، میں نے اس اُداسی سے لُطف لیا تھا۔ موسیقی کے اُونچے اور دھیمے سازوں اور تاروں سے چھڑنے والی پُردرد آواز نے مجھے ایسے محسوس کرایا جیسے موسیقی کے آلے پر آگے پیچھے پھسلنے والی چھڑی تاروں کے بجائے میری ہڈیوں کے گوڈے پر بج رہی ہو۔ میرے وجود کا ہر ذرہ اس بجتی موسیقی میں سرایت کرتا جا رہا تھا؛ ارتعاش کرتے ہوئے، میں اس موسیقی کی طاقت کو برداشت کرتا جارہا تھا۔ اندھیرے میں، میں نے اپنا ہاتھ لڑکی کی چھاتیوں پر پھیرا۔ اُس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔ میں بہت ہی عجیب وغریب حالت میں تھا جیسا کہ ایک اجنبی اُداسی جس کو بیان کرنا ناممکن ہے۔ میں نے لڑکی کے تازہ بھیگے ہوئے ہونٹوں کو چوم لیا۔ اُس کی گالوں پہ لالی دوڑ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو زور سے بھینچ لیا اور میرا دھیان قلم سے جاتا رہا۔ میں اُس کے ہاتھوں سے کھیلتا رہا اور وہ زور سے مجھ سے چپکی رہی۔

لیکن اب یہ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ آج سے نو دن پہلے، ہم نے ایک دوسرے کو آخری بار دیکھا تھا۔ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ میں ایک دن کے بعد جاؤں گا اور اُسے واپس اپنے کمرے میں لیکر آؤں گا۔ اُس کا گھر ماؤنٹ پرناسی کے قبرستان کے پاس تھا۔ ایک دن کے بعد، جیسا کہ طے تھا، میں اُسے لینے کے لیے چلا گیا۔ میں اُس کی گلی کے نکڑ پر، میٹرو کے اسٹیشن سے اُترا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس چیز نے میرے دماغ کو بدل دیا۔ یہ بات کبھی بھی نہ تھی کہ وہ بدصورت تھی یا وہ مجھے پسند نہ تھی۔ کسی چیز نے مجھے واپس مڑنے پہ مجبور کردیا تھا۔ میں اُسے دوبارہ کبھی ملنا نہ چاہتا تھا۔ میں اپنی زندگی کو ہر قسم کے جذباتی لگاؤ سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ غیرارادی طور پر، میں قبرستان کے اندر چلا گیا۔ گیٹ پر ایک پولیس والا، نیلے رنگ کے چغے میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ ایک گہری خاموشی نے ساری جگہ کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ میں قبروں کے کتبے گھورتا، اُن پر رکھی صلیبیں، مصنوعی پھولوں کے گملوں اور قبروں کے اُوپر اور اردگرد اُگی گھاس کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ میں نے اُن مدفون میں سے کچھ کے نام پڑھے۔ میں نے دُکھ محسوس کیا کہ اُن کے بجائے میں وہاں پر نہیں تھا۔ میں نے سوچا، ''یہ کتنے خوش قسمت لوگ ہیں!'' مجھے مردوں سے حسد محسوس ہوا جن کے جسم مٹی کے نیچے گل سڑ چکے تھے۔ آج سے پہلے مجھے ایسا حسد کبھی بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ موت ایک خوشی کی طرح تھی اور ایک ایسی نعمت جو ہر کسی کو آسانی سے نہیں ملتی۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے اس طرح گھورتے

ہوئے کتنا وقت گزرا۔ اُس لڑکی کے سارے خیالات میرے ذہن سے مکمل طور پر محو ہو چکے تھے۔ مجھے ذرا بھی ٹھنڈ محسوس نہ ہوئی۔ شاید یہ اس لیے تھا کہ زندوں سے زیادہ مردے میرے زیادہ قریب تھے۔ میں اُن کی زبان زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ میں واپس مُڑا۔ نہیں، میں اُس لڑکی کو دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ہر چیز اور ہر شخص کو بالکل واضح رکھنا چاہتا تھا۔ میں مایوس ہونا اور مرنا چاہتا تھا۔ یہ بیوقوفانہ خیالات جو میرے دماغ میں آئے تھے! شاید میں بکواس سوچ رہا تھا۔

کچھ دنوں سے، میں فال سے اپنی قسمت جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ حد تک، میں ان توہم پرستانہ خیالات کا قائل ہو گیا تھا۔ میں حقیقت میں، اپنی قسمت جاننا چاہتا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے کچھ اور نہیں کرنا ہے اور نہ ہی میں کچھ اور کر سکتا تھا۔ میں اپنے ہی مستقبل کے ساتھ جوا کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے خواہش کی کہ میں خود کو ختم کر دوں۔ یہ خیال اُس وقت آیا جب ایک دن، میں نے بالکل اسی طرح عمل کرنا چاہا۔ ساڑھے تین گھنٹوں تک، میں اپنی قسمت فال سے نکالتا رہا۔ سب سے پہلے، میں نے سارے پتے گڈمڈ کر دیے۔ میں نے ایک پتہ چہرہ رُخ نیچے رکھا اور اس کے ساتھ پانچ پتے اُلٹ رکھ دیے۔ پھر، پہلے والے پتے کو، جو کہ چہرہ رُخ تھا، اس کے ہر جانب میں نے بہت سے پتے اُلٹے کر کے رکھ دیے اور اسی طرح چھٹی باری پہ ایک پتہ چہرہ رُخ آ گیا۔ پھر میں نے سیاہ پر سُرخ اور سُرخ پر سیاہ، نیچے کی جانب ایک ترتیب سے رکھ دیئے، بادشاہ، ملکہ، جیک، دس، نو، وغیرہ وغیرہ۔ ہر وقت، میں نے پتے ہٹاتے ہوئے پتوں کے ایک ڈھیر کو کھولا جن کا رُخ چہرے کی جانب تھا۔ میں ہر دوسرے والے کو پلٹتا رہا۔ وہ پتے جو کہ میرے ہاتھ میں رہ گئے تھے، میں نے تین بار اُن کو اُلٹ پلٹ کیا، یہ کوشش کرتے ہوئے کہ اُن میں سے بہترین، ہر ڈھیر کے اُوپر آ جائیں۔ صرف چھ ڈھیریاں ہی ہونی چاہییں تھیں۔ سارے اکے پہلی تمام چھ ڈھیریوں میں سب سے اُوپر ہوں اور تمام ڈھیریاں ترجیحاً اپنی اپنی جگہ پہ ہوں۔ جب کہ سارے پتے موافق ہوں، پہلی چھ ڈھیریوں میں سے تمام پتے بآسانی کسی بھی دوسری ڈھیری میں حرکت کر سکیں۔ میں نے اپنی قسمت جانچنے کا یہ طریقہ اپنے بچپن میں سیکھا تھا اور میں اس کے ساتھ اپنا وقت گزارتا تھا۔

سات یا آٹھ دن پہلے، میں ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے دو شخص تختہ نرد کھیل رہے تھے۔ اُن میں سے ایک، اپنے سرخ چہرے اور گنجے سر والے دوست کو بتا رہا تھا، جو اپنے چہرے پر حماقت کے ساتھ بہت ہی ہمدردی کے ساتھ اُسے سُن رہا تھا اور ایک سگریٹ اُس کی لٹکی ہوئی مونچھوں کے نیچے لٹک رہی تھی: "وہ نہیں، کبھی

بھی نہیں۔ میں تو کبھی بھی نہیں جیتا۔ دس میں سے نو بار میں ہار چکا ہوں۔'' میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ میں کیا کہنا چاہتا تھا؟ مجھے نہیں معلوم۔ اس کے بعد میں باہر آیا اور پچھلی گلیوں میں گھومنے لگا۔ کئی بار، میں نے سوچا کہ میں اپنی آنکھیں بند کر کے کسی گاڑی کے سامنے آ جاؤں اور اس کے پہیوں کو اپنے اُوپر دوڑنے دوں۔ لیکن یہ مرنے کے لیے بہت ہی اذیت ناک طریقہ تھا۔ اور مجھے کیا معلوم کہ اس طرح سے مرنا کیسے میرے لیے سکون لا سکتا تھا؟ شاید دراصل، میں کبھی نہیں مروں گا۔ یہی خیال، مجھے پاگل کر دیتا ہے۔ میں کئی چوراہوں اور پُر ہجوم جگہوں سے گزرا تھا۔ اس نہ رکنے والی ٹریفک اور گھوڑوں کی ٹاپوں، چھکڑوں، گاڑیوں کے ہارنوں اور مسلسل ہنگامے اور جھگڑے کے بیچ میں، میں بالکل اکیلا تھا۔ ان لاکھوں لوگوں کے درمیان، مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک تباہ شدہ کشتی پہ بیٹھا ہوں جو سمندر کے بیچ کہیں کھو گئی ہے۔ مجھے محسوس ہوا مجھے چٹک کے ساتھ مردوں کے معاشرے سے نکال دیا گیا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ مجھے زندگی کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ میں اپنے خلاف ہی بار بار دلیلیں دے رہا تھا۔ میں ایک ہی چال اور ڈھنگ کے ساتھ مستحکم چلتا رہا۔ میں رُکا اور دکانوں کی کھڑکیوں پر لگے ہوئے کینوس دیکھنے لگا اور افسوس کیا کہ میں پینٹر کیوں نہیں بنا۔ صرف یہی ایک کام ہی تھا جو مجھے پسند تھا اور میں اس سے لُطف اُٹھاتا تھا۔ ''صرف پینٹنگز میں،'' میں نے سوچا، ''کیا مجھے اس میں کچھ آرام اور تسلی مل سکتی تھی؟'' ایک ڈاکیا، اپنی عینکوں سے خط پہ لکھے ہوئے پتے پڑھتا ہوا، میرے قریب سے گزرا۔ مجھے ایسا خیال کیوں آیا تھا؟ شاید اس آدمی نے مجھے ایرانی ڈاکیے یاد دلا دیئے تھے۔ میں نے اُس ڈاکیے کے بارے میں سوچا جو کہ ہمارے گھر میں ڈاک لے کر آتا تھا۔

پچھلی رات، میں نہیں سو پایا۔ میں نے مضبوطی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اپنے خیالات اور آنکھوں کے سامنے سے گزرتے پریشان کن مناظر کو منقطع کیا۔ یہ کبھی بھی ایک خواب نہیں تھا کیونکہ میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ یہ کوئی برا سپنہ بھی نہیں تھا۔ نہ ہی میں سو رہا تھا اور نہ ہی میں جاگ رہا تھا لیکن میں یہ چیزیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا جسم کمزور، بیمار، پُر درد اور بھاری تھا۔ میرے سر میں درد تھا۔ یہ خوفناک خواب میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔ میرے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے ہوا کے ساتھ کاغذوں کے ایک ڈھیر کو کھلتا ہوا دیکھا۔ ورق در ورق یہ اُڑتے چلے گئے۔ فوجیوں کا ایک گروہ قریب سے گزرا لیکن میں اُن کے چہرے نہ دیکھ پایا۔ یہ اندھیری، پریشان کن، ریڑھ کی ہڈی تک اُترنے والی سرد رات تھی جو کہ خوف اور غصے

سے لبریز تھی۔ جب میں اپنی آنکھیں بند کرنا چاہتا تھا اور خود کو موت کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ یہ چونکا دینے والی تصاویر نمودار ہوتی رہیں: آگ کا ایک چکر کسی کیتھرئین کے پہیے کی طرح گھوم رہا تھا، دریا میں ایک لاش تیر رہی تھی، ہر سُو سے آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرے دماغ میں یہ واضح تھا: پاگل اور غصیلی چیزیں مجھ پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ ایک بوڑھا شخص، خون آلود چہرے کے ساتھ ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس رہا تھا اور اُس کے دانت چمک رہے تھے۔ ایک چمگادڑ اپنے سرد پروں کے ساتھ میرے چہرے پر پھڑپھڑایا۔ میں ایک اندھے رستے پر چل رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک گرداب تھا۔ میں پھسلنے لگا۔ میں چیخنا چاہتا تھا۔ ایک ہاتھ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ایک سرد ٹھنڈے ہاتھ نے میرے گلے کو دبوچ لیا۔ میرے دل نے دھڑکنا بند کر دیا۔ عجیب و غریب اور بدحواس کراہٹیں، رات کو جاگنے والے اندھیرے کی گہرائی سے اُبھریں۔ اُن کے چہرے، جن کا ایک رُخ خالی اور سایہ دار تھا، وہ نمودار اور غائب ہونا شروع ہو گئیں۔ میں ان چیزوں سے مخالفت میں کیا کر سکتا تھا؟ وہ بیک وقت میرے قریب اور دُور تھے۔ میں اپنی نیند میں اُن کو نہیں دیکھ رہا تھا کیونکہ میں ابھی تک نہیں سویا تھا۔

مجھے نہیں معلوم، آیا میں نے ہر چیز پر جادو کر دیا تھا یا خود سحر زدہ تھا لیکن ایک خیال مجھے پاگل کیے دیتا ہے اور میں اپنے قہقہے پر قابو نہیں پا سکتا۔ کبھی کبھار میرا ہر قہقہہ، میرے گلے کی تہہ میں اٹک جاتا ہے۔ دراصل، کوئی بھی یہ سمجھنے کے قابل نہیں ہوا ہے کہ میرے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ وہ سب دھوکے میں ہیں۔ ایک ہفتے سے، میں بیماری کے بہانے کر رہا ہوں یا پھر مجھے کسی اور انوکھی بیماری نے گھیر لیا ہے۔ بغیر کسی چاہت کے، میں نے ایک سگریٹ اُٹھایا اور سلگایا۔ میں تمباکو نوشی کیوں کرتا ہوں؟ مجھے بھی معلوم نہیں۔ میں اپنے بائیں ہاتھ کی دو اُنگلیاں اپنے ہونٹوں تک لے جاتا ہوں جن میں سگریٹ دبی ہوئی ہے۔ میں دھواں ہوا میں اُڑا دیتا ہوں۔ یہ ایک قسم کی بیماری بھی ہے۔

اب، جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں، میرا جسم کانپتا ہے۔ پورے ہفتے تک، سنجیدگی کے ساتھ، میں مختلف طریقوں سے خود کو اذیت دیتا رہا۔ میں بیمار ہونا چاہتا تھا۔ کئی دنوں تک، موسم شدید سرد تھا۔ پہلے، میں ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کے نیچے گیا اور اس کو کھول دیا۔ میں نے غسل خانے کی کھڑکی کھلی رہنے دی۔ اب جب یہ کھلی تو مجھے کانپنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ میرے سینے اور پیٹھ میں درد شروع ہو گیا۔ میں نے خود سے کہا:

''اسے آج اچھی طرح ہو جانا چاہیے۔ کل

میرے سینے میں ضرور درد ہوگا اور مجھے بستر پر آرام کرنا پڑے گا۔ پھر میں اس کو مزید خراب کروں گا اور خود کو ختم کر دوں گا۔"
اگلی صبح، جب میں جاگا، مجھے بخار کی ذرا سی علامت بھی دکھائی نہ دی! ایک بار پھر میں نے، اپنے بستر سے ساری چادریں اُتار لیں اور جب اندھیرا ہوا، میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، بتی بجھا دی، کھڑکی کھولی اور منجمد کر دینے والے ہوا کے جھونکوں میں بیٹھ گیا۔ یہ بہت ہی ٹھنڈی ہوا تھی! میں زور زور سے کانپنے لگا اور اپنے بجتے ہوئے دانتوں کو سُننے لگا۔ چھٹی منزل سے، میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا تو لوگ گلی میں سے گزر رہے تھے؛ ان کے کالے سایے اور گزرنے والی گاڑیاں بہت ہی چھوٹے دکھائی دیئے۔ میں نے اپنے ننگے بدن کو اس ٹھنڈ کے سپرد کر دیا اور اس نے مجھے تڑپنے پہ مجبور کر دیا۔
اسی سے مجھے خیال آیا کہ میں پاگل ہو چکا ہوں اور مجھے خود پہ ہنسی آئی۔ مجھے زندگی پہ ہنسی آئی۔ میں جانتا تھا کہ دنیا کے اس بڑے تھیٹر میں، سارے ہی کچھ نا کچھ اپنا کردار نبھانے کے لیے آتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کے مرنے کا وقت آجاتا ہے۔ اور میں اپنا یہ مخصوص کردار نبھا رہا تھا کیونکہ میں نے سوچا کہ یہ مجھے منظر نامے سے جلد ہٹا دے گا۔
میرے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ ٹھنڈ میرے بدن کو جلا رہی تھی۔ دوبارہ، اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں نے خود کو گرم کیا یہاں تک کہ مجھے سخت پسینہ آنے لگا اور میں جلدی جلدی اپنے کپڑے اُتارنے لگا۔
ساری رات، میں اپنے بستر پر پڑا کانپتا رہا۔ میں ذرہ سی دیر کے لیے بھی نہ سو پایا۔ مجھے ذرہ سی خنکی محسوس ہوئی لیکن میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اُونگھ سکا اور بیماری کی ساری علامتیں مکمل طور پر جاتی رہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ بھی کارآمد نہ تھا۔
تین دن سے، میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ رات کو میں نے کپڑے اُتارے اور کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے خود کو خوب اچھی طرح سے تھکایا۔ ایک رات، میں نے ایسے بسر کی یہاں تک کہ صبح مجھے پیرس کی گلیوں میں خالی پیٹ بھاگنا پڑا۔ میں تھک گیا اور ایک تنگ سی گلی میں، ٹھنڈے گیلے قدموں پہ بیٹھ گیا۔ یہ آدھی رات کے بعد کی بات ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ایک آدمی، لڑکھڑاتے ہوئے میرے قریب سے گزرا۔ گیس لیمپ کی غیر یقینی مدھم سی روشنی میں، میں نے ایک مرد اور عورت کو دیکھا، جو باتیں کرتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔ پھر میں اُٹھا اور دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ گلیوں میں مختلف بنچوں پر، تھکے ہارے بے گھر لوگ سو رہے تھے۔
بالآخر مجھے تھک ہار کے واپس اپنے بستر پر آنا پڑا۔ لیکن میں بیمار نہیں تھا۔ میرے دوست مجھے ملنے آئے۔ میں اُن کے سامنے

کانپنے کی کوشش کی اور بیماری کا ایک ایسا تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ مجھ سے ہمدردی کریں گے۔ اُن کو یقین آ گیا کہ میں یقیناً اگلے دن ضرور مر جاؤں گا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ میں خود کو محدود ہوتا محسوس کر رہا ہوں جیسے کہ میں سانس نہیں لے سکتا۔ جب وہ چلے گئے تو میں اُن پر خوب ہنسا۔ میں نے خود کلامی کی کہ شاید دنیا میں صرف ایک اُصول تھا کہ جسے میں پورا کرنے کی کوشش کر رہا تھا: مجھے ایک اداکار ہونا چاہیے تھا!

دوستوں کے سامنے، میں نے بیماری والا ڈرامہ جاری رکھا جو کوئی بھی مجھے ملنے کے لیے آیا اور ڈاکٹروں کے سامنے بھی! اُن سب نے یقین کر لیا کہ میں واقعی بیمار تھا۔ جس کسی نے بھی مجھ سے بیماری کی وجہ پُوچھی تو میں نے اُن سب کو ایک ہی جواب دیا، ''مجھے مایوسی نے گھیر لیا ہے۔'' اچانک موت کی سب سے موثر وجہ دل کا دورہ ہو سکتا تھا، جبکہ جینے کا معمولی سا درد بالکل اچانک سے مجھے کبھی بھی نہیں مار سکتا تھا۔

یہ ایک معجزہ تھا۔ جب بھی میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں، ایک انوکھا احساس مجھے گھیر لیتا ہے۔ میں ایک ہفتے تک، خود کو اذیت دیتا رہا۔ اگر، جب واقعی ہی میرے دوست اصرار کرتے، تو میں خاتون مالک مکان سے چائے کا ایک پیالہ لیکر پی لیتا اور خود کو بالکل بہتر محسوس کرنے لگتا۔ یہ بہت ہی اذیت ناک تھا، میں نے خود کو دوبارہ کبھی بھی بیمار محسوس نہ کیا۔ آہ، میں کیسے روٹی کھانا چاہتا تھا جو انھوں نے پیالے کے ساتھ رکھی تھی لیکن میں نے نہیں کھائی۔ ہر رات، میں نے خود سے کہا، ''اچھا، میں اب بسترِ مرگ ہو گیا ہوں: کل میں دوبارہ اُٹھنے کے قابل نہیں رہوں گا۔'' میں گیا اور افیم سے بھرے ہوئے کیپسول نکالے۔ میں نے اُن کو اپنے بستر کے ساتھ والی دراز میں رکھ دیا تا کہ جب میں واقعی بہت بیمار پڑ جاؤں اور حرکت کرنے کے قابل نہ رہوں۔ میں اُن کو یہاں سے اُٹھا کر نگل سکوں۔ بدقسمتی سے، بیماری نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک بار، جب ایک دوست کے سامنے، میں نے روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کھا کر اُس کو ممنون کرنا چاہا، میں نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا، بالکل صحت مند اور تندرست۔ میں خود سے خوفزدہ تھا، میں اپنے ساتھ اتنی سختی سے پیش آ رہا تھا کہ مجھے خود سے خوف آنے لگا تھا۔ یہ بہت ہی اذیت ناک صورت حال تھی اور بہت ہی ناقابل بیان کہ جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، میں بالکل پاگل ہوں۔ یہ کوئی بکواس یا ذہنی خلفشار نہیں، مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔

یہ کونسی طاقت تھی جو میں محسوس کر رہا تھا۔ جو کچھ بھی میں کر رہا تھا، اُس میں سے مجھے کچھ بھی اچھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے بہر کیف بیمار ہونا تھا۔ آہا، وہاں میرے بیگ میں، بہت ہی مہلک زہر، پڑا ہوا ہے، فوری

اثر کرنے والا۔ مجھے برسات کا وہ دن یاد ہے جب بڑی مشکل اور کئی ایک جھوٹوں کے بعد، میں نے کسی طرح یہ خریدا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے یہ فوٹوگرافی کے لیے ضرورت تھا اور میں نے ایک غلط نام اور پتہ دیا تھا۔ یہ پوٹاشیم سائینا ئڈ تھا۔ میں نے اس کے بارے میں طب کی ایک کتاب میں پڑا تھا اور اس کے سارے عوامل کے بارے بھی جانتا تھا: لرزہ، سانس میں کمی اور پھر دردناک موت لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ معدہ خالی ہو۔ بیس گرام فوری طور پر یا صرف دو منٹ میں بندے کو ماردیتی ہے۔ ان کو ہوا میں خراب ہونے سے بچانے کے لیے، میں نے ان کو چاندی کے ورق میں لپیٹ کر رکھا تھا، جس پر موم کی ایک تہہ لگائی تھی، اس کو شیشے کے ایک برتن میں رکھ کر اس کے ڈھکن کو مضبوطی کے ساتھ بند کیا تھا۔ یہ صرف ایک سو گرام تھا اور میں نے اسے ایک بیش بہا ہیرے کی طرح رکھا تھا۔ لیکن خوش قسمتی ہے، مجھے اس سے کچھ بہتر چیز مل گئی تھی۔ کالی کھلی افیم۔ پیرس میں! اسے میں مدتوں سے تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر، حادثاتی طور پر یہ مجھے مل گئی۔ میں نے پڑھا تھا کہ افیم کا زہر، سائینا ئڈ سے کئی گنا زیادہ خوشگوار تھا۔ اب میں خود کو واقعی بیمار دیکھنا چاہتا تھا اور پھر افیم کھانا چاہتا ہے۔

میں نے سائینا ئڈ کھولی اور انڈے جیسی بال سے دو گرام باہر نکالے، ان کو ایک خالی کیپسول میں رکھ کر بند کیا اور پھر نگل گیا۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ کیپسول کا بیرونی چھلکا، تھوڑا سا آلودہ ہو کر سائینا ئڈ کی وجہ سے نمکین ہو چکا تھا۔ میں نے اسے دوسری بار اُٹھایا۔ اب کی بار میں نے تقریباً پانچ گرام اس سے علیحدہ کیا اور کیپسول نگل گیا۔ پھر میں جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور سوتے ہوئے یہ سوچنے لگا، "شاید، اب میں دوبارہ کبھی بھی نہیں اُٹھوں گا!"

یہ کسی ہوش مند بندے کو پاگل کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے ذرہ سا بھی کچھ محسوس نہ ہوا۔ مہلک زہر نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ میں ابھی تک زندہ تھا اور زہر وہاں میرے بیگ میں پڑی تھی۔ جیسے ہی میں بستر پر لیٹا، میں نے بمشکل سانس لی، لیکن اس کا اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا جو کچھ میں نے نگلا تھا۔ میں اب ناقابل شکست بن چکا ہوں، کانسی کے جسم جیسا، پرانی داستان کے کردار اسفندیار کی طرح۔ یہ ناقابل یقین تھا۔ لیکن مجھے جاننا چاہیے۔ یہ بالکل بے کار تھا۔ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ یہ بے معنی تھی بالکل ہی اضافی۔ جتنے جلدی ممکن تھا مجھے خود سے چھٹکارہ حاصل کر کے جانا تھا۔ اب کی بار میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تاہم مجھے ابھی زیادہ سوچنا تھا، کچھ بھی ایسا نہ تھا جو مجھے زندہ رہنے پہ مجبور کر سکے، کچھ بھی نہیں اور کوئی بھی نہیں۔۔۔

[جاری ہے۔]

واپسی

محمد شفیق

بس سے اتر کر ذیشان اسٹیشن میں ادھر ادھر آنے جانے والی بسوں اور گاڑیوں کا جائزہ لینے لگا کافی دیر سکتے کے عالم میں ٹھہرنے کے بعد اچانک سے ایک تیز آواز ہارن نے اسے چونکا دیا اور وہ جیسے کسی دور ڈوبے ہوئے منظر سے واپس اپنے جسم کے قالب میں آگیا ہو اسی کیفیت میں اس نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر سامنے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ گاڑیوں کے شور، تیز ہارنوں اور لوگوں کے ہجوم میں اسے اپنا آپ اجنبی اور اس دھرتی پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

بے سمت چلتے چلتے اسے دور سڑک کے پار حد نظر تک کانٹے دار درختوں پر کچھ کوے بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ جن پر غور کرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کوے دنیا و مافیہا سے آزاد کسی فکر سے پریشان نہیں ہیں۔ بلکہ مل جل کر آپس میں کائیں کائیں کرنا گویا انکا ایک دوسرے کے ساتھ حال احوال کرنا اور گپ شپ لگانا محسوس ہو رہا تھا اسطرح کوؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ اڑتا اور اڑ کر ساتھ ساتھ درختوں پر بیٹھتا دیکھ کر نہ جانے کیوں انکی تنہائی نے اس کے تنہا ہونے کے احساس کو مزید دو بالا کر دیا تھا۔ ذیشان نامعلوم سمت کی جانب چلتے چلتے جب تھک گیا تو اس نے سوچنا چاہا کہ آج کتنے دن ہو گئے ہیں اس کو گھر چھوڑے ہوئے مگر اس کی سوچ کام نہیں کر رہی تھی اور وہ بار بار اپنے دماغ پر زور ڈال رہا تھا اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوا نے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا ایک عجیب تصور پیش کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کچھ وقت کے لیے سڑک کے کنارے پکی فٹ پاتھ پر بیٹھنا پڑا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہی ذیشان کو نہ صرف اپنے چھوڑے ہوئے گھر کی یاد آنے لگی بلکہ اسے اپنے گھر واپس جانے کی بھی کمی محسوس ہونے لگی اور وہ سوچنے لگا کہ جلد بازی میں اس کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ شاید ٹھیک نہیں تھا اور اسے اپنے والد سے بحث و تکرار کے بعد اتنی معمولی باتوں کے اختلاف پر گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ وہ انہی خیالوں میں غلطاں تھا کہ ایک تیز رفتار موٹر سائیکل اور چاند گاڑی کے ٹکراؤ نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ موٹر سائیکل کے گرتے ہی ذیشان کی نظران دو سواریوں پر پڑی جو موٹر سائیکل سے نیچے آگری تھیں۔ لوگ بھاگ کر انکی طرف دوڑے اور ان کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگے اور کچھ چاند گاڑی والے کو برا بھلا کہہ رہے تھے موٹر سائیکل سے گرنے والے دو انسانوں میں ایک نوجوان اور دوسرا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ نوجوان موٹر سائیکل کو ڈرائیو کر رہا تھا اور دوسرا بڑی عمر کا اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ ذیشان نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر شخص کے بازوؤں اور ٹانگوں سے خون کے دھبے کپڑوں کو رنگین کر رہے ہیں مگر وہ بار بار اپنے زخموں کی پروا

کیے بغیر نوجوان کے بارے میں پوچھ رہا ہے اور اپنی فکر کیے بغیر انتہائی تکلیف کے عالم میں بھی اٹھتا ہے اور نوجوان جس کو بظاہر کوئی چوٹ نہیں آئی ہوتی اس کا حال احوال معلوم کرتا ہے لوگوں کے ہجوم اور موٹر سائیکل کے گرنے کے باوجود وہ بار بار اس ڈرائیو کرنے والے نوجوان کے آگے پیچھے گھومتا ہے اور پھر اپنے کندھے پر سے چادر اتار کر نوجوان کے کپڑوں کو جھاڑنا شروع کر دیتا ہے اور پھر آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو پکڑ کر چوم لیتا ہے اور دونوں موٹر سائیکل کو اٹھا کر سامنے مکینک کی دکان پر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے چلے جانے کے بعد ذیشان کو پتہ چلتا ہے کہ موٹر سائیکل والے دونوں باپ بیٹا تھے اور پاس کے کسی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے ان حالات میں ذیشان کو اس والد کا اپنے بیٹے کا بار بار پیار کرنا اپنے ہاتھ پاؤں زخمی ہونے کے باوجود بیٹے کو چومنا ہر طرف سے اسکو نادان چھوٹے بچوں کی طرح سنبھالنا اور اپنے بہتے ہوئے خون کی پروا کیے بغیر بیٹے کے کپڑے جھاڑنا نہ جانے کیوں اس کے اندر محبت پدری کے جذبے کو ابھار رہا تھا۔ذیشان ان خیالات سے باہر آیا اور فٹ پاتھ سے اٹھ کر چلنا شروع کر دیا ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اس کے پاؤں میں درد محسوس ہونا شروع ہو گیا وہ اب اس تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے جلد سے جلد کسی ہوٹل میں پہنچ کر آرام کرنا چاہتا تھا مگر پاؤں کی تکلیف بڑھتی چلی گئی۔جب کچھ دور چل کر تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو اس نے سڑک کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے پاؤں کا جائزہ لینا شروع کیا۔جوتی اتارنے پر پتہ چلا کہ پاؤں کو جوتی میں لگی ہوئی کوئی بے ترتیب کیل تکلیف پہنچا رہی تھی تب اس نے سٹیشن سے باہر بیٹھے ہوئے موچی کو اپنی جوتی مرمت کے لیے دے دی موچی نے بتایا کہ یہ کیل تو جوتی کے اندر ایسے دھنسی ہوئی ہے جیسے پچھلے کچھ ماہ سے اسی حالت میں رہی ہو پھر جب اس نے غور سے اپنی جوتی کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ غصے میں جلدی سے اپنے باپ کی پرانی جوتی پہن کر نکل آیا ہے اور اس سے ملتی جلتی اپنی نئی جوتی گھر چھوڑ آیا ہے اسی خیال کا آنا تھا کہ اسے وہ سب یاد آ گیا کہ جب پچھلے سال اس نے اپنے باپ سے لیدر کے کوٹ کا کہا تھا تو باپ نے اپنی نئی جاتی کا ارادہ ترک کر کے اسکو نیا کوٹ لے دیا تھا۔ پھر عید پر اس کے من پسند کپڑے اور جوتی تو خرید لی گئی مگر باپ نے اپنی جوتی وہی رہنے دی پھر اسے وہ قصہ بھی یاد آ گیا کہ کس طرح اس نے باپ سے ضد کر کے موبائل فون خریدا تھا اور باپ نے اپنے نئے سوٹ اور جوتی کی پھر قربانی دے دی تھی بلکہ اسے تو یہاں تک بھی یاد آ گیا کہ جب ابو مزدوری سے واپس آ کر اس جوتی کے پاؤں کے اس حصے پر سرسوں کا تیل لگاتا تھا جو حصہ اب اس کے پاؤں کا کیل سے زخمی ہو چکا تھا اس طرح اب اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر کے غلط کیا ہے ابھی تو اسے صرف چار ہی دن گھر کو چھوڑے ہوئے گزرے تھے۔

اور کئی دوستوں نے تو اسے اپنے پاس رکھنے سے معذرت بھی کر دی تھی جس کی وجہ سے اس نے شہر آنے کا فیصلہ کیا تھا ابھی خیالات تھے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ جوتی دوبارہ پہن کر سٹیشن کی جانب واپس روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

تائید

آج شام دفتر سے لیٹ واپسی نے قیصر کی جسمانی تھکاوٹ میں مزید اضافہ کر دیا، کیونکہ پچھلی رات گلی میں کتوں کے بھونکنے کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے وقت وہ رات کا کھانا کھاتے ہی سونے اور خلافِ معمول روزانہ کی سیر پر نہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن آج بھی اگر وہ ان کتوں کو گلی سے نہ بھگا پایا، جو کچھ ماہ پہلے نہ جانے کہاں سے اس کی گلی میں پڑاؤ ڈال کر بیٹھے تھے۔ آدھی رات کو بھونکتے ہوئے ان آوارہ کتوں نے آج پھر اس کی نیند خراب کر دینی ہے۔ قیصر حیران تھا کہ محلے دار بارہا اپنے محلے کی قائم کردہ ویلفیئر سوسائٹی کے اجلاسوں میں ان کتوں کی موجودگی پر ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے، مگر اب تک انھیں کسی نے نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سوچوں کی اس کشمکش میں گھر کے گیراج میں موجود لکڑی کا ڈنڈا اُٹھا کر ان کتوں کو مارتے ہوئے گلی سے نکالنے کا ارادہ لیے گھر سے باہر نکلا۔ کتوں کو ڈھونڈتا ہوا ابھی وہ ساتھ والی گلی میں پہنچا ہی تھا کہ محلے کا سکیورٹی گارڈ اور قیصر کا ہمسایہ عمر آپس میں بحث کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ عمر بھی پہلے کئی مرتبہ کتوں کو بھگانے کی کوشش کر چکا تھا، مگر کتے بھی ایسے ڈھیٹ تھے کہ عمر سے درجنوں گالیاں اور دھتکارے کھا کر کچھ وقت کے لیے غائب ہو جاتے پھر عمر کے اپنے گھر میں گھستے ہی دوبارہ محلے کی گلیوں میں آ دھمکتے۔ چونکہ کئی مرتبہ محلے کی ویلفیئر سوسائٹی کے انتظامیہ کو ان کتوں کے بارے میں آگاہ کیا جا چکا تھا کہ کس طرح یہ گلی سے گزرتے موٹر سائیکل سواروں پر بھونکتے اور کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور گلی میں گزرتے بچوں پر بھونکتے ہیں جس سے بچے ڈر جاتے ہیں مگر سب بے سود تھا۔ کیونکہ ابھی تک سوسائٹی انتظامیہ کی طرف سے کتوں کو بھگانے کا کوئی خاطر خواہ عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا قیصر سکیورٹی گارڈ اور عمر کے قریب پہنچا۔ دونوں میں کتوں پر خوب بحث ہو رہی تھی۔

محمد علی نجیب

سکیورٹی گارڈ مسلسل سوسائٹی انتظامیہ کا دفاع کر رہا تھا۔ جبکہ عمر بضد تھا کہ محلے کے گارڈ اپنی ذمہ داری ٹھیک طریقے سے نہیں نبھا رہے۔ آدھی رات کو جب کتے محلے کی گلیوں میں بھونکتے شور مچاتے لوگوں کی نیند اڑاتے ہیں، تب یہ سکیورٹی گارڈ کہاں غائب ہوتے ہیں اور تو اور عمر جب کتوں کو محلے سے باہر بھگاتا ہے تو گارڈ انھیں واپس کیوں آنے دیتے ہیں۔ عمر یہ مختلف سوالات گارڈ سے پوچھ رہا تھا۔ بھئی یہ بات تو عمر کی بالکل ٹھیک ہے۔ اب کی مرتبہ قیصر گارڈ سے مخاطب ہوا......او ہو قیصر صاحب اب گارڈ کیا کر سکتے ہیں کہ جب ہمارے محلے میں سے کوئی کتوں کو کھانا ڈالے۔ پھر بھلا کتے جاتے ہیں یہاں سے؟ گارڈ نے قیصر کو پہچانتے ہوئے فوراً جواب دیا۔ کیا مطلب کون کھانا ڈالتا ہے کتوں کو؟ قیصر نے حیرانی سے گارڈ کو پھر عمر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یار وہ میرے ساتھ کے گھر والے تقریباً روزانہ کتوں کو اپنے گھر کا بچا کچا کھانا ڈالتے ہیں۔ عمر نے قیصر کو جواب دیا۔ پھر بھلا وہ کیوں جائیں گے ان گلیوں کو چھوڑ کر۔ نہ جانے کہاں کہاں سے عجیب ذہنیت کے لوگ آ کر اس محلے میں آباد ہو گئے ہیں۔ قیصر منہ بسورتے ہوئے عمر سے بولا۔ عمر نے بڑبڑاتے ہوئے قیصر کو کہا، مگر قیصر اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے گارڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ قیصر صاحب میں نے تو ان گھر والوں کو یہ بھی کہا ہے کہ وہ ان کتوں کو کھانا کھلاتے صرف رسی باندھ دیں، ہم انھیں خود کہیں دور چھوڑ آئیں گے۔ مگر انھوں نے یہ گناہ اپنے سر نہ لینے کا کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ پھر جب ہم کتوں کو باندھنے کے لیے بڑھتے ہیں تو وہ ہمیں کاٹنے کو پڑتے ہیں۔ حالات کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے گارڈ ہمدردی لینے کے لہجے میں قیصر کو بتایا۔ نہیں یہ کتے کہیں نہیں جا سکتے جو حالات اور حرکات مجھے محلے والوں کی لگ رہی ہیں۔ ایک طرف تو یہ ان کتوں سے چھٹکارہ چاہتے ہیں اور دوسری طرف انھیں خود کھانا ڈال کر اپنی عادت بھی ڈال رہے ہیں۔ اور سوسائٹی کے تمام گارڈز اس بات پر مطمئن نوکری کرتے جا رہے ہیں کہ جب تک یہ کتے یا ان جیسے دوسرے مسائل اس محلے میں موجود ہیں، تب تک یہاں کے لوگوں کو ان کی ضرورت رہے گی۔ یوں ان کی نوکری بھی پکی رہے گی۔ اور ویسے بھی یہ ذہنی کشمکش میں مبتلا لوگ کہاں آج تک اپنے مسائل سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ قیصر بولتا چلا گیا۔ نہیں نہیں قیصر بھائی یہ حقیقت نہیں۔ گارڈ کھسیانے لہجے میں بولا۔ بس ٹھیک ہے گارڈ صاحب، اگر آج رات کتے بھونکے تو تمھارا موبائل نمبر ہے میرے پاس۔ تمھیں فون کر دوں گا۔ آ کر انھیں بھگا دینا۔ یہ کہہ کر آگے بڑھتے ہوئے قیصر نے عمر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ عمر بھی قیصر کے ساتھ چل پڑا۔ دونوں چلتے ہوئے اپنے گھروں کی جانب

آتی گلی میں داخل ہوئے۔ قیصر ہاتھ میں پکڑا لکڑی کا ڈنڈا گھماتا ہوا کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ یار تو کیوں ان سوسائٹی والوں کو چھیڑتا ہے۔ اب یہ گارڈ ساری بات جا کر انتظامیہ کو بتائے گا۔ اور وہ بلاوجہ تنگ کرنے کے بہانے ڈھونڈیں گے۔ عمر نے قیصر سے سوال کیا۔ قیصر نے رکتے ہوئے عمر کو جواب دیا۔ عمر میں گارڈ کی بات سن کر سوچ رہا ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سوسائٹی انتظامیہ ان مکان والوں کو ان کتوں کو کھانا کھلانے سے منع کرے اور وہ نہ رکیں۔ یہ سوسائٹی انتظامیہ ہمارے مسائل حل نہیں کر رہی بلکہ باریکی سے ہمیں ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ سنا رہی ہے۔ ایسے میں دو کتے تیزی سے بھاگتے، غراتے ان دونوں کے قریب سے گزرے۔ تو اب کیا کرنا چاہیے۔ عمر نے سوالیہ انداز میں قیصر سے پوچھا۔ میرے خیال میں ہمیں محلے داروں سے بات کرنی چاہیے کہ وہ کتوں کو کھانا ڈالنا بند کر دیں۔ بات تو یہ مشکل ہے خاص کر ایسے معاشرے میں جہاں ہر ذی روح اپنے تئیں صحیح راستے پر گامزن ہے مگر اس مدعے پر تھوڑے لگاؤ سے کامیابی بھی ممکن ہے۔ قیصر بولا۔ یار کیوں نہ ان کتوں کو خود ہی مار ڈالا جائے۔ وقت بھی بچے گا اور محلے کے مختلف Pseudointellectuals کی باتوں سے بھی بچ جائیں۔ عمر نے سوالیہ انداز میں قیصر سے پوچھا۔ نہیں! کسی کو مار ڈالنا ہی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا۔ ساتھ ہمیں کتوں سے الجھنے کی ضرورت کیوں ہے جبکہ یہ مسئلہ دماغ استعمال کرتے ہوئے بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ اور کوئی ان سے الجھے یہ بات کتوں کو بھی پسند ہے۔ قیصر سوچنے کے انداز میں بولا۔ محلے میں سکون لانے کی اس کوشش سے سوسائٹی انتظامیہ، گارڈز اور ان عجیب ذہنیت کے لوگوں کو ہمارے فیصلے کے بارے میں پتہ بھی چل جائے گا اور یوں کتوں سے چھٹکارا بھی مل جائے گا۔ قیصر نے دور جاتے کتوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں اپنی بات بڑھائی۔ ٹھیک ہے صبح سے اس کام کو شروع کرتے ہیں۔ عمر نے قیصر کی باتوں کو سمجھتے ہوئے ثبات میں سر ہلایا۔

دو ہفتوں بعد دونوں ایک شام اپنی گلی کے نکڑ میں موجود تھڑے پر بیٹھے خوش گپیاں کرتے گلی میں موجود بچوں کو کھیلتا دیکھ رہے تھے۔ کتے جواب وہاں سے بھاگ چکے تھے۔ گو ہمسایوں محلے داروں سے اپنے موقف کی تائید حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ خصوصاً کہ جب محلے کی سوسائٹی کی طرف سے بھی کوئی سپورٹ نہیں تھی۔ کبھی کسی محلے دار کی طرف سے مذہبی تمہید آڑے آئی تو کوئی ہمسایہ جانوروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے کی بات پر الجھ پڑا۔ مگر گلی کے کتوں کو کھانا نہ ڈال کر انھیں بھگانے میں کامیابی، قیصر اور عمر پر اپنے موقف کو دوسرے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرنے کے فوائد عیاں کر چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

حسینؓ آپ کی عظمت کو ہم سلام کریں

حسینؓ آپ نے جاں دی
زمیں لہو کر دی
کہ قدر کوئی تو زندہ رہے زمانے میں
حسینؓ آپ اصولوں پہ ہو گئے قرباں
عدو کو مات ہوئی......

زوال اُس کو ہُوا
جس نے جبر و وحشت سے
صداقتوں کے تقدس کو پائمال کیا
حسینؓ آپ کی عظمت کو ہم سلام کریں
کہ کربلا ہے علامت
عروجِ آدم کی

سید افسر ساجد

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

اہلِ الم کے ساتھ تھی، موجِ نمِ فرات بھی
آبلے پھوڑتے رہے، راستے بھر برہنہ پا

جائے نیاز

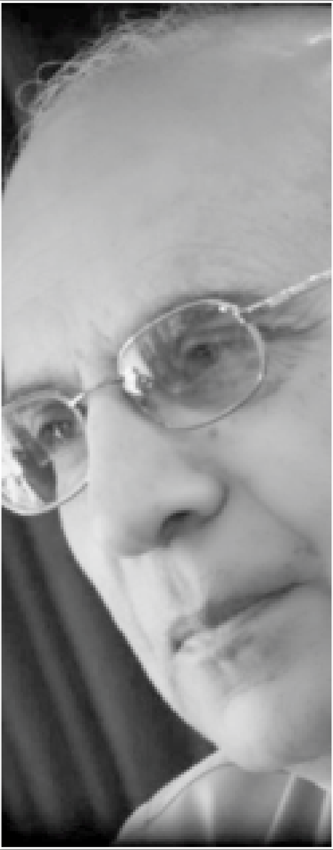

برسوں بعد
ہوئے پھر یک جا
بہنیں اور سب بھائی
کھٹی میٹھی
یادوں نے
کیسی محفل گرمائی
ساتھ کے
خالی کمرے میں
کب کی ٹھہری تنہائی
موجِ ہوا کے
کان میں جانے
کیا دم سرگوشائی
اک جانی پہچانی
خوشبو نے
ہر شے مہکائی
اک لمسِ مانوس نے
سارے گھر کی
فضا مہکائی

جلیل عالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رنگ شب و روز گزرتے رہے خالد
وہ پوچھ تو لیتے ہیں بتانے نہیں دیتے

مراجعت

اوراب اخلاص کے معنی بدلتے ہیں
ہوائے خیرخواہی میں گئے رشتوں کا نم ہے
لفظ تو بس خلعتیں تبدیل کرتے ہیں
تعلق ہے کہ جذبوں کے پنگھوڑے میں رکھا
آنکھیں جھپکتا، سانس لیتا ہے
کہیں بھی وہ نہیں جن کو میں ہنستا چھوڑ کر بستی سے نکلا تھا
یہ دل کچھ اور کہتا ہے، ہوا کچھ اور کہتی ہے
مرے چوگرد ان اونچے مکانوں کے دریچے
ناشناسائی کے پردوں میں چھپے آنسو بہاتے ہیں
عجب بیگانگی سی ہے
شناساؤں کی آوازوں میں وہ سوزِ کلامی
تک نہیں باقی
گئے وقتوں کی آوازیں مرے رستے میں پڑتی ہیں
مرے اطراف میں روبوٹ ہیں یا کچھ مشینیں ہیں
صداؤں میں بھی وہ درد خوش آثاری نہیں ملتا
نہیں کوئی جو آب خیر کی دو چار بوندیں دان کر جائے
مرے لوگوں میں اب رشتوں کی وہ
مہکار تک باقی نہیں ہے
اب پرندوں کے گروہِ خوش بصیرت میں
کوئی چہکار تک باقی نہیں ہے
میں پرانے آئنے پڑھتا
درو دیوار کو سہمی ہوئی آنکھوں کبھی حسرت
زدہ نظروں سے تکتا ہوں
کوئی دستک نہیں جو صحن سے کمرے کے
دروازے تلک آئے
میں کب تک خیمۂ دل کی طنابیں کھینچ پاؤں گا
پرانے دوست (پنچھی) چوگ لینے آئیں
رشتوں کے سہانے پن کو سہلانے
مجھے مجھ سے ملانے آئیں تو کچھ دل بہلتا ہے
خزاں اپنے حوالے میں نہیں آتی
مگر جب سانس لیتا ہوں
تو بوڑھے پیڑ سے لپٹی ہوا آواز دیتی ہے
سنو تابش کمال اب سب بدل جانے کا موسم ہے

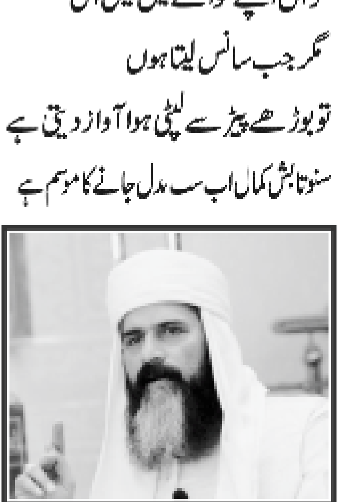

تابش کمال

سیاسی مافیا کے نام

مظلوم سے بھی کرتے رہے غمگساریاں
ظالم سے بھی نبھاتے چلے آئے یاریاں

بخشا ہے تو نے حقِ نمائندگی انھیں
اب دیکھ اعتبار میں بے اعتباریاں

یہ بھی تماشہ دیکھ لیا پوری قوم نے
بکتی رہیں کروڑوں میں ایمان داریاں

کس کس ستم پہ صبر کریں اے نظامِ عدل!
جتنے وڈیرے اُتنی یہاں تھانیداریاں

جینا بھی اک عذاب ہے، مرنا بھی اک عذاب
اک دردِ لاعلاج ہے اور اشک باریاں

مزدور ساری زندگی مزدور ہی رہا
سرمایہ دار کے لیے سرمایہ داریاں

آخر کبھی تو عرش ہلے گا انیس جان!
لاکر رہیں گی رنگ کبھی آہ و زاریاں

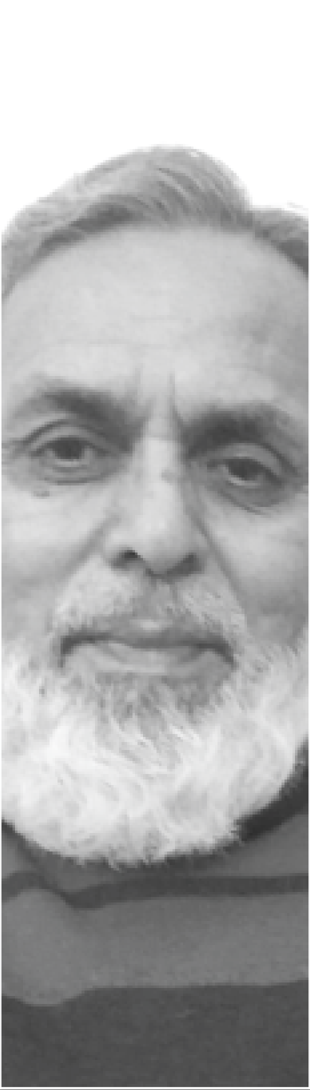

محمد انیس انصاری

نثری نظم

میں نے اپنے سپنے تمہاری آنکھوں میں بنے تھے
دنیا کو ہمیشہ تمہاری نسبت سے برتا
خود کو جانے میں کہاں چھوڑ آئی تھی
تمہاری راہوں میں وعدوں کے پھول بچھاتے بچھاتے
میں خود کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی اب
میرے قدم تمہارا ساتھ نہیں دے پاتے
تھکن رگ و پے میں یوں اترنے لگی ہے
کہ ایک قدم بھی اٹھانا مشکل لگتا ہے

تمہارا ساتھ دینا میرے بس میں کہاں ہے
تمہیں تو بہت آگے جانا ہے
کبھی کبھی
نئے راستوں کی چمک
آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے
ہم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ پاتے

کہیں قدم پتھر کے نہ ہو جائیں

جانے والوں کی
یادیں رہ جاتی ہیں
تنہائی
البم میں لگی تصویروں سے باتیں کرتی رہتی ہے
دن شام کی انگلی تھامے
رات کی آغوش میں جا چھپتا ہے
ہم گھڑی کی سوئیاں گنتے رہتے ہیں

سپیس ایج میں ایک ہی چیز کی تو کمی ہے
اب وقت نہیں ملتا
جو بات چند لفظ سکرین پر ٹائپ کر کے
کہی جا سکتی ہو
اسکے لئے زباں سے لفظ ادا کرنا ضروری تو نہیں
یہاں خامشی بھی نظم ہے

سماعتیں آوازوں کی منتظر رہتی ہیں

دل آباد کے سب راستے سونے پڑے رہتے ہیں
کوئی نہیں لوٹتا
جدیدیت کے اس دور میں
زندگی جذباتیت کے سنگ نہیں بتائی جا سکتی
ہمیں حقیقت پسند ہو کر جینا پڑتا ہے
قدیمی راستوں کی بنجر زمین پر
صرف اداسی پھلتی پھولتی ہے

☆☆☆☆☆

نائلہ راٹھور

کومٹ منٹ

شروع میں
زندگی سادہ
خوب صورت
فطری بہاؤ میں
کتنی آسان تھی
پھر وقت نے چال چلی
ہم پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے
ہم سے ڈھیروں خطائیں
جہالت کے باعث
بھیانک غلطیاں سرزد ہوئیں

حالات
اپنی مرضی کی لہروں پر
سمندر سے مطالبہ کرتے ہوئے
اہداف کے پانیوں پر سفر کرتے ہیں
ہم اپنے
ارادے کی نفسیات
خواہش کے تناظر میں نہیں دیکھ سکتے
آسمان پر چمکتے سورج کی کرنیں
اندھیرے میں
پُراسرار نظر آتی ہیں
ہمارے خیالات کے توازن میں
توڑ پھوڑ
ذہنوں میں فتور کی علامات نمایاں ہیں
مگر ہم
بے حسی کے دسترخوان پر
اپنے مفادات کی نگہبانی کرتے رہیں گے
خوشامد ہمارا تہذیبی ورثہ ہے
ہم جھوٹ سے غداری نہیں کریں گے

ہمارا بیانیہ دلچسپ ہے
دیوار پہ درج نعرے
ہمارا منشور
فقط لالچ
ہمارا ایمان
اور محبت
کلاسک سرمایہ ہے

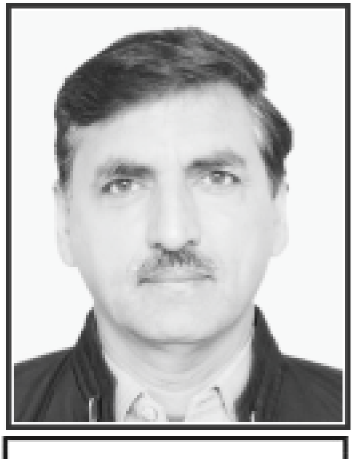

امجد بابر

عمر کے اب ہیں موڑ ایسے پر

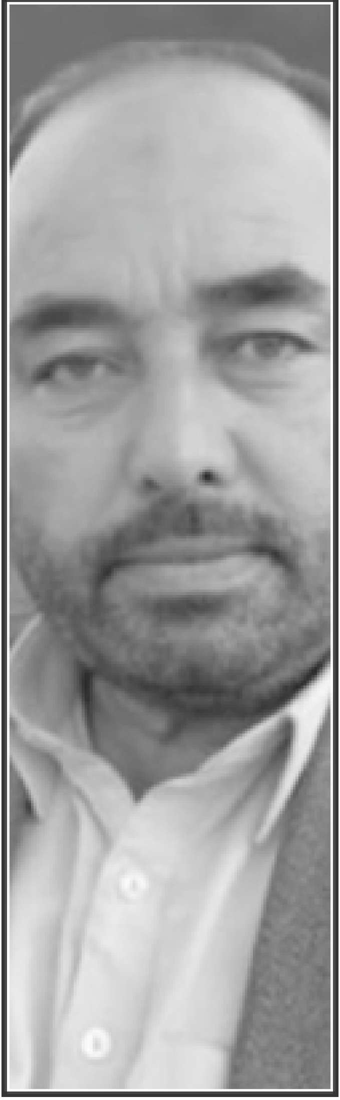

عاصم بخاری

چشمہ بھی اب بغیر ڈوری کے
کم ہی آنکھوں پہ اب ٹھہرتا ہے
عمر کے اب ہیں ایسے حصے میں
پوچھ کے دن بھی اب گزرتا ہے
رات کٹتی نہیں کسی صورت
دن دکھاتا نہ آن کے مورت
بھول جاتے ہیں نام بچوں کے
یاد رہنے کا اب ہے یہ عالم
سب سے امداد کے ہیں ہم طالب
اتنی کمزوری آ گئی غالب
ہوش اپنے نہیں ٹھکانے اب
اس کی جانب بلانے آئے کب
موت جانے سلانے آئے کب
عمر کے ایسے موڑ پر ہیں اب

اے آئی (نثری نظم)

سنا ہے کوئی بلا آرہی ہے
جس کا نام
اے آئی ہے
اب آنے والے وقت میں انسان کی نہیں
اے آئی کی سنی جائے گی
اے آئی ساری کہانیاں نظمیں غزلیں لکھا کرے گی
اس کو سب زبانیں آتی ہیں
اس کے پاس پوری انسانیت کے تجربات ہیں
اس کے پاس تاریخ کے خزانے ہیں
اس کے پاس تمام کتابوں کا علم ہے
لیکن میں پھر سوچتا ہوں
کہ
اس کو اظہار کی ضرورت کیا ہے
جب اس میں کوئی خواہش ہی نہیں
کوئی جذبہ نہیں کوئی ضرورت نہیں
کیونکہ
انسان اس سے ڈر رہے ہیں
جبکہ
وہ اس کے خالق ہیں
پھر ایک خیال ذہن میں کہیں سے در آتا ہے
اس کے اپنے عزائم نہیں
لیکن اس کے بنانے والوں کے تو عزائم ہو سکتے ہیں
جو ہم سے ہماری زبان چھین لینا چاہتے ہیں
اور
اے آئی کے ذریعے خود بولنا چاہتے ہیں
ویسے بھی صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے
کہ
ہر انسان کی کہاں اپنی زبان ہوتی ہے
وہ ہمیشہ دوسروں کی زبان بولتا ہے
بس اس دفعہ فرق یہ آئے گا
کہ
اس کو نہ اپنا قلم چلانے کی ضرورت پڑے گی
نہ
زبان کو جنبش دینے کی
اور بات ہو جائے گی
پہلے شاید وہ غلط فہمی میں تھا کہ وہ بول رہا ہے
اب اس کی غلط فہمی دور ہو جائے گی
اے آئی بولے گی
صرف اے آئی

محمد کلیم

ساون، آنسو، آنسو

ساون کی رم جھم

پکوان کی خوشبو

مٹی کی مہک

کوئل کی کوک

بن تیرے

سسکتے ہوئے دل کے تار

کیا کروں اکیلی ہر سو

ساون آنسو آنسو

اور روتی کوئل ـــــ،

فصیحہ آصف خان

درد

جب یادوں کا دریا

چڑھتا ہے

اک

ٹیس سی

اٹھتی ہے دل میں

اور

پھر جب

آنکھیں

دل کا ساتھ دینے لگیں

تو ہم

چپکے چپکے

سب سے چھپ کے

رو لیتے ہیں

ــــــــــ انتخاب ــــــــــ

- خالد احمد -

ــــــــ نعمان منظور ــــــــ

تمام عمر بس اک رت جگے میں بیت گئی

تمام عمر ہم اک مہرباں کے ساتھ رہے

لفظوں کی جستجو میں

لفظوں کی جستجو ہی میں سب کچھ گنوا دیا
وہ چل دیا، مَیں طرزِ ادا ڈھونڈتا رہا

اُس کو کسی نے رب سے لیا مانگ، اور مَیں
سجدے میں گر کے حرفِ دُعا ڈھونڈتا رہا

کمرے میں رو رہی تھی کسی ڈھولکی کی تھاپ
اور صحن میں، مَیں لطفِ غِنا ڈھونڈتا رہا

وہ تو ڈبو کے خون میں لایا تھا میرے پاس
مَیں جن کفوں پہ رنگِ حِنا ڈھونڈتا رہا

اُس نے وہیں اُتار دی پوشاکِ زندگی
اور عُمر بھر مَیں بندِ قبا ڈھونڈتا رہا

کتنی یہ خوفناک مجھے اُس نے دی سزا
مَیں ساری عُمر اپنی سزا ڈھونڈتا رہا

کھویا تھا جس کو ذہن کے کونے نے، مرتضیٰ!
میں دل کی کربلا میں سدا ڈھونڈتا رہا

غلام مرتضیٰ

فقیرِ حسینؑ

میرے تن پر قولِ حسینؑ کی اجرک ہے
اور کانوں میں آخری خطبے کی بالی
میرے سر پر بدر و حنین کی مٹی ہے
اور کاندھوں پر چھدا ہوا مشکیزہ ہے
مشکیزے کے ساتھ بندھا ہے اک چولا
چولے میں انکارِ یزید کی پرچی ہے
خشک کھجور کی ٹہنی ٹیک کے چلتا ہوں
جھلمل کرتی دنیا پیچھے چلتی ہے

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لب ہیں کہ وپارہ صدفِ صبحِ چمن ہے
وہ چال ہے یا حسنِ محبت کا چلن ہے

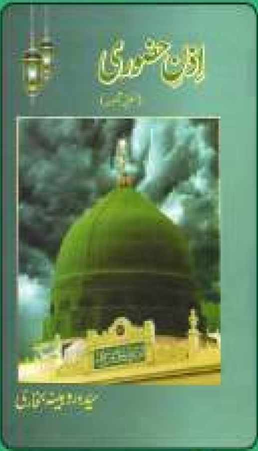
اذنِ حضوری
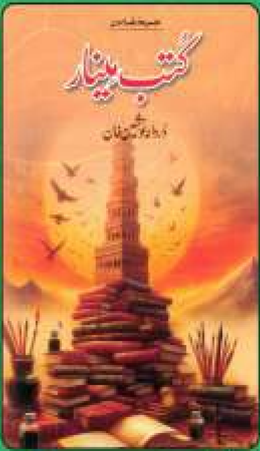
کتب مینار
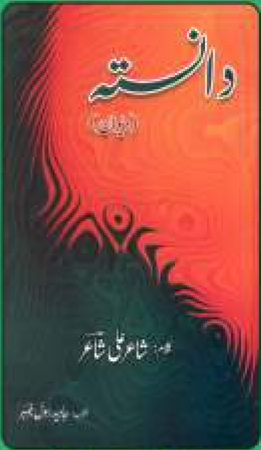
دانستہ
شاعر علی شاعر
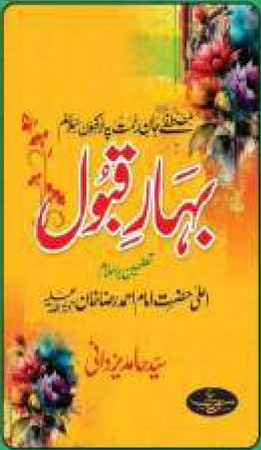
بہارِ قبول
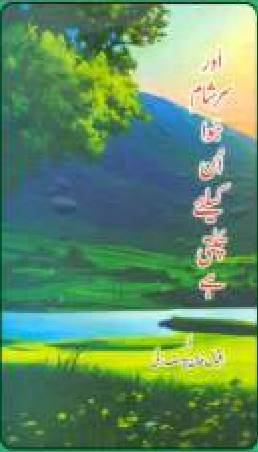
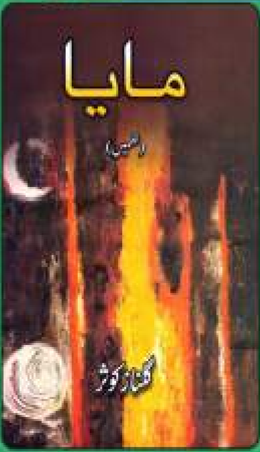
مایا

جناب نثار ترابی والدہ کا ساتھ

جناب احمد فراز اور جناب نثار ترابی

جناب نثار ترابی اپنے دوستوں کے ساتھ